شبستان
فیض نمبر
15/-

آخری خط

وہ وقت مری جان بہت دور نہیں ہے
جب درد سے رک جائیں گی سب زیست کی راہیں
اور حد سے گزر جائے گا اندوہِ نہانی
تھک جائیں گی ترسی ہوئی ناکام نگاہیں
چھن جائیں گے مجھ سے مرے آنسو مری آہیں
چھن جائے گی مجھ سے مری بے کار جوانی
شاید مری الفت کو بہت یاد کرو گی
اپنے دلِ معصوم کو ناشاد کرو گی
آؤ گی مری گور پہ تم اشک بہانے
نوخیز بہاروں کے حسیں پھول چڑھانے
شاید مری تربت کو بھی ٹھکرا کے چلو گی
شاید مری بے سود وفاؤں پہ ہنسو گی
اس وضعِ کرم کا بھی تمہیں پاس نہ ہوگا
لیکن دلِ ناکام کو احساس نہ ہوگا
القصہ مآلِ غمِ الفت پہ ہنسو تم
یا اشک بہاتی رہو، فریاد کرو تم
ماضی پہ ندامت ہو تمہیں یا کہ مسرت
خاموش پڑا سوئے گا واماندۂ الفت

اُردو ڈائجسٹ
شبستان
نئی دہلی
فیض نمبر
منتخب کلام
کے ساتھ

نگراں : یوسف دہلوی

مدیر : ادریس دہلوی

مدیرانِ اعزازی : یونس دہلوی،
الیاس دہلوی

اشاعت خاص

اشاعت کا اٹھارواں سال
فروری، مارچ
شمارہ نمبر ۲۰۶ اور ۲۰۷

قیمت فیض نمبر : ۱۵ روپے
قیمت عام شمارہ : سات روپے
سالانہ قیمت : اسّی روپے

صدر دفاتر : ۱۴/۱۳-آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
دیگر دفاتر : بمبئی، کلکتہ، مدراس

فون : 272068 ,272067 ,272066 276956 ,277053

تار کا پتہ : شمع نئی دہلی

ٹیلکس : SHAMA NEW DELHI 3161601 SHMA IN

مالکان : شمع ڈسٹری بیوٹرز (پرائیویٹ لمیٹڈ) دہلی ○ طابع و ناشر : محمد یونس دہلوی

مطبوعہ : شمع پریس، جی ٹی روڈ، دہلی ۳۲ ○ سرورق : ریان بو پرنٹرز، دہلی ۶

ترتیب

منتخب کلام

سارے سخن ہمارے   نقشِ فریادی   دستِ صبا   زنداں نامہ

دستِ تہِ سنگ   شامِ شہرِ یاراں   مرے دل مرے مسافر   غبارِ ایام

شکریہ!

ادارہ شبستاں مندرجہ ذیل احباب کا ممنون و مشکور ہے جن کے مخلصانہ تعاون کی بدولت صوری اور معنوی اعتبار سے فیض نمبر کی ترتیب و تدوین ممکن ہو سکی۔

سعید سہروردی، پروفیسر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر قمر رئیس، میر خلیل الرحمان، میر شکیل الرحمان (جنگ کراچی)، بی بی سی ٹیلی ویژن کے کرشن گولڈ، فیض اکاڈمی لندن کے صدر مجاہد ترمذی، اُردو مرکز لندن کے ڈائرکٹر افتخار عارف، مقبول احمد دہلوی، علی باقر، ظہیر ناصر، ظفر سلطان جاپان والا، نثار بھارتی، سید فدا علی، اور شبستاں کے حسن کار غیاث الدین، ضیا فیضی اور محمد نسیم۔
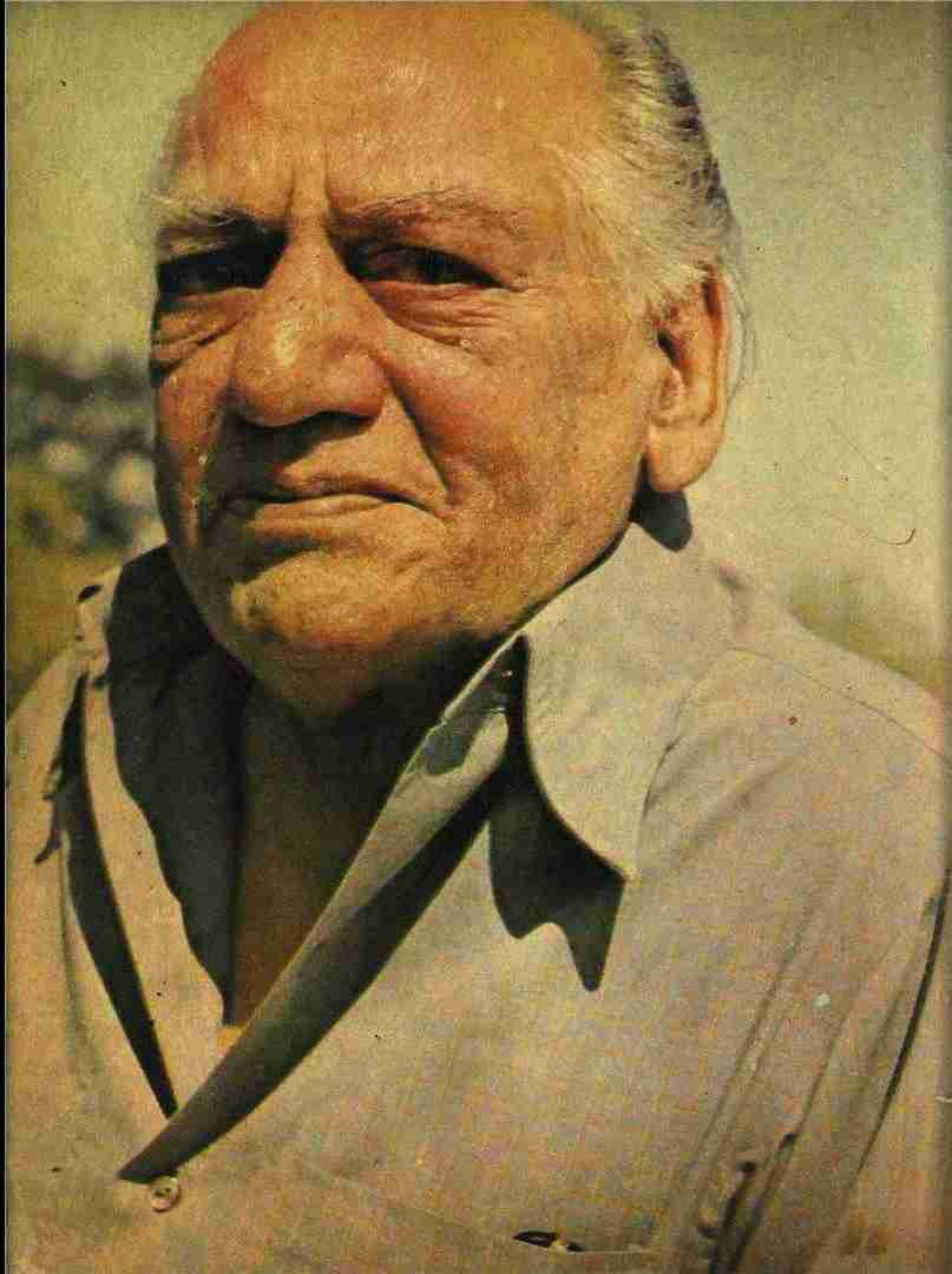
فیض احمد فیضؔ کی وفات اقبالؔ کے بعد دوسرے ایسے عظیم شاعر کی موت ہے جس کی شخصیت اور فن نے زبان، ملکی سرحدوں اور قومیت کے حصار کو توڑ کر عالم گیر اہمیت حاصل کر لی تھی۔ ادب کی تاریخ میں ایسی کثیر پہلو شخصیتیں شاذونادر ہوتی ہیں جو ہر رنگ کو سنوار سکیں، ہر دائرے کو منور کر سکیں۔ فیض احمد فیضؔ کی ذات میں شعر و ادب کی ہی نہیں، فنونِ لطیفہ، جمالیات اور تہذیبِ انسانی کی بھی اعلیٰ قدریں جمع ہو گئی تھیں۔ اِسی لئے اُن کا ماتم وہ لوگ بھی کر رہے ہیں جو زندگی میں اُن کے حامی اور مدّاح نہیں تھے۔

شاعر، ادیب، صحافی، ٹریڈ یونین لیڈر اور ثقافتی اداروں کے بانی کی حیثیت سے فیض احمد فیضؔ نے ہر شعبے میں اپنی عظمت کے نقوش چھوڑے ہیں۔ فیضؔ کی عظمت کی شناخت اور اس کا اعتراف ایک عصری فریضہ ہے۔ شبستاں نے جب یہ منصب ادا کرنے کا فیصلہ کیا اور اس رنگارنگ شخصیت کے فن، ذاتی زندگی، سرگرمیوں اور کارناموں کا بھرپور جائزہ پیش کرنے کا منصوبہ بنایا گیا تو اس راہ کی دشواریوں سے ہم بے خبر نہ تھے۔ چنانچہ شعبۂ ادارت کے وہ سارے کارکن جو دریا کو کوزے میں سمونے کے ہنر میں ماہر ہیں، مواد کی فراہمی کی مہم پر نکل کھڑے ہوئے۔ کتابوں اور ان سے بھی زیادہ رسالوں کے ہزاروں اوراق ان میں سے ہر ایک نے کھنگال ڈالے۔ پھر سب سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور انتخاب کا مرحلہ سر کیا۔ خصوصی شمارے کے محدود صفحات کے پیشِ نظر یہ انتخاب بھی دوبارہ انتخاب کے عمل سے گزرا۔ اس طرح یہ شمارہ اَن گنت پھولوں کا عطر بن گیا ہے۔ فیضؔ کا سارا جادو جگاتا کلام، ان کی معرکہ آرائیاں، اُن کی ذات سے وابستہ ہنگامے اور رونقیں —— سب کچھ اِن صفحات میں موجود ہے۔

فیض شناسی کی اس دستاویز کو جامع بنانے کی ہم نے بساط بھر کوشش کی ہے۔ لیکن یہ بھید تو آپ کی رائے ملنے کے بعد ہی کھُلے گا کہ اِس کوشش میں ہم کس حد تک کامیاب رہے ہیں۔ اس لئے اپنے خیالات ہمیں جلد لکھ بھیجئے۔ فیضؔ کے بارے میں نشاطِ مطالعہ کا اور بھی سامان ہمارے پاس ابھی محفوظ ہے۔ جی چاہتا ہے کہ ایک اور خصوصی شمارے میں اس خزانے کو بھی پیش کر دیا جائے۔ اِس سلسلے میں آپ کا تعاون بھی درکار ہے۔ اگر آپ کے پاس فیضؔ کی کوئی تحریر، تصویر، اُن سے وابستہ تاثرات یا یادوں کے نقوش ہیں تو انہیں بھیجنے کی زحمت گوارا کریں۔ آپ چاہیں گے تو آپ کا ارسال کیا ہوا مواد استعمال کے بعد آپ کو واپس بھیج دیا جائے گا —— اور اب پردہ اُٹھتا ہے: فیضؔ کی ذات، صفات، فن اور ایک پورے دَور کی دھوم مچاتی ہوئی محفل میں شرکت کے لئے۔

ادریس دہلوی

فیضؔ کی کہانی —— فیضؔ کی زبانی

ہمارے شعراء کو مستقلاً یہ شکایت رہی ہے کہ زمانے نے ان کی قدر نہیں کی۔ ناقدریِ ابنائے وطن ہماری شاعری کا ایک مستقل موضوع ہے۔ ہمیں اس سے اُلٹ شکایت یہ ہے کہ ہم پہ لطف و عنایت کی اس قدر بارش رہی ہے، اپنے دوستوں کی طرف سے، اپنے ملنے والوں کی طرف سے اور ان کی جانب سے بھی جن کو ہم جانتے بھی نہیں کہ اکثر ندامت ہوتی ہے کہ اتنی داد و دہش کا مستحق ہونے کے لئے جو تھوڑا بہت کام ہم نے کیا ہے اس سے بہت زیادہ ہمیں کرنا چاہیے تھا۔

یہ کوئی آج کی بات نہیں ہے بچپن ہی سے اس قسم کا تاثر رہا ہے جب ہم بہت چھوٹے تھے، اسکول میں پڑھتے تھے تو اسکول کے لڑکوں کے ساتھ بھی کچھ اسی قسم کے تعلقات قائم ہو گئے تھے۔ خواہ مخواہ انہوں نے ہمیں اپنا لیڈر تسلیم کر لیا تھا حالاں کہ لیڈری کی صفات ہم میں نہیں تھیں، یا تو آدمی بہت لٹھ باز ہو کہ دوسرے اس کا رعب مانیں یا وہ سب سے بڑا فاضل ہو۔ ہم پڑھنے لکھنے میں ٹھیک تھے، کھیل بھی لیتے تھے لیکن پڑھائی میں ہم نے کوئی ایسا کمال پیدا نہیں کیا تھا کہ لوگ ہماری طرف متوجہ ہوں۔

بچپن کا میں سوچتا ہوں تو ایک یہ بات خاص طور سے یاد آتی ہے کہ ہمارے گھر میں خواتین کا ایک ہجوم تھا۔ ہم تین بھائی تھے ان میں ہمارے چھوٹے بھائی (عنایت) اور بڑے بھائی (طفیل) خواتین سے باغی ہو کر کھیل کود میں مصروف رہتے تھے۔ ہم اکیلے ان خواتین کے ہاتھ آ گئے۔ اس کا کچھ نقصان بھی ہوا اور کچھ فائدہ بھی۔ فائدہ تو یہ ہوا کہ ان خواتین نے ہم کو انتہائی شریفانہ زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا، جس کی وجہ سے کوئی غیر مہذب یا اُجڈ قسم کی بات اس زمانے میں ہمارے مُونہہ سے نہیں نکلتی تھی۔ اب بھی نہیں نکلتی۔ نقصان یہ ہوا جس کا مجھے اکثر افسوس ہوتا ہے کہ بچپن میں کھلنڈرے پن یا ایک طرح کے لہو و لعب کی زندگی گزارنے سے ہم محروم رہے۔ مثلاً یہ کہ گلی میں کوئی پتنگ اُڑا رہا ہے، کوئی گولیاں کھیل رہا ہے۔ کوئی لٹو چلا رہا ہے، ہم بس کھیل کود دیکھتے رہتے تھے اکیلے بیٹھ کر۔ "ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے" کے مصداق ہم ان تماشوں کے صرف تماشائی بنے رہتے اور ان میں شریک ہونے کی ہمت اس لئے نہیں ہوتی تھی کہ اسے شریفانہ شغل یا شریفانہ کام نہیں سمجھتے تھے۔

اساتذہ بھی ہم پر مہربان رہے۔ آج کل کی میں نہیں جانتا، ہمارے زمانے میں تو اسکول میں سخت پٹائی ہوتی تھی۔ ہمارے عہد کے اُستاد تو نہایت ہی جلاد قسم کے لوگ تھے۔ صرف یہی نہیں کہ ان میں سے کسی نے ہم کو ہاتھ نہیں لگایا بلکہ ہر کلاس میں ہم کو مانیٹر بناتے تھے۔ یعنی فلاں کو چانٹا لگاؤ،

فلاں کو تھپڑ مارو۔ اس کام سے ہمیں بہت کوفت ہوتی تھی اور ہم کوشش کرتے تھے کہ جس قدر بھی ممکن ہو یوں سزا دیں کہ ہمارے شکار کو وہ سزا محسوس نہ ہو۔ طمانچے کی بجائے گال تھپتھپا دیا۔ کان آہستہ۔

• ۱۹۸۲ء میں فیض احمد فیض کراچی میں
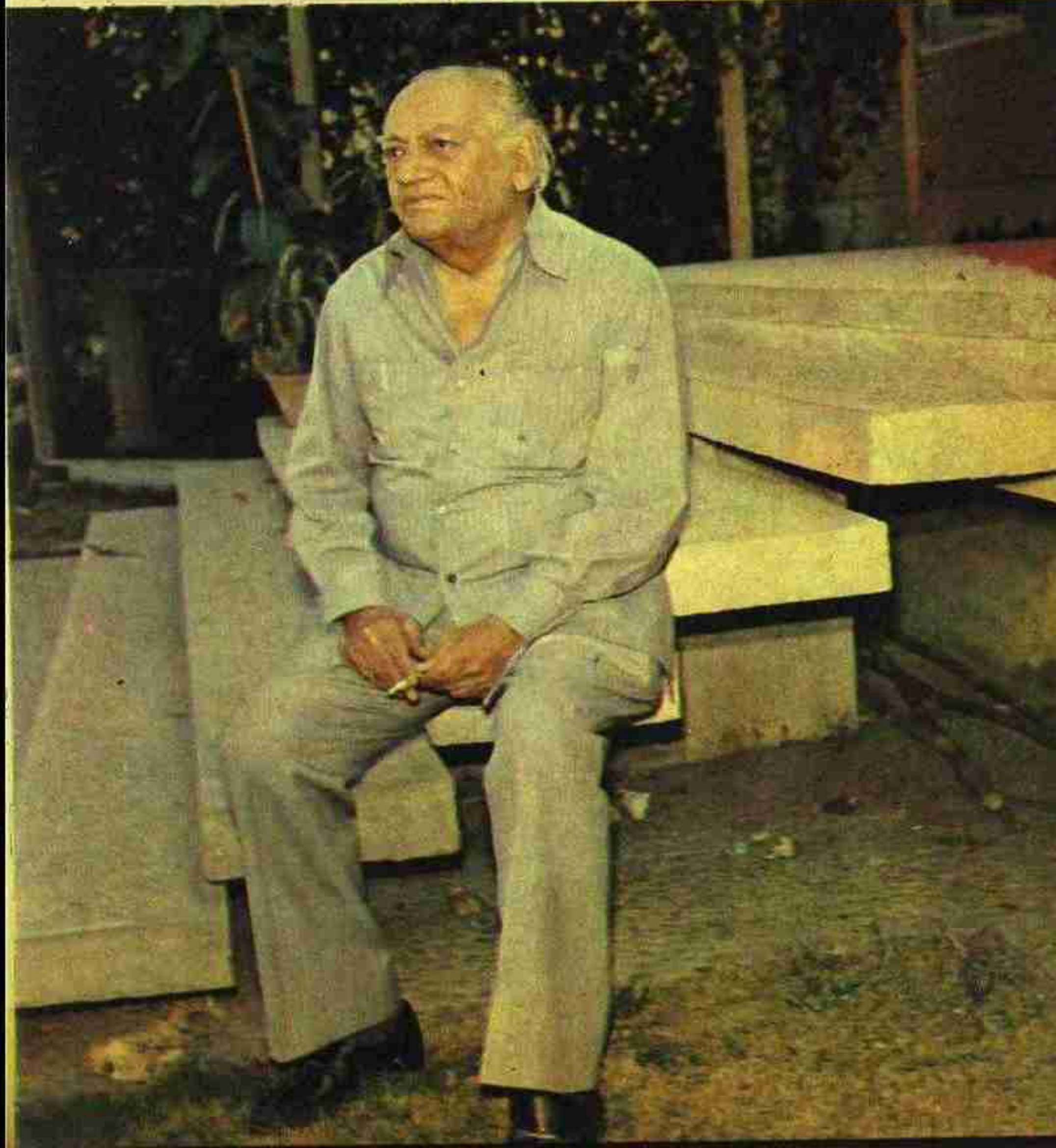
سے قینچیاں وغیرہ۔ کبھی ہم پکڑے جاتے تو استاد کہتے یہ
کیا کر رہے ہو زور سے چانٹا مارو۔

دو تاثر بہت گہرے ہیں، ایک تو یہ کہ بچوں
کی جو دل چسپیاں ہوتی ہیں ان سے محروم رہے۔

● فیض صاحب آخری بار یورپ جانے سے پہلے۔ جنوری ۱۹۸۲ء میں بیماری کی حالت میں
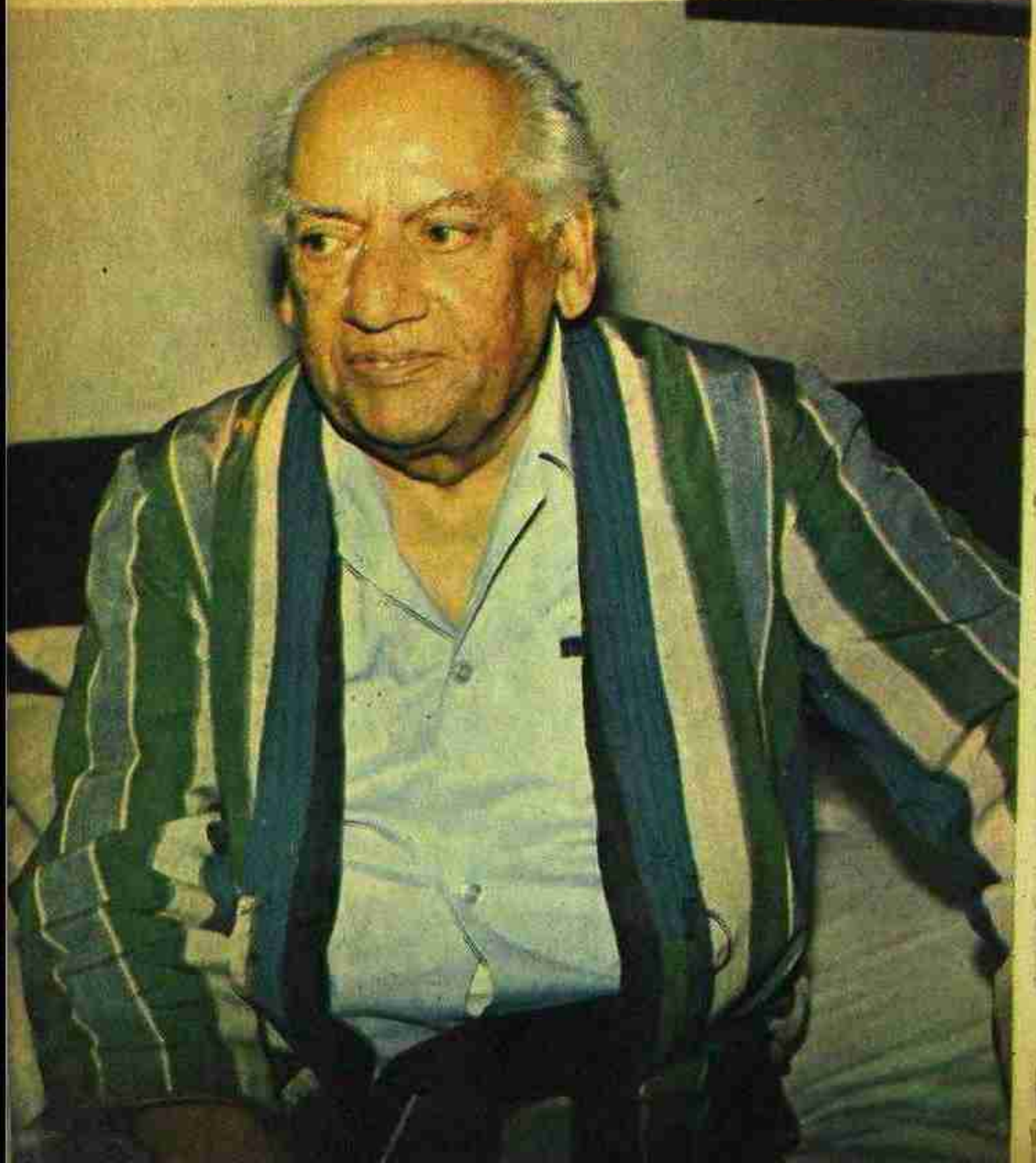
دوسرے یہ کہ اپنے دوستوں ہم جماعتوں اور اپنے
اساتذہ سے ہمیں بے پایاں شفقت اور خلوص ملا جو
بعد کے زمانے کے دوستوں اور معاصرین سے ملا
اور آج بھی مل رہا ہے۔

صبح ہم اپنے ابا کے ساتھ فجر کی نماز پڑھنے مسجد
جایا کرتے تھے۔ معمول یہ تھا کہ اذان کے ساتھ ہم اُٹھ
بیٹھے، ابا کے ساتھ مسجد گئے، نماز ادا کی اور گھنٹہ
ڈیڑھ گھنٹہ مولوی ابراہیم میر سیالکوٹی سے جو اپنے
وقت کے بڑے فاضل تھے، درسِ قرآن سُنا، ابا
کے ساتھ ڈیڑھ دو گھنٹہ کی سیر کے لئے گئے، پھر
اسکول، رات کو ابا بُلا لیا کرتے تھے خط لکھنے کے لئے
اس زمانے میں انہیں خط لکھنے میں کچھ دقت ہوتی تھی۔
ہم ان کے سکریٹری کا کام انجام دیتے تھے۔ انہیں
اخبار بھی پڑھ کر سُناتے تھے۔ ان مصروفیات کی وجہ
سے ہمیں بچپن میں بہت فائدہ ہوا۔ اردو انگریزی کے
اخبارات پڑھنے اور خطوط لکھنے کی وجہ سے ہماری
استعداد میں کافی اضافہ ہوا۔

ایک اور یاد تازہ ہوئی۔ ہمارے گھر سے ملی ہوئی
ایک دکان تھی، جہاں کتابیں کرائے پر ملتی تھیں۔ ایک
کتاب کا کرایہ دو پیسے ہوتا۔ وہاں ایک صاحب ہُوا
کرتے تھے جنہیں سب "بھائی صاحب" کہتے تھے۔
بھائی صاحب کی دکان میں اُردو ادب کا بہت بڑا
ذخیرہ جمع تھا۔ ہماری چھٹی ساتویں جماعت کی طالب علمی
میں جن کتابوں کا رواج تھا وہ آج کل قریب قریب
مفقود ہو چکی ہیں جیسے طلسم ہوشربا، فسانہ آزاد،
عبدالحلیم شرر کے ناول وغیرہ۔ یہ سب کتابیں پڑھ
ڈالیں۔ اس کے بعد شاعروں کا کلام پڑھنا شروع
کیا۔ داغ کا کلام پڑھا۔ میر کا کلام۔ غالب تو اس وقت
بہت زیادہ ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ دوسروں کا کلام
بھی آدھا سمجھ میں آتا تھا اور آدھا نہیں آتا تھا لیکن
ان کا دل پر اثر کچھ عجب قسم کا ہوتا تھا، یوں شعر سے
لگاؤ پیدا ہوا اور ادب میں دلچسپی ہونے لگی۔

ہمارے ابا کے منشی گھر کے ایک طرح کے
منیجر بھی تھے۔ ہمارا ان سے کسی بات پر اختلاف ہو گیا
تو انہوں نے کہا کہ اچھا آج ہم تمہاری شکایت کریں
گے کہ تم ناول پڑھتے ہو۔ ہمیں اس سے بہت ہی ڈر
لگا اور ہم نے ان کی بہت منت کی کہ شکایت نہ
کریں گے مگر وہ نہ مانے اور ابا سے شکایت کر ہی دی
ابا نے ہمیں بُلایا اور کہا میں نے سُنا ہے تم ناول پڑھتے
ہو۔ میں نے کہا جی ہاں۔ کہنے لگے ناول ہی پڑھنا ہے
تو انگریزی ناول پڑھو اُردو کے ناول اچھے نہیں
ہوتے۔ شہر کے قلعہ میں جو لائبریری ہے وہاں سے
ناول لا کر پڑھا کرو۔

ہم نے انگریزی ناول پڑھنے شروع کئے۔
ڈکنس، ہارڈی اور نہ جانے کیا کیا پڑھ ڈالا۔ وہ بھی
آدھا سمجھ میں آتا تھا اور آدھا پلے نہ پڑتا تھا۔ اس
مطالعہ کی وجہ سے ہماری انگریزی بہتر ہو گئی۔ دسویں
جماعت میں پہنچنے تک محسوس ہوا کہ بعض اُستاد
پڑھانے میں کچھ غلطیاں کر جاتے ہیں ہم ان کی انگریزی
درست کرنے لگے اس پر ہماری پٹائی تو نہ ہوتی البتہ وہ
اُستاد کبھی خفا ہو جاتے اور کہتے اگر تمہیں ہم سے
اچھی انگریزی آتی ہے تو پھر تم ہی پڑھایا کرو ہم سے
کیوں پڑھتے ہو۔ اس زمانے کبھی کبھی مجھ پر ایک خاص
قسم کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی موسیقی سے لگاؤ تھا۔

شام کو خورشید انور کے والد خواجہ فیروز الدین مرحوم
کی بیٹھک میں بڑے بڑے اُستادوں کا گانا سُنتے۔
اُستاد توکل حسین خاں، اُستاد عبدالوحید خاں
اُستاد عاشق علی خاں اور چھوٹے غلام علی خاں وغیرہ۔
ان اُستادوں کے ہم عصر اور ہمارے دوست رفیق
غزنوی مرحوم سے بھی صحبت ہوتی تھی۔ رفیق لا کالج میں
پڑھتے تھے۔ پڑھتے تو خاک تھے بس رسمی طور پر کالج
میں داخلہ لے رکھا تھا۔ کبھی خورشید انور کے کمرے
میں اور کبھی رفیق کے کمرے میں بیٹھک ہو جاتی تھی۔
غرض اس طرح ہمیں اس فنِ لطیف سے حظ اندوز
ہونے کا کافی موقع ملا۔

جب ہمارے والد فوت ہوئے تو پتہ چلا کہ گھر
میں کھانے تک کو کچھ نہیں ہے۔ کئی سال تک دربدر پھرے
اور فاقہ مستی کی۔ اس میں بھی لطف آیا اس لئے کہ اس
کی وجہ سے تماشائے اہلِ کرم دیکھنے کا بہت موقع ملا۔
خاص طور سے اپنے دوستوں سے کالج میں ایک چھوٹا
سا حلقہ بن گیا تھا۔ کوئٹہ کے ہمارے دو دوست تھے
احتشام الدین اور شیخ احمد حسین۔ ڈاکٹر حمید الدین بھی اس
حلقے میں شامل تھے۔ ان کے ساتھ شام کو محفل رہا کرتی۔
جوانی کے دنوں میں جو دوسرے واقعات ہوتے ہیں وہ
بھی ہوئے اور ہر کسی کے ساتھ ہوتے ہیں۔

گرمیوں میں تعطیلات ہوتیں تو ہم کبھی خورشید
انور اور بھائی طفیل کے ساتھ سری نگر چلے جایا کرتے
اور کبھی اپنی ہمشیرہ کے پاس لائل پور پہنچ جاتے۔
لائل پور میں باری علیگ اور ان کے گروہ کے دوسرے
لوگوں سے ملاقات رہتی۔ کبھی اپنی سب سے بڑی ہمشیرہ
کے ہاں دھرم سالہ چلے جاتے جہاں منظرِ قدرت دیکھنے
کا موقع ملتا اور دل پر ایک خاص قسم کا نقش ہوتا
ہمیں انسانوں سے جتنا لگاؤ رہا اتنا قدرت کے مناظر
اور مطالعہ حُسنِ فطرت سے نہیں رہا پھر بھی ان دنوں میں نے
محسوس کیا کہ شہر کے جو گلی محلے ہیں ان میں بھی اپنا
ایک حُسن ہے جو دریا صحرا کوہسار یا سبزہ و چمن سے کم نہیں
البتہ اس کو دیکھنے کے لئے بالکل دوسری طرح کی نظر
چاہیے۔

مجھے یاد ہے ہم مستی دروازے کے اندر رہتے
تھے۔ ہمارا گھر بالائی سطح پر تھا۔ نیچے بدرو بہتی تھی چھوٹا
سا ایک چمن بھی تھا چار طرف باغات تھے۔ ایک رات
چاند نکلا ہوا تھا۔ چاندنی بدرو اور ارد گرد کے کوڑے
کرکٹ کے ڈھیر پر پڑ رہی تھی۔ چاندنی اور سائے یہ
سب مل کر کچھ عجیب پُراسرار منظر بن گئے تھے۔ چاند
کی عنایت سے منظر کی بدوضعی چھپ گئی تھی اور کچھ عجیب
ہی قسم کا حُسن پیدا ہو گیا تھا جسے میں نے لکھنے کی کوشش
بھی کی ہے ایک آدھ نظم میں منظر کشی کی ہے جب شہر
کی گلیوں محلّوں اور کٹڑیوں میں کبھی دوپہر کے وقت
کبھی شام کے وقت کچھ اس قسم کا رُوپ آ جاتا ہے
جیسے معلوم ہے کوئی پرستان ہے نیم شب، چاند،
خود فراموشی، ایام دو رخامشی کے بوجھ سے چور وغیرہ
اسی زمانے سے متعلق ہیں۔

ایم۔ اے میں پہنچے تو کبھی کلاس میں جانے کی
ضرورت ہوئی کبھی بالکل جی نہ چاہا۔ دوسری کتابیں
جو نصاب میں نہیں تھیں پڑھتے رہے اس لئے امتحان
میں کوئی خاص اعزاز حاصل نہیں کیا لیکن مجھے معلوم
تھا کہ جو لوگ اوّل دوم آتے ہیں ہم ان سے زیادہ جانتے
ہیں خواہ ہمارے نمبر ان سے کم ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ بات

ہمارے اساتذہ بھی جانتے تھے جب کسی استاد کا جیسے پروفیسر ڈکنسن یا پروفیسر برشن چندر کپا پالیا تھے، لیکچر دینے کو جی نہ چاہتا تو ہم سے کہتے کہ ہمارے بجائے تم لیکچر دو۔ ایک ہی بات ہے۔ البتہ پروفیسر بخاری بڑے قاعدے کے پروفیسر تھے۔ وہ ایسا نہیں کرتے تھے۔ پروفیسر ڈکنسن کے ذمے انیسویں صدی کا نثری ادب تھا مگر انہیں اس موضوع سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اس لئے ہم سے کہا دو تین لیکچر تیار کر لو۔ دوسرے جو دو تین لائق لڑکے ہمارے ساتھ تھے ان سے بھی کہا دو دو تین تین لیکچر تم لوگ بھی تیار کر دو۔ کتابوں کے بارے میں کچھ پوچھنا ہو تو آ کے ہم سے پوچھ لینا۔ چنانچہ ہم استاد اسی زمانے میں ہو گئے تھے۔

ابتدائی شاعری کے دوران میں یا کالج کے زمانے میں ہمیں کوئی خیال ہی نہ گزرا کہ ہم شاعر بنیں گے۔ سیاست وغیرہ تو اس وقت ذہن میں بالکل ہی نہ تھی اگرچہ اس وقت کی تحریکوں، مثلاً کانگریس تحریک خلافت تحریک یا بھگت سنگھ کی دہشت پسند تحریک کے اثرات تو ذہن میں تھے۔ مگر ہم خود ان میں سے کسی قصے میں شریک نہیں تھے۔

شروع میں خیال ہوا کہ ہم کوئی بڑے کرکٹر بن جائیں کیوں کہ لڑکپن سے کرکٹ کا شوق تھا اور بہت کھیل چکے تھے پھر جی چاہا استاد بننا چاہیے، ریسرچ کرنے کا شوق تھا۔ ان میں سے کوئی بات بھی نہ بنی۔ ہم کرکٹر بن سکے نہ نقاد اور نہ ریسرچ کیا۔ البتہ استاد ہو کر امرتسر چلے گئے۔

ہماری زندگی کا شاید سب سے خوش گوار زمانہ امرتسر ہی کا تھا اور کئی اعتبار سے ایک تو اس وجہ سے کہ جب ہمیں پہلی دفعہ پڑھانے کا موقع ملا تو بہت لطف آیا اپنے طلبہ سے دوستی کا لطف۔ ان سے ملنے اور روزمرہ کی رسم و راہ کا لطف، ان سے کچھ سیکھنے اور انہیں پڑھانے کا لطف۔ ان لوگوں سے دوستی اب تک قائم ہے۔ دوسرے یہ کہ اس زمانے میں کچھ سنجیدگی سے شعر لکھنا شروع کیا۔ تیسرے یہ کہ امرتسر ہی میں پہلی بار سیاست میں تھوڑی بہت بصیرت اپنے کچھ رفقاء کی وجہ سے پیدا ہوئی جن میں محمود الظفر تھے۔ ڈاکٹر رشید جہاں تھیں، بعد میں ڈاکٹر تاثیر آ گئے تھے۔ یہ ایک نئی دنیا ثابت ہوئی۔ مزدوروں میں کام شروع کیا۔ سول لبرٹیز کی ایک انجمن بنی تو اس میں کام کیا۔ ترقی پسند تحریک شروع ہوئی تو اس کی تنظیم میں کام کیا۔ ان سب سے ذہنی تسکین کا ایک بالکل نیا میدان ہاتھ آیا۔

ترقی پسند ادب کے بارے میں بحثیں شروع ہوئیں اور ان میں حصہ لیا۔ ادب لطیف کی ادارت کی پیشکش ہوئی تو دو تین برس اس کا کام کیا۔ اس زمانے میں لکھنے والوں کے دو بڑے گروہ تھے ایک "ادب برائے ادب" والے، دوسرے ترقی پسند تھے کئی برس تک ان دونوں کے درمیان بحثیں چلتی رہیں جس کی وجہ سے کافی مصروفیت رہی جو بجائے خود ایک بہت ہی دلچسپ اور تسکین دہ تجربہ تھا۔ برصغیر میں ریڈیو شروع ہوا۔ ریڈیو میں ہمارے دوست تھے۔ ایک سید رشید احمد تھے جو ریڈیو، پاکستان کے ڈائرکٹر جنرل ہو گئے۔ دوسرے سومناتھ چپ تھے جو آج کل ہندوستان میں شعبۂ سیاحت کے

سربراہ ہیں۔ دونوں باری باری سے لاہور کے اسٹیشن ڈائرکٹر مقرر ہوئے۔ ہم اور ہمارے ساتھ شہر کے دو چار اور ادیب ڈاکٹر تاثیر، حسرت صوفی صاحب اور ہری چند اختر وغیرہ ریڈیو آنے جانے لگے۔ اس زمانے میں ریڈیو کا پروگرام ڈائرکٹر آف پروگرامز نہیں بناتا تھا ہم لوگ مل کر بنایا کرتے تھے۔ نئی نئی باتیں سوچتے تھے اور ان سے پروگرام مرتب کرتے تھے۔ ان دنوں ہم نے ڈرامے لکھے فیچر لکھے دو چار کہانیاں لکھیں، یہ سب ایک مستقل مشغلہ تھا۔ رشید جب دلی چلے گئے تو ہم دہلی جانے لگے۔ وہاں نئے نئے لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ دہلی اور لکھنؤ کے لکھنے والے گروہوں سے شناسائی ہوئی۔ مجاز، سردار جعفری، جاں نثار اختر، جذبی اور مخدوم مرحوم سے ریڈیو کے توسط سے رابطہ پیدا ہوا جس سے دوستی کے علاوہ بصیرت اور سوجھ بوجھ میں طرح طرح کے اضافے ہوئے۔ وہ سارا زمانہ مصروفیت کا بھی تھا اور ایک طرح سے بے فکری کا بھی۔

● فیض احمد فیض اور بیگم ایلس فیض
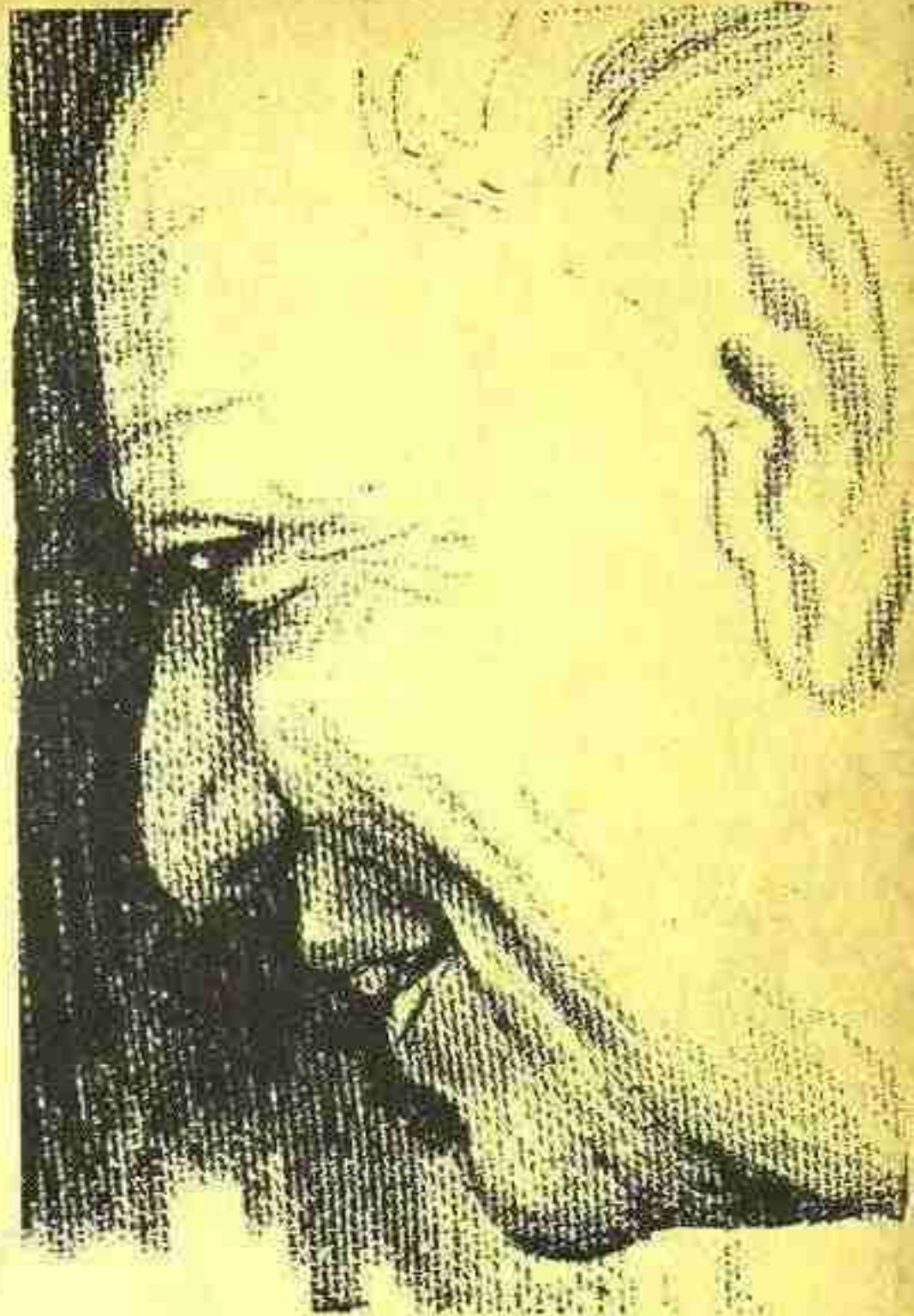
ہم سفر اور شریکِ حیات فیض

"کیا تم اپنے شوہر کی شاعری سمجھ لیتی ہو؟" یہ سوال مجھ سے اکثر کیا گیا ہے اور میں نے کافی غور و خوض کے بعد اس کا ایک ایسا جواب ڈھونڈ لیا ہے جو میرے خیال میں صداقت پر مبنی ہے اور حرفِ آخر کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ میرا جواب ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ میں ان کی شاعری کو سمجھنے کی دعویٰ تو نہیں کرتی لیکن یہ دعویٰ ضرور ہے کہ میں شاعر کو سمجھتی ہوں اور کسی شاعر کی شخصیت ہی

اس کی شاعری کا سرچشمہ اور اس کے وجدان کی قوتِ محرکہ ہوتی ہے مگر میں اس مضمون میں ان کی شخصیت کی صورت گری کی کوشش نہیں کروں گی، کیونکہ اس کے لئے ان اقلیموں کو طے کرنا پڑے گا جو ایک بیوی کے دائرۂ عمل سے باہر ہیں۔ بلکہ میں ایک شاعر کے گھر کی زندگی کا خاکہ پیش کروں گی۔ جہاں وہ اپنے اعزا اور احباب کے جھمگٹے میں ہوتا ہے جس کے گوشۂ تنہائی میں وہ جسمانی اور ذہنی تکان دور کرتا ہے اور جہاں وہ کبھی شعوری اور کبھی غیر شعوری طور پر شعر کی تخلیق کرتا ہے۔

میں نے لوگوں کو اکثر کہتے سنا ہے کہ فلاں شخص کا مزاج عجیب و غریب ہی اس کے اطوار دنیا جہاں سے نرالے ہیں تو کیا ہوا، وہ بہر صورت ایک فن کار ہے۔ اس کی تلون مزاجی، اس کی بوقلمونیت اور اس کے لاابالی پن کو صرف اس لئے قابلِ معافی سمجھا جاتا ہے کہ وہ فن کار ہے، اسی کسی حد تک خود فراموشی، تساہل، تن آسانی اور بعض دنیاوی فرائض سے گریز کرنے کی اجازت ہوتی ہے، بالخصوص وہ فرائض اگر ایسے ہوں جنہیں ادا کرنے کے لئے اگر ہاتھ پیر ہلانے کی بھی ضرورت ہو۔ لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ عام لوگوں کے مقابلے میں فن کار زیادہ خود فراموش کیوں ہوتا ہے؟ غالباً اس کا سبب یہ ہے کہ اس کا ذہن ہمہ وقت مصروف رہتا ہے۔ بہر صورت یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ فن کار کی بعض کوتاہیوں سے ہر شخص کو سابقہ پڑتا رہتا ہے اور اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اُسے ایک حد تک قابلِ معافی بھی سمجھنا چاہئے۔ وہ لوگوں سے ملنے کے وعدے کر کے بھول جاتا ہے۔ اپنی جیب و گریباں کا ہوش نہیں رہتا۔ کہیں جانا ہو تو ٹرین روانہ ہو جانے کے بعد

اسٹیشن پہنچا ہے۔ روپے کا بٹوہ کہیں رکھ کر بھول جاتا
ہے، اور اس کے سارا گھر چھان مارتا ہے لیکن ممکن ہے
وہ اس کی جیب میں ہی موجود ہو۔ اس کا فونٹین ہمیشہ
چوری ہو جاتا ہے۔ اس کے اعزا و اقربا کو طوعاً و کرہاً
یہ تمام باتیں برداشت کرنا ہوتی ہیں بلکہ دن بھر کی
مسلسل الجھنوں کا نتیجہ کسی نظم، کسی شبیہہ یا تصویر
یا کسی اور شاہکار کی شکل میں ظاہر ہو جائے تو انہیں
اپنی قسمت پر شاکر ہونا چاہئے۔

کئی سال ادھر کی بات ہے کہ مجھے ایک کوٹ
کی گم شدگی کا پہلا تجربہ ہوا۔ ہماری نئی نئی شادی ہوئی
تھی اور ہماری آمدنی بہت کم تھی۔ جنگ چھڑ چکی تھی
اور قیمتیں تیزی سے چڑھ رہی تھیں۔ میں ہندوستان
میں تھی اور میرے والدین انگلستان میں۔ اس لئے
ان سے بھی کوئی مدد نہیں مل سکتی تھی، پھر تنخواہ بھی اتنی
نہیں تھی جتنی جنگ سے پہلے ملتی تھی۔ ہمیں شادی یا
فن کاری ان کمزوریوں کے لئے کوئی الاؤنس بھی نہیں
ملتا تھا جنہیں وہ اپنا حق تصور کرتا ہے۔ اس کے
باوجود ہم نے ایک سوٹ بنوا ہی ڈالا۔ نیا سوٹ بنوانا
اس زمانے میں ایک عیاشی سے کم نہ تھا۔ فیض اُسے
لینے کے لئے امرتسر گئے اور رات گئے لاہور واپس آئے
ان دنوں ہم نہر کے قریب ایک دور دراز اور الگ تھلگ
مکان میں رہتے تھے۔ اس وقت کوئی تانگے والا وہاں
تک جانے پر تیار نہیں ہوتا تھا۔ بڑی مشکل سے ایک
تانگے والا اس پر راضی ہو گیا کہ وہ انہیں کچھ دور تک
پہنچا دے گا۔ تانگے والے نے فیض کو جس جگہ اتار دیا
وہاں سے ہمارا گھر تقریباً ایک میل دور تھا اور انہیں
یہ مسافت پیدل طے کرنی پڑی۔ قیمتی بنڈل ان کی بغل
میں دبا ہوا تھا۔ گھر پہنچ کر فیض نے مجھے جگایا اور میں
نے بنڈل ان سے لے لیا۔ لیکن اسے ہاتھ میں لیتے ہی
میرا ماتھا ٹھنکا، کیونکہ اس میں ایک گرم سوٹ ہونے
کے باوجود بنڈل بہت ہلکا تھا۔ بنڈل کا ایک کنارہ
کھلا ہوا تھا اور کوٹ ندارد تھا، فیض نے کہا رات
بہت ہو گئی ہے اب اُسے صبح تلاش کروں گا لیکن مجھے
یقین ہے کہ جہاں تانگے والے نے مجھے اتارا تھا وہاں
سے گھر تک آنے میں ہی کوٹ کہیں گر گیا ہے، لیکن تھوڑی
سی بحث کے بعد جو ایک حد تک یک طرفہ تھی یہ طے پایا
کہ وہ ٹارچ لے کر اسی وقت کوٹ تلاش کرنے چلے جائیں
لیکن نیم تلاشِ نیم شبی کے باوجود کوٹ نہ ملا۔ پتلون البتہ
میرے پاس کئی سال تک جوں کی توں رکھی رہی۔ اسے
کسی نے استعمال نہیں کیا اور ہماری ازدواجی زندگی
کے پہلے اسراف کی یاد تازہ کرتی رہی۔ لیکن ۱۹۵۰ء کے
سیلاب کے بعد یہ نشانی میرے پاس باقی نہ رہی، اُسے
ایک مستحق کو دے دیا گیا۔

چند مہینے بعد کپڑوں سے بھرا ہوا ایک سوٹ کیس
گم ہو گیا تو میں نے کسی ناگواری کا اظہار تک نہیں کیا، لیکن
۱۹۴۹ء میں کراچی جاتے ہوئے فیض کا بستر ایک اور مسافر
سے بدل گیا تو میری قوت برداشت قریب قریب جواب دے گئی
بستر کھولنے پر مجھے اس میں جو گدا ملا وہ اس گدے سے
بہت اچھا تھا جو کہیں اور چلا گیا تھا لیکن مجھے اپنی جگہ پر
کچھ ندامت اور کچھ پریشانی سی تھی کہ اس بستر کے مالک
نے اپنے دل میں کیا سوچا ہوگا۔

بعض اوقات میرا یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ یہ لاابالی پن
ان کی طبعی فراخ دلی اور بے نیازی کی غمازی کرتا ہے۔
اور انہیں کسی چیز کی افادی قدر و قیمت کی کوئی پرواہ نہیں

ہے۔ اس سے صرف ان کی کتابیں ضرور مستثنیٰ ہیں جنہیں وہ بڑی حریصانہ نظروں سے دیکھتے ہیں، اور انہیں اس طرح سینے سے لگا کر رکھتے ہیں جیسے کوئی بندۂ زر اور بخیل اپنے مال و دولت پر اپنی جان نچھاور کر رہا ہو۔ لیکن کوئی شخص ان سے کوئی کتاب مانگتا ہے تو ان سے ان سے انکار بھی بن نہیں پڑتا۔ جب میں ان سے پوچھتی ہوں کہ تم نے بلا سوچے سمجھے کتاب کیوں دے دی معلوم نہیں اب وہ واپس بھی ملے گی یا نہیں تو وہ بڑی متانت اور برجستگی سے جواب دیتے ہیں۔ "جب تک کوئی اس کتاب کو پڑھتا رہے گا اسے دینے کا خطرہ مول لینے میں کون احمق نہیں!"

۱۹۷۶ء میں میرے تمام زیورات چوری ہو گئے۔ میری خوش دامن نے مجھے کچھ چھوٹے چھوٹے لیکن پر تکلف زیور دیئے تھے۔ چند چیزیں میں نے خود بھی خریدیں تھیں چور وہ سب اٹھا کر لے گئے۔ میرے اپنے گھر میں یہ پہلی چوری تھی۔ پولیس کی مدد سے بھی ہمیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا اور ہم یہ سوچ کر بیٹھ رہے کہ جانے والی چیز کا غم ہی کیا۔ میرے چہرے پر احساسِ محرومی کی جھلک دیکھ کر فیض کہنے لگے۔ تم نے شاعر کا یہ مصرع نہیں سنا؎

دریا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

اور میں اچانک یہ محسوس کرنے لگی کہ میرے احساسِ محرومی میں ایک طرح کا احساسِ مخلصی بھی شامل ہو گیا ہے۔ ان دونوں شاعروں سے میری اپنی رائے بھی زیادہ مختلف نہیں تھی۔

میرا قیاس آہستہ آہستہ یقین کی منزل پر پہنچ گیا ہے کہ ہماری بی بی سلیمہ بھی اپنے والد کے نقش قدم پر ہے اور ان سے کافی مماثل بھی ہے لیکن میں یہ بھی جانتی ہوں کہ جو لوگ بڑی فراخ دلی سے اپنی اچھی سے اچھی چیز دوسروں کو اٹھا کر دے دیتے ہیں یا کسی چیز کی گمشدگی پر ذرا بھی ملول نہیں ہوتے بلکہ جن کے لئے احساسِ محرومی بھی لذت بخش بن جاتا ہے، ان کی حیثیت انتہائی مسرت افزا، ان کی شخصیت انتہائی دلپذیر اور ان کی رفاقت ہمیشہ تفننِ طبع ہوتی ہے۔

ان خامیوں یا خصوصیتوں کا توڑ کرنے کے لئے خوش قسمتی سے مجھ میں ایک طرح کی ملکیت پسندی پیدا ہو گئی ہے اور کبھی کبھی کوئی ایسی چیز بھی واپس لے لیتی ہوں جس کی واپسی کی کوئی امید باقی نہیں رہ جاتی کیونکہ ہمارے پاس بھی تو کچھ ہونا چاہئے ورنہ ہم دوسروں کو دیں گے کیا؟ منیرہ اپنی بڑی بہن سے زیادہ حقیقت پسند ہے اور ہر چیز کا باقاعدہ حساب رکھتی ہے۔ وہ بہت چھوٹی سی تھی لیکن کتابیں پڑھنے اور تصویریں دیکھنے کی حد سے زیادہ شوقین تھی۔ ایک دن اس نے اپنی باجی کی کتاب اٹھاتے ہوئے پوچھا۔ "باجی! میں آپ کی کتاب دیکھ لوں؟" سلیمہ کو بھی اپنی کتابیں بہت عزیز تھیں۔ اس نے جواب دیا۔ "نہیں تم خود اپنی کیوں نہیں دیکھتیں۔" "باجی، میں اپنی کتاب بہت زیادہ دیکھوں گی تو وہ گھس جائے گی۔" منیرہ نے جواب دیا فیض کو علم ہوا تو انہوں نے اطمینان کا سانس لیا اور بولے "ہمارے گھر میں کوئی تو ایسا بھی ہونا چاہئے۔"

ظاہر ہے کہ فیاض اور فراخ دل آدمی انسانوں کے ہجوم اور ان کی معیت کو بھی بہت پسند کرتے ہیں عید ہولی، بسنت، اور دوسرے تہواروں میں سیر و تفریح کرنے والوں کا ہجوم دیکھ کر فیض خوشی سے پھولے نہیں سماتے۔ وہ ان کا دور سے تماشہ نہیں دیکھتے بلکہ ان

کی رنگ رلیوں میں خود بھی حصہ لیتے ہیں۔ اپنی خاموشی اور کم آمیزی کے باوجود۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ ہمیشہ ذہنی یک سوئی۔ ایک پُرسکون گھریلو زندگی اور عدالت گزینی کے متمنّی رہے۔

ہمارے گھر کے معمولات بچوں کے نظام اوقات کے تابع ہیں اور فیض نے اسے بے چوں وچراں قبول کرلیا ہے تاکہ بچوں کی باقاعدہ زندگی میں کوئی خلل

پکتے رہ جائیں کہ ہم نے ابّا جان کو دن بھر سے نہیں دیکھا انہیں آجانے دیجئے لیکن ممی اگر یہ کہدیں کہ نہیں اب سو جاؤ تو ان میں سرتابی کی مجال نہیں۔ بچوں کی پرورش و پرداخت کے معاملات سے اپنی لاعلمی کا اعتراف خود فیض صاحب کو بھی ہے اور وہ اکثر کہتے ہیں کہ یہ کام میرے دائرہ عمل سے باہر ہے۔

جون ۱۹۵۳ء میں فیض جب حیدرآباد جیل

● لاہور کی ایک تقریب میں قتیل شفائی، اشفاق احمد اور فیض احمد فیض

نہ پڑے یا انہیں کسی قسم کی زحمت نہ ہو۔ ممی کا ہر قول بچوں کے لئے حکم کی حیثیت رکھتا ہے جس کے خلاف اور عدالت میں اپیل ممکن نہیں۔ رات کو سونے سے پہلے اگر انہیں بہت چھوٹی سی کہانی سنائی جائے یا بچے

میں تھے تو میں نے انہیں ایک خط میں لکھا تھا کہ ان بچیوں کی بیک وقت ماں اور باپ کے فرائض انجام دینا میرے لئے کتنا مشکل ہے۔" اس کے جواب میں انہوں نے مجھے یہ خط لکھا تھا کہ "میری بچیوں کو تم سے اچھی ماں

نہیں مل سکتی، کتنی خوش نصیب ہیں وہ" ان کی تعلیم و
تربیت سے فیض کی بے تعلقی کے باوجود بچیاں فیض سے
بالکل نہیں ڈرتیں بلکہ باپ بیٹیوں نے ایک دوسرے
کے عجیب و غریب اور دلچسپ نام رکھ چھوڑے ہیں۔
ان کے مقدمے کے دوران میں ہمارے وکیل صاحبزادہ
نوازش علی خاں مرحوم نے ایک بار جیل جاتے ہوئے
مجھ سے پوچھا تھا کہ تم نے فیض کے نام عید کے تار میں
جن کبوتروں کا ذکر کیا تھا وہ کون ہیں اور میں نے ان
دونوں بچیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جو میرے
سامنے اسی وکٹوریا پر بیٹھی تھیں، کہا، "وہ کیا بیٹھی
ہوئی ہیں۔"

منیرہ نو مہینے جدائی کے بعد جب اپنے والد سے
پہلی بار جیل میں ملی اس وقت اس کی عمر صرف ساڑھے
چار سال تھی۔ اس نے انہیں دیکھتے ہی کہا "ابا جان!
آپ تو بالکل بوڑھے ہوگئے۔ میں تو سمجھتی تھی آپ
کی عمر بہت کم ہوگی اور آپ بڑے خوب صورت ہوں گے
ارے آپ کے بال بھی سفید ہوگئے۔" لیکن ان کی گود
میں پہنچ کر وہ بالکل بدل گئی اور اس نے کہنا شروع
کیا۔ "ابا جان! آپ گھر نہیں چلیں گے؟ امی مجھے مارتی
ہیں۔" یہ سُن کر میری اندر کی سانس اندر اور باہر کی
باہر رک گئی۔ کیوں کہ بچوں کو مارنا ہمارے خاندان میں
قریب قریب بالکل منع ہے۔ لیکن فوراً ہی میں نے محسوس
کیا کہ یہ شکایت بڑی بامعنی ہے اور وہ دراصل یہ کہنا
چاہتی ہے کہ گھر میں ان کی کمی شدت سے محسوس کی جاتی
ہے۔

منیرہ انہیں ہر خط میں یہ ضرور لکھتی ہے کہ دیکھئے
میرا خط کسی اور کو نہ دکھائیے گا۔" لیکن اسے کیا معلوم
کہ ان کے نام جتنے خط جاتے ہیں ان کے ایک ایک لفظ
کو سینسر بڑے غور سے پڑھتا ہے۔ پچھلے سال ایک بار
منٹگمری جیل کے اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ مسٹر لودی کی تو
تو شامت ہی آگئی۔ بے چارے نے کہیں اس سے یہ
کہہ دیا کہ تم نے اپنے ابا جان کو جو خط لکھے ہیں وہ مجھے
بہت پسند آئے، یہ سنتے ہی منیرہ غصّے سے سُرخ ہوگئی
اور ان پر برس پڑی۔ چھوٹی لڑکی بڑی لڑاکا، چلبلی،
اور زود حِس ہے۔ غصّہ تو اس کی ناک پر رکھا رہتا
ہے، لیکن وہ محبّت کا ایک ننھا سا مجسمہ بھی ہے۔
اس میں صبر و تحمّل کی ضرور کمی ہے لیکن اس کے
باوجود وہ بڑی دلچسپ اور باغ و بہار ہے۔ ہم
میں ہمّت ہوتی تو غالباً ہم سب اسی طرح بن جانا چاہتے
ہیں۔ اس میں اپنے والد کا بے پایاں صبر و تحمّل نہیں،
نہ وہ اپنی بڑی بہن کی طرح متین اور سلیم الطبع ہے
بلکہ بعض رشتے والیاں تو یہ کہتی ہیں کہ یہ بالکل اپنی
ماں پر گئی ہے، لیکن میری رائے میں اس کی تصدیق تو
اس کی نانی کر سکتی ہیں۔

بعض لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ آپ تو اردو
بڑی اچھی بول لیتی ہیں۔ شاید یہ فیض کا اثر ہے۔ حقیقت
اس کے برعکس نہ سہی مگر اس سے مختلف ضرور ہے
زبانیں، میں کچھ فطری طور پر آسانی سے سیکھ لیتی ہوں
لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہم جس
ماحول میں رہتے ہیں وہ ادبی اور بول چال کی زبان
سیکھنے کے لئے انتہائی سازگار ہے۔ جہاں تک بچوں کا
تعلق ہے۔ فیض کی ہمیشہ ہی کوشش رہی ہے کہ وہ
اردو ہی کو اپنائیں۔ وہ اکثر کہتے ہیں کہ بچیاں میری خوشنما
زبان" تو بہر صورت سیکھ لیں گی اور ان کی ماں آئے

سکھانے کے لئے کافی ہے۔ لیکن اب اپنی زبان پر عبور
حاصل کرنے کی ضرورت تیزی سے بڑھتی جا رہی ہے۔
جس وقت تمام گھر والے بیٹھے ہوتے ہیں اور آپس میں
باتیں ہوتی ہیں تو بچیاں کبھی ایک زبان بولتی ہیں کبھی
دوسری۔ وہ مجھ سے انگریزی میں اور فیض سے اردو
میں باتیں کرتی ہیں' اس لئے کسی خاص کوشش کے
بغیر وہ دونوں زبانیں بولنے لگی ہیں۔

بعض دوست مجھ سے سوال کرتے ہیں کہ تم
نے کبھی فیض کو غصے کے عالم میں بھی دیکھا ہے۔ فیض
اپنی نرم مزاجی کے لئے مشہور ہیں اور ہر شخص کو معلوم
ہے کہ غصہ انہیں کبھی آتا ہی نہیں۔ میں اپنے دوستوں
کو یقین دلانا چاہتی ہوں کہ گھریلو زندگی میں بھی انہوں
نے کبھی کسی آبگینے کو ٹھیس نہیں پہنچائی۔ میرا یہ جواب سن کر
ایک ایک دوست نے بڑی نیک نیتی کے ساتھ کہا تھا
کہ جنگ کے بعد ملاپ میں جو مزہ ملتا ہے اس کی لذت
سے تم محروم ہو۔ یہ درست ہے کہ اِس لذت سے ہم
محروم رہے ہیں جسے معلوم نہیں مسرت بھی کہا جا سکتا
یا نہیں لیکن اس کرب اور کوفت سے ہم یقیناً محفوظ
رہے جو برافروختگی یا جلد بازی کے عالم میں کوئی بات
کہہ جانے میں اس پر متاسف ہونے میں ہوتی ہے۔ ہم
اپنے اختلاف پر باتیں ضرور کرتے ہیں لیکن بات اس
سے کبھی بڑھنے ہی نہیں پاتی اور آخر کار ہم اختلافِ
رائے پر ہی متفق ہو جاتے ہیں۔

ہماری خانگی زندگی کے ایک پہلو پر ایک بار
جوش صاحب نے بڑا دلچسپ تبصرہ کیا تھا۔ ۱۹۴۶ء
میں وہ دہلی آئے۔ اس سے پہلے ان سے سری نگر میں
ہماری شادی کے موقع پر ملاقات ہوئی تھی لیکن عقد
کے بعد ہی ایک مشاعرہ شروع ہو گیا جس میں انہوں
نے اور مجاز نے خوب اپنا کلام سنایا۔ اس لئے باتیں
کرنے کا موقع ہی نہیں مل سکا اور اسے بعد کے لئے
اٹھا رکھا گیا۔ دہلی میں ملاقات ہونے پر انہوں نے مجھ
سے سوال کیا۔ "آپ میں اور فیض میں لڑائی بھی ہوتی
ہے یا نہیں؟" میرے جواب میں نفی سن کر انہوں نے افسوس
کے ساتھ سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "کتنے افسوس کی بات
ہے یہ؟" انہوں نے جملہ پھر دہرایا لیکن ان کی آنکھوں
میں تمسخر جھلک رہا تھا۔ یہ بڑے افسوس کی بات ہے
پھر آپ لوگوں میں محبت کیسے ہو سکتی ہے!" میں نہیں
کہہ سکتی کہ جوش صاحب نے یہ نتیجہ کیسے اخذ کیا۔ لیکن
میں آج تک ان سے اتفاقِ رائے نہ کر سکی۔

ہماری ازدواجی زندگی کے دوران میں دکھ درد
اور رنج و ملال کے مواقع بھی آئے ہیں۔ میں نے فیض
کو ایک پیاری بہن، ایک بھائی اور بہت سے عزیز اور
محبوب دوستوں سے محروم ہوتے دیکھا ہے' لیکن وہ
جیسے اِن غموں کو برداشت کرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔
ان کی جبیں کبھی شکن آلود نہیں ہوتی۔ ان میں ایک ایسا
تحمل اور ایک ایسی رجائیت پیدا ہو گئی ہے جو محض ڈھونگ
ہی نہیں ہے بلکہ ان کا فلسفۂ حیات اور ان کی امیدیں
ان کی آئینہ دار ہیں۔ انسان کی فطری شرافت پر ان کا
عقیدہ بہت راسخ ہے۔ یہ شرافت ناسازگار حالات
میں مسخ ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کا وجود کبھی ختم نہیں ہوتا۔
وہ کہتے ہیں کہ انسانی فطرت کا جائزہ لیتے ہوئے ہم
اس کی خامیوں پر ہی کیوں انگشت نمائی کریں، ہم اس کی
خوبیوں کی بات کیوں نہ کریں یا انہیں اپنا موضوع سخن
کیوں نہ بنائیں۔

▲ فیض احمد فیض لاہور میں اپنے اہلِ خاندان کے ساتھ

▼ جنوری ۱۹۸۴ء میں کراچی کی ایک نجی تقریب میں۔ دائیں طرف سے فیض احمد فیض، شفیع عقیل (میگزین ایڈیٹر جنگ) اطہر علی (بی بی سی) اور بیگم اطہر علی۔
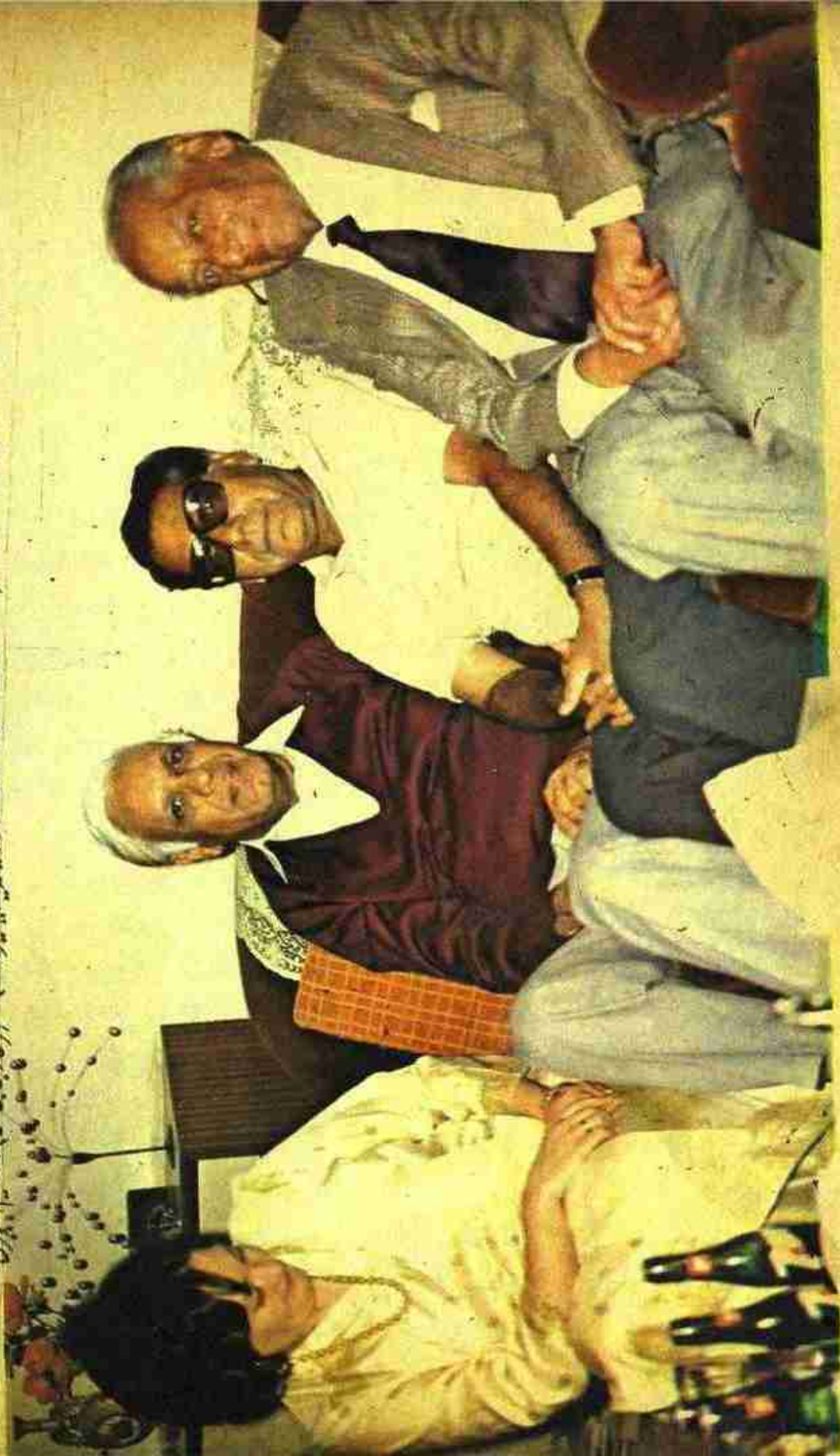
گذشتہ ساڑھے تین سال میں انھوں نے مجھے بارہا لکھا ہے کہ بچیوں کو خوش رکھو اور انہیں شکھ پہنچاؤ۔ انہیں رنج وغم سے روشناس کرانے کے لئے کافی وقت پڑا ہے، اور بچیاں بھی یہی تمام پہیلیاں، لطیفے اور پرمذاق کہانیاں اپنے والد سے ملاقات کے لئے اٹھا رکھتی ہیں ان کی باتیں سن کر اکثر سنگدل اور ترش رو وارڈر بھی اپنی ہنسی ضبط نہیں کر سکے۔ فیض نے غم کا ایک روشن اور اثباتی پہلو بھی تلاش کر لیا ہے یعنی غم کے باوجود حصولِ مسرت کے لئے مسلسل جدوجہد۔

ہمارے گھر میں اگر کسی کی سالگرہ ہو تو خوب خوشیاں منائی جاتی ہیں اور ایک دوسرے کو تحفے دیئے جاتے ہیں۔ مجھے ننھی سلیمہ کی تقریباً ابھی تک اچھی طرح یاد ہے۔ فیض تہیّہ کر چکے تھے کہ وہ اس کے لئے تحفے ضرور لائیں گے۔ لیکن میرا دعویٰ ہے کہ اتنے چھوٹے بچے کے قابل تحفوں کے انتخاب کے لئے صرف پدری محبت کافی نہیں ہے۔ اس زمانے میں ہم دہلی میں رہتے تھے۔ وہ اور مجید ملک خریداری کی مہم پر روانہ ہوئے اور کناٹ پلیس سے واپس ہوئے تو بنڈلوں سے لدے ہوئے تھے۔ وہ بچیوں کی ایک چھوٹی سی گاڑی، تصویروں کی ایک کتاب اور ایک ٹی سیٹ لے کر آئے تھے لیکن ایک بنڈل جو کھلا نہ تھا اور ہر شخص یہ دیکھنے کا مشتاق تھا کہ اس میں کیا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ پارسل میں ایک ننھی منی خوب صورت سی گڑیا ہے جو گاڑی پر شان سے بیٹھ کر سیر کرے گی۔ لیکن ان دونوں نے اس کی خریداری کرنے سے پہلے گڑیا کے کپڑے اٹھا کر دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی کیونکہ جسے وہ گڑیا سمجھ رہے تھے وہ دراصل ٹی کوزی تھی جسے آخر کار آتش دان پر فروکش کر دیا گیا۔ اور گاڑی پر سواری کے لئے ایک اور گڑیا خریدی گئی جو اتنی خوب صورت تو نہیں تھی لیکن تھی گڑیا ہی۔ انگلستان کے ہر خاندان میں سالگرہ کے موقع پر بڑی خوشیاں منائی جاتی ہیں۔ لیکن پاکستان پیدائش کے اندراج اور ولادت کے سرٹیفکیٹ کے اندراج کا باقاعدہ انتظام نہ ہونے کی وجہ سے عموماً یہ مسئلہ حل نہیں ہوتا کہ سالگرہ کب منائی جائے۔ میں نے ایک بار اپنی خوش دامن سے فیض کی تاریخِ ولادت معلوم کی: کیونکہ میری رائے میں یہ کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا تھا کہ سب کی تو سالگرہ منائی جائے لیکن صاحبِ خانہ ہی محروم رہے۔ ان کا جواب بہت مبہم تھا۔ لیکن انتہائی دل چسپ تھا۔ انھوں نے کہا کہ مجھے صحیح تاریخ تو یاد نہیں لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ ان کی ولادت کے وقت بارش ہو رہی تھی مگر یہ کسی کو یاد نہیں کہ بارش گرمیوں میں ہو رہی تھی یا سردیوں میں یا بادل محض اتفاق سے گھر گھر برسنے لگے تھے۔ بعد میں فیض کے ایک ماموں نے ہماری مشکل حل کر دی، انہیں صحیح تاریخ یاد تھی اور یہ وہی تاریخ تھی جو ان کے میٹرک کے سرٹیفکیٹ میں درج تھی۔

میں ۱۹۳۸ء میں ہندوستان آنے کی تیاری کر رہی تھی کہ میری روانگی سے چند ہی روز قبل لندن میں مسز تاثیر کا خط ملا جس میں انھوں نے ایک انتہائی عزیز دوست کے لئے بعض چیزیں منگائی تھیں۔ اپنی مصروفیت کے باوجود میں ان فرمائشوں کی خریداری کے لئے آکسفرڈ سٹریٹ میں بھاگی پھری اور ان کے دوست کو برا بھلا کہتی رہی۔ نئی چیزوں کے لئے جگہ نکالنے کے لئے مجھے اپنا سامان کئی بار کھولنا باندھنا پڑا۔ اس وقت مجھے کیا

معلوم تھا کہ کچھ دن بعد یہی چیزیں اپنی گمشدہ ہستی بن جائیں گی لیکن اس کا احساس مجھے اب ہو رہا ہے کہ اس کے انتہائی عزیز دوست نے عین وقت پر جن چیزوں کی فرمائش کی تھی اُن پر متعجب ہونے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

اپنی شاعرانہ شہرت قائم رکھنے کے لیے ہر شاعر کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ برابر شعر کہتا رہے، لوگ مجھ سے پوچھتے تھے کہ شادی کے بعد فیض نے شاعری کیوں ترک کر دی تھی۔ ۱۹۵۰ء تک وہ کبھی کبھی کچھ نہ لکھتے رہے، اور اس دوران میں بھی انہوں نے بعض نظمیں اور غزلیں معرکۃ الآرا کہی ہیں۔ لیکن یہ درست ہے کہ انہوں نے زیادہ نہیں لکھا۔ فیض اس کا جواب یہ دیتے تھے کہ شاید اب میں بہت زیادہ آسودہ خاطر ہو گیا ہوں اور میری بہت زیادہ خبرگیری کی جاتی ہے لیکن اچھی شاعری کے لیے شاید تکلیف اور غم ضروری ہے۔ "دستِ صبا" کی نظموں کے اور غزلوں کا محرک بھی ان کا غم ہی ہے لیکن یہ محض ان کا ذاتی غم نہیں بلکہ ایک وسیع تر غم ہے "دستِ صبا" کے متعلق انہوں نے جیل سے مجھے لکھا "یہ مجموعہ تمہارا ہے۔"

جب آسمان پر بادل چھا جاتے ہیں اور تیز ہوا چلنے لگتی ہے تو شاعر کی رگِ احساس بھی پھڑک اٹھتی ہے۔ اس کی شاعری اس کے دل میں کروٹیں بدل کر بیدار ہو جاتی ہے اور وہ سوال کرتی ہے: "کیا میں دن کا باقی حصہ باغ میں گزار سکتا ہوں۔ ممکن ہے کہ میں کوئی نظم بُننے میں کامیاب ہو جاؤں" کئی گھنٹے کے بعد وہ واپس آتے ہیں تو میں ان کی آہٹ سُن کر یہ اندازہ لگا لیتی ہوں کہ انہیں کامیابی ہوئی یا نہیں۔ ان کے عکس تاثیر مرحوم آمد کے وقت اپنی کشمیری شال اوڑھ کر بیٹھ جاتے، کبھی دبی زبان سے کراہتے، کبھی جھومنے لگتے اور پھر شعر ہو جاتا۔

ہمارا عموماً یہ خیال ہوتا ہے کہ شاعر اور فن کار اور دُنیا زمانے سے نرالے ہوتے ہیں، لیکن وہ دوسرے اس لیے مختلف ہوتے ہیں کہ اُن کا مشغلہ خالص ذہنی ہوتا ہے اور ان کی عرق ریزی اور جگر کاوی کا نتیجہ ہر کس و ناکس کے لیے نہیں ہوتا اور اس سے ہر شخص محظوظ نہیں ہو سکتا۔ لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ اس کی ذمہ داری دراصل ہمارے معاشرے پر ہے۔ جو ایسے حالات پیدا کرنے میں ناکام رہا ہے جن میں ہر شخص شاعری یا مصوّری سے لُطف اندوز ہو سکتا ہے لیکن فن کار یا شاعر کی ذات سے نہیں۔ فن کار کا مشغلہ چونکہ خالص ذہنی ہوتا ہے اس لیے وہ اس دنیا کی حدوں سے نکل جاتا ہے۔ اسے اپنے تن بدن کا ہوش نہیں رہتا۔ اپنے گھر بار اور روزمرّہ کی ضرورتوں کی پروا نہیں رہتی۔ اُسے ایسے رفقاء کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کے دنیاوی معاملات کی دیکھ بھال کر سکیں۔ یہ جنجال اگر آسانی اور خوش اسلوبی سے طے ہو جائیں تو شاعر، مصوّر یا مصنف اپنی دنیا میں کھو سکتا ہے اور اسے یہ اطمینان ہوتا ہے کہ کارِ دنیا تمام ہو چکے ہیں، غالباً یہی وجہ ہے کہ مصنّفوں کی ایک بہت بڑی تعداد اپنی تصانیف کو اپنے دوستوں اور ان لوگوں کے نام معنون کرتی ہے جو انہیں عزیز ہوتے ہیں کیونکہ وہ نہ ہوتے تو کی تصنیف بھی تشنۂ تکمیل رہ جاتی اور مجھے یقین ہے کہ فیض نے "دستِ صبا" کا مسودہ بھیجتے وقت مجھے جب یہ لکھا تھا کہ "یہ تمہاری ہے" تو ان ۔ ۔ بی ہی طلب تھا۔

فیض

اپنی بڑی بہن کی نظر میں

اختر جمال

فیض کی سب سے بڑی بہن بیگم شجاع الدین کی عمر اس وقت اسّی برس کے اوپر ہے۔ خاندان میں بی بی گل کہلاتی ہیں۔

اختر جمال نے ایبٹ آباد میں بی بی گل سے مِل کر فیض اور ان کے خاندان کی بابت گفتگو کی اور یہ مضمون تیار کیا۔

ایبٹ آباد میں داخل ہوتے ہی پہاڑوں کا ایک سلسلہ دائیں اور بائیں جانب سے گلے لگاتا نظر آتا ہے۔ دائیں طرف کا سلسلہ سربن کہلاتا ہے۔ اس کی ڈھلانوں پر کچے مکان ہیں جن میں سرِ شام دیے روشن ہو جاتے ہیں۔ اس وقت یہ پہاڑ اپنے دامن میں شرارے لئے مگجے اندھیرے میں نہایت خوب صورت معلوم ہوتا ہے۔ سردیوں میں جب برف پڑتی ہے تو معلوم ہوتا ہے پہاڑ اپنے قوی شانوں پر سفید چادر لپیٹے بڑے وقار سے کھڑا ہے۔ اور سورج کی پہلی کرن آسمان سے اتر کر سب سے پہلے اس کے قدم چومتی ہے اور ہر طرف صبح کا اودھیا اُجالا پھیل جاتا ہے۔ یہاں کے باسی اس کے گلے لگ کر اپنے دکھ درد بھول جاتے ہیں۔ یہ پہاڑ حوصلے اور استقامت کی علامت بنا ہوا ہے۔

سربن کے دامن میں ہمارے شاعر فیض احمد فیض کی بڑی بہن بی بی گل کا گھر ہے۔ کسی زمانے میں ان کے گھر کی کنڈی بجاتے ہی خونخوار شکاری کتوں کی بھوں بھوں سُنائی دیتی تھی۔ بڑی بڑی بطخیں اپنی لمبی لمبی چونچیں اٹھا کر قطار میں قیں قیں کرتی اس طرح آگے بڑھتی تھیں، گویا دروازہ کھلتے ہی حملہ کر دیں گی۔ ان دنوں یہ گھر اچھا خاصا چڑیا گھر لگتا تھا۔ بی بی گل کے چہرے پر عبادت اور ریاضت کا نور ہے، دل میں شفقت اور محبت کا بے پایاں جذبہ ہے جو ان کی بیٹیوں اور نواسیوں ہی کو نہیں گھر کے پلے ہوئے پرندوں، چرندوں کو بھی محسوس ہوتا ہوگا۔

میں نے بی بی گل کو پہلی بار اس دعوت میں دیکھا جو انہوں نے اپنی بیٹی سعادت کی (میجر سرور سے) شادی کے سلسلے میں دی تھی۔ سفید لباس میں جنت کی حور معلوم ہو رہی تھیں۔ شادی کے بعد سعادت اسکول آئیں اور ہم سب نے ان سے بی بی گل کی تعریف کی تو ہنس کر بولیں: "بھئی یہ بڑی زیادتی ہے دلہن میں تھی اور تعریف تم لوگ میری ماں کی کر رہے ہو!" پھر کہنے لگیں: "یہ سچ ہے میری ماں بہت خوب صورت ہیں۔ ذرا سوچو وہ جوانی میں کتنی حسین ہوں گی۔"

اسکول چھوڑا تو سعادت کا ساتھ بھی چھوٹ

گیا۔ کچھ عرصے بعد سعادت نے بھی اسکول چھوڑ دیا۔ لیکن جب میرا گجرات سے ایبٹ آباد کالج تبادلہ ہوا تو کالج کی دیوار اور سعادت کے گھر کی دیوار ایک تھی جب بھی اِدھر اُدھر ملاقات ہوتی بہت محبت سے گھر

● فیض احمد فیض ایک انٹرویو کے دوران

بلاتیں اور کہتیں فرصت کے اوقات میں آجایا کرو — گپ لگائیں گے۔ لیکن مصروفیت کی وجہ سے میں صرف دو تین بار ہی ان کے گھر جا سکی۔ اب کی بار جو گئی تو خیال تھا کہ بی بی گل مجھے بھول گئی ہوں گی، سعادت نے میرا تعارف کرانا چاہا تو بولیں: "ہمیں آپ بہت اچھی طرح یاد ہیں بلکہ کالج کے مینا بازار میں پان کی ایک دکان پر آپ نے ہمیں پان کھلایا اور کہا تھا فیض کے متعلق آپ کا کچھ لکھنے کا ارادہ ہے۔ ہمیں آپ کا بہت انتظار رہا مگر آپ اس کے بعد نہیں آئیں — ہم سمجھے بھول بھال گئی ہوں گی۔

"نہیں بھولی نہیں، دیکھئے آہی گئی۔"

باتیں کرنا ایک فن ہے۔ سعادت جیسی دل چسپ باتیں کرنا مشکل کام ہے۔ ہمارے اسٹاف روم کی رونق ان کے دم سے تھی۔ بیتے دنوں کی یادیں تازہ ہو گئیں: استاد، استانیاں، پادری نیچے وغیرہ۔ میں نے سعادت سے کہا اب تم مجھے بی بی گل سے فیض صاحب کی کہانی سننے دو۔ سعادت نے کہا "ہماری اماں بہت اچھی کہانیاں سناتی ہیں۔ بی بی گل نے مسکراتے ہوئے کہا "فیض کو بچپن میں کہانیاں سننے کا بہت شوق تھا۔" سعادت نے ہماری دعوت کے لئے خود جو پکایا تیار کیا تھا ہمیں کھلانے لگیں باتوں باتوں میں جوش صاحب کی دعوت کا قصہ سنایا کہ وہ جب ایبٹ آباد آئے تو میں نے اس خیال سے کہ آنکل فیض سے ان کے گہرے تعلقات ہیں۔ ان کو کھانے پر مدعو کیا۔ ان کے لئے سب کچھ خود پکایا۔ مگر جوش صاحب وعدے کے باوجود نہیں آئے۔

اس پہ مجھے یاد آیا گجرات کالج میں طالبات کے بہبودی فنڈ کے لئے ایک مشاعرے کا انتظام کیا کیا تھا۔ ہماری فارسی کی لیکچرار مسز سعیدہ عروج مظہر جو خود بھی شاعرہ ہیں اس کام میں پیش پیش تھیں۔ طالبات نے بڑی محنت کی تھی، کالج کو خوب سجایا اور پنڈال کو خوب آراستہ کیا۔ مشاعرے کے بعد فیض صاحب اور دوسرے شاعروں کی کھانے کی دعوت تھی۔ لڑکیوں کو انہیں دیکھنے سننے اور ان کے دستخط لینے کی بڑی آرزو تھی۔ سارا دن لڑکیاں فیض ہی کا کلام گا گا کر کھانا پکاتی رہیں اور دوسرے کام کرتی رہیں۔ مغرب کے وقت مسز عروج باورچی خانے میں آئیں اور مجھ سے بولیں "تم ناحق دھوئیں میں آنکھیں لال کر رہی ہو فیض صاحب نہیں آئیں گے۔"

"واہ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ آخر کیوں نہیں آئیں گے؟"

"انہیں تو گجرات کے ڈپٹی کمشنر اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔"

"آپ نے جانے کیوں دیا؟ روکا ہوتا اور بتایا ہوتا کہ لڑکیاں......"

"میں کیا کہتی، ڈپٹی کمشنر نے پورے اسٹاف کو مدعو کیا ہے تم بھی چلنا۔"

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی آپ نے فیض صاحب کو یہ تو بتایا نہیں لڑکیوں نے ان کی دعوت کا اہتمام کیا ہے وہ شاید یہ سمجھے ہوں گے کہ سب کا ڈپٹی کمشنر کے ہاں انتظام ہے۔"

مسز عروج کو طیش آگیا۔ بولیں: "تم نے تو آرام سے سگھڑ گھر ہستن بن کر باورچی خانہ سنبھال لیا۔ میں اتنے دنوں سے شاعروں کے پیچھے دھوپ میں ماری ماری پھر رہی ہوں۔ تم ایک شاعر کو بھی بلا لاؤ تو پتہ

فیض کی تعلیم

۱۹۱۵ء میں چار برس کی عمر سے حفظ قرآن سے تعلیم کا آغاز ہوا۔

۱۹۱۶ء میں مولوی ابراہیم میر سیالکوٹی کے مشہور مکتب میں داخل ہوئے اور اردو فارسی اور عربی کی تعلیم حاصل کی۔

۱۹۲۱ء میں سیالکوٹ کے اسکاچ مشن ہائی سکول کی چوتھی جماعت میں داخل ہوئے اور ابتدائی درجات امتیاز کے ساتھ پاس کئے۔

۱۹۲۷ء میں فرسٹ ڈویژن بھی میٹرک پاس کیا۔

۱۹۲۹ء میں مرے کالج آف سیالکوٹ سے فرسٹ ڈویژن میں انٹرمیڈیٹ پاس کیا اسی دوران میں علامہ اقبال کے استاد شمس العلماء مولوی سید میر حسن سے فارسی اور عربی میں دستگاہ بھی حاصل کی۔

۱۹۳۱ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے اور عربی میں ایم اے فرسٹ ڈویژن حاصل کی۔

چلنے کہ کتنا مشکل کام ہے۔ فیض کے ہاں چلچلاتی دھوپ میں گئی تو انہیں ترس آگیا اور حاضرین میں سے کسی نے کہا "بھئی پہلے انہیں اندر لے جاکر ان کا مونہہ ہاتھ دھلواؤ پھر بات کریں گے، بے چاری کا گرمی سے بُرا حال ہے۔ اگر میں ہمت نہ کرتی تو مشاعرہ ہی نہ ہوتا۔"

میں نے مسز عروج کو منانے کی کوشش کی اور لڑکیوں کو بھی سمجھا بجھا کر راضی کیا اور انہیں یقین دلایا کہ فیض صاحب وعدہ خلاف نہیں ہیں ضرور آئیں گے میں سب کے آٹوگراف البم اسٹیج پر پہنچا دوں گی اور مسز عروج ان پر فیض صاحب کے دستخط لے لیں گی۔ اس دعوے سے طالبات کی تسلی ہوئی اور لڑکیاں پھر اسی طرح فیض کا کلام گا گا کر کام کرنے لگیں۔

اس مشاعرے کے لئے فیض صاحب اپنی گاڑی میں آئے تھے اور سلیمہ اور شمیم عابد علی بھی ان کے ساتھ تھیں۔ سلیمہ ہم سب کو بہت پسند آئیں اور مجھے یہ محسوس ہوا کہ فیض صاحب کی شاعری کا سارا حسن ان کی بیٹی میں زندہ ہو کر سانس لے رہا ہے۔ یہ مشاعرہ بہت کامیاب رہا ــــ شہر والوں نے اسے گجرات کی تاریخ کا یادگار مشاعرہ قرار دیا۔

آپ کو یاد ہوگا جوش صاحب اور فیض کی دعوت اور مشاعرے کی باتوں سے پہلے بی بی گل کا تذکرہ ہو رہا تھا ــــ ہاں تو بی بی گل نے بتایا: "کسی زمانے میں ایک راجپوت راجہ ہوا کرتا تھا۔ اس کا نام راجہ سین پال تھا اور اس کا تعلق سہارن پور سے تھا ــــ اس کی اولاد میں سے ایک نے اسلام قبول کرلیا۔ ہمارے والد کا تعلق اسی شاخ سے ہے۔ ہمارے پردادا کا نام سربلند دادا کا صاحبزادہ خاں اور والد کا سلطان محمد خاں تھا۔"

(ہمارے والد کی شخصیت بہت شاندار تھی ــ صحت مند اور گورے چٹے تھے۔ ملکہ وکٹوریہ کی بھانجی ڈاکٹر (ڈاکٹر مس ہملٹن نے ایک ناول لکھا ہے) جس میں ہمارے ابا کا ذکر ہے۔ افغانستان میں ۱۴ سال ملازمت کی۔ امیر عبدالرحمٰن نے اپنی بھتیجی سے شادی کی جن کا

پہلا شعر

۱۹۲۸ء میں مرے کالج سیالکوٹ کی ادبی تنظیم "اخوان الصفا" کے پہلے طرحی مشاعرہ کے لئے فیض نے جو غزل کہی اس کا پہلا شعر یہ تھا:

لب بند ہیں ساقی مری آنکھوں کو پلا دے
وہ جام جو منت کشِ صہبا نہیں ہوتا

یہ شعر بے حد مقبول ہوا اور اسی مشاعرے سے فیض کی ادبی شہرت کا آغاز ہوا۔

نام سائرجان تھا اور وہ سردار محمد رفیع خاں صاحب کی بیٹی تھیں مگر شادی کے دو سال بعد ان کا انتقال ہوگیا اور کابل سے چار پانچ میل دور ایک جگہ بدھ خاک ہے جہاں انہیں دفن کیا گیا۔"

"سائرجان کے جہیز میں گھر کی ایک منتظمہ غلام اور لونڈیاں تک دی گئی تھیں۔ منتظمہ کو سب نانا جان کہتے تھے مگر اصلی نام سردار جان تھا۔ ان کا تعلق شاہ شجاع کے خاندان سے اس طرح تھا کہ انہوں نے شجاع کی بیٹی کو پالا تھا۔ ان کی بیٹی کا نام آغا کلاں تھا۔ سردار جان کی شاہی حرم میں پرورش ہوئی تھی۔ عربی، فارسی خوب جانتی تھیں بہت عابد، پرہیزگار اور نیک خاتون تھیں، آداب شاہی اچھی طرح جانتی تھیں۔ انہوں نے ساری عمر شادی نہیں کی۔ فیض کی پرورش میں نانا جان (سردار جان) کا بہت حصہ تھا۔ انہیں بہت سی کہانیاں یاد تھیں۔ بادشاہوں کی فیاضی، جلال، انصاف اور سزا کے قصے بڑی تفصیل سے سناتی تھیں اور فیض شوق سے سنا کرتے تھے۔"

افغان دربار کی سیاست سے سلطان محمد خان تنگ آکر بلکہ گھبرا کر ہندوستان آگئے۔ اور جہلم میں دریا کے کنارے ایک بنگلہ کرائے پر لیا جس کا نام "ساحل" تھا یہ بنگلہ اب ایک ریٹائرڈ سپرنٹنڈنٹ پولیس زیدی صاحب کے پاس ہے۔ ہمارے والد کو انگریزی حکومت نے سرگودھا اور منٹگمری میں زمینات دیں جہاں گھوڑوں کی افزائش نسل کے فارم تھے۔ کچھ مدت بعد وہ اپنے خاندان والوں کو افغانستان سے بلانا چاہتے تھے اور امیر کابل نے انہیں ان کے ساز و سامان، لونڈیوں، غلاموں اور چالیس باوردی سپاہیوں کے ساتھ روانہ کردیا۔ درۂ خیبر میں لنڈی کوتل تک یہ سپاہی ہمیں چھوڑ کر واپس کابل چلے گئے۔"

والد کے خاص ملازم کا نام لالہ بہرام تھا —— کچھ لونڈیوں کے نام بھی یاد ہیں۔ صنوبر، کلثوم، مروارید آپا بانو اور آپا سلیمہ۔ نانا جان کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ وہ بھی خاندان کی خواتین اور دوسرے لوگوں کے ساتھ آئیں۔ جہلم میں ابا کے ایک رشتہ دار تھے جو گھر کا انتظام کرتے تھے۔ ان کا نام ضیاءالدین تحصیل دار تھا۔ گھر کے اندر کے معاملات نانا جان کے ہاتھ میں تھے۔ ابا بیرسٹری کے کاموں میں لگے ہوتے۔ ہاں میں یہ بتانا بھول گئی تھی کہ ابا کابل سے آنے کے بعد لندن گئے، وہاں بیرسٹری کا امتحان پاس کیا اور پھر جہلم آکر وکالت کرنے لگے۔ اپنی رفیقۂ حیات کے انتقال کے بعد سے بہت پریشان رہتے تھے۔ جہلم میں جی نہ لگا تو پھر سیالکوٹ میں گئے، ہم لوگ بھی چلے گئے۔"

"خاندان والوں نے کہہ سن کر ابا کی دوسری شادی کرادی۔ ہماری دوسری والدہ کا تعلق ایک گاؤں جسڑ سے تھا جو نارووال تحصیل میں ہے۔ زمیندار

خاتمان کی تھیں اور والدہ کا نام عدالت خاں تھا۔ رنگت بہت صاف تھی، ذہین اور تیز تھیں۔ ان سے ایک بیٹے طفیل اور ان کے تین سال بعد فیض پیدا ہوئے۔ ہمارے چھوٹے بھائی کا نام عنایت ہے۔"

فیض جب پیدا ہوئے تو بہت سُرخ سفید اور موٹے تازے تھے۔ بچپن سے ہی بہت خاموش مزاج اور حلیم الطبع تھے، صاف ستھرے رہنے کا بہت شوق تھا۔ نانا جان انہیں کہانیاں سُنایا کرتی تھیں۔ ایسی کہانیاں جو بادشاہوں کے زمانے کی اور پشت در پشت سے چلی آ رہی ہیں۔ ان میں بعض تو عجیب بھی ہوتی تھیں۔ ایک قصہ بلکہ واقعہ جو فیض بچپن میں بہت اشتیاق سے سُنتے تھے دو ڈاکوؤں کی بابت تھا۔ دادو اور سادو اپنے زمانے کے بڑے ظالم ڈاکو تھے ــــ بڑی لُوٹ مار مچائی اور ظلم و ستم کئے تھے۔ امیر عبدالرحمٰن نے انہیں پکڑوا کر لوہے کے ایک پنجرے میں بند کرا دیا اور وہ پنجرہ عبرت کے لئے ایک اونچی ویران پہاڑی پر رکھوا دیا۔ دونوں بھوک پیاس اور وحشت سے مر گئے۔ ان کا گوشت پوست گل سڑ گیا اور ہڈیوں کا پنجرہ وہیں پڑا رہا۔"

"ہمارے ابا کے ایک چچا زاد بھائی تھے چودھری نبی بخش وکیل ہائی کورٹ وہ اپنے بھائی سے ملنے کابل آئے اور ابا کے ساتھ امیر عبدالرحمٰن کے دربار میں گئے۔ اتفاق سے اسی دن ایک آدمی کو اپنی صفائی کا موقع دیئے بغیر امیر نے موت کی سزا سنا دی ــــ اس ظالمانہ سزا کا فیصلہ سن کر چودھری صاحب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ــــ امیر نے ابا سے پوچھا "اس کی آنکھوں میں آنسو کیوں ہیں؟" ابا نے جواب دیا "آپ کے جلال کے باعث"۔ ابا نے دُور اندیشی سے کام لیکر ایسا جواب دیا۔ ورنہ بادشاہ کے حکم کے خلاف آنکھوں میں آنسو برداشت نہیں کئے جا سکتے تھے۔"

سلطان محمد خاں نے جب سیالکوٹ میں وکالت شروع کی جو خوب چمکی تو گھر میں عزیزوں اور مہمانوں کی تعداد بھی بڑھنے لگی۔ ایک من آٹے کی روٹیاں پکتی تھیں۔ چھ بھینسیں تھیں اور چار گھوڑوں کی ایک گاڑی، نوکروں کی ریل پیل اور روپوں کی بارش۔ ایسے ماحول میں فیض کی پرورش ہوئی اور بڑے ناز و نعم سے گھر میں مذہب کا بڑا زور تھا۔ نماز باقاعدگی سے پڑھی جاتی تھی۔ پورے روزے رکھے جاتے تھے۔ کلام پاک کی تلاوت ہر صبح باقاعدگی سے ہوتی تھی بی بی گل بتاتی ہیں: "فیض نے دو سپارے حفظ کئے مگر جب اس کی آنکھیں دُکھنے لگیں تو حفظ کرنا چھوڑ دیا۔ ہم سب بھائی بہنوں میں بہت پیار تھا، اور مل جل کر رہتے تھے۔"

بی بی گل ماضی کی یاد میں کھو گئیں۔ ایسا لگتا تھا کہ سیالکوٹ کے کنک منڈی والے مکان میں وہ اپنے حافظے کے سہارے چل اور گھوم پھر رہی ہیں۔ ان کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی ــــ اپنے شوہر شجاع الدین بیرسٹر کا ذکر کرتے ہوئے بتایا: "وہ پانچ سال ولایت میں رہے۔ انہیں سولہ سال کی عمر میں کنگس کمیشن ملا۔ انگریزی فوج میں میجر کے عہدے تک پہنچے۔ ایک انگریز بیوی بھی تھی"۔ بی بی گل کہتی ہیں "میں نے مڈل تک پڑھا تھا، گھر پر ایک استانی بھی آتی تھیں۔ ہمارے گھر کا ماحول بہت قدامت پسند تھا۔ پردے کی سخت پابندی تھی۔ میں نے ایک عمر تک

افغانوں کا سا لباس پہنا۔ جس میں سر کی ٹوپی بھی شامل تھی۔"

اپنی شادی کے بعد کے حالات سناتے ہوئے کہا "ہندوستان میں دھرم شالہ ایک بہت خوبصورت جگہ ہے جہاں ہم شادی کے بعد چلے گئے۔ فیض ان دنوں مرے کالج سیالکوٹ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ چھٹیاں ہوتیں تو ہمارے پاس آجاتے۔ ان کے بہنوئی انہیں چاہتے تھے اور ان کے آنے سے بہت خوش ہوتے تھے فیض کے ساتھ ان کے دو ایک دوست بھی آتے تھے جیسے خواجہ خورشید انور، خواجہ مسعود اور ایس ایم دین بیرہ۔ فیض کا زیادہ وقت سیر و تفریح اور گھومنے پھرنے میں صرف ہوتا تھا۔ جب یہ دوست اکٹھے ہوتے تو گراموفون ریکارڈ بجائے جاتے۔ تو ــــــ خورشید انور کو جو ریکارڈ ناپسند ہوتا وہ اسے توڑ ڈالتے۔ بچے گانے سب ہی کو پسند تھے اور وہی سنا کرتے تھے۔ جیسے جمنا کے تیر۔ لاگی کرہجوا میں چوٹ، یا بسنت راگ جب ہنسانے کو جی چاہتا تو سب لڑکے مل کر ایک گانا گاتے "میری بھینس کو ڈنڈا کیوں مارا ــــ"

فیض اپنے بھانجے اور بھانجی کو بہت پیار کرتے تھے۔ انہیں میز پر مکا مار مار کر کہنا سکھایا تھا:

"ٹوڈی بچہ ہائے ہائے

مال ولایتی بائیکاٹ"

"سالے بہنوئی دونوں انگریزوں کو پسند نہیں کرتے تھے مگر ہمارے یہاں کا انگریزوں سے میل جول تھا۔ ان کے ساتھ ٹینس برج وغیرہ کھیلتے تھے۔ البتہ انہیں ترکوں سے بہت ہمدردی تھی۔ ہمارے دھرم شالہ کے گھر میں مصطفےٰ کمال پاشا، مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کی تصویریں ٹنگی تھیں۔"

اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے بی بی گل نے کہا:

"ہمارے والد بھی انگریزوں سے متاثر تھے مگر اولاد پر الٹا اثر پڑا۔ فیض اپنے والد کے کہنے پر آئی سی ایس کے امتحان کی تیاری کرنے لگے۔ امتحان سے پہلے انہیں ہیضہ ہوگیا، اس لئے امتحان نہ دے سکے۔ پھر خیالات میں تبدیلی واقع ہوئی اور انگریزوں کے اتنے خلاف ہوگئے کہ آئی سی ایس کا امتحان ہی نہ دیا۔ خورشید انور آئی سی ایس میں اوّل آئے مگر بم بنانے کی وجہ سے انہیں ملازمت نہیں ملی بلکہ سزا ہوئی۔ فیض کے باقی دوست سرکاری ملازمت میں شامل ہے۔"

بی بی گل نے اپنی بیٹی سعادت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "یہ فیض کو بہت تنگ کرتی تھی کہ کوئی کہانی سناؤ۔ جان چھڑانے کے لئے وہ اسے آدمی کا ایک قصہ سناتے تھے۔ اس طرح شروع کرتے ایک آدمی تھا۔ تم سمجھ گئیں نا ایک آدمی۔ وہی آدمی جو بالکل آدمی کی طرح ہوتا ہے آدمی..... ... تو پھر آدمی ہی ہوتا نا۔" بی بی گل بتاتی ہیں "فیض نے ہمیشہ اس آدمی کا اتنا ہی قصہ سنایا اور کبھی پورا نہ کیا۔ ادھورا ہی رہا۔ آدمی کی کہانی آدمی سے آگے نہ بڑھتی تھی۔"

بی بی گل ننھی سی مشعل تھامے دھیرے دھیرے چلتی ہوئی ان جگہوں پر گئیں جہاں وقت نے بہت سی چیزوں کو مٹا دیا ہے اور جب کوئی نقش اجالا لائے تو پھر یکایک یادوں کا کوندا سا لپک آتا ہے، اور بہت سے دوسرے نقش چمکنے لگتے ہیں۔"

"میں دھرم شالہ میں تھی۔ فیض کی چھوٹی بہن کی

شادی تھی۔ اباجی کا خط آیا، لکھا تھا: "مجھے زندہ دیکھنا ہے تو بہن کی شادی پر آؤ، ورنہ زندہ نہ دیکھ سکو گی۔" میں سیالکوٹ پہنچ گئی۔ انہوں نے شادی کا مکمل انتظام کرایا۔ دُور دراز سے آئے ہوئے مہمانوں کے قیام و طعام کا اہتمام کیا۔ گھر کی رونق اور چہل پہل سے بہت خوش تھے۔ اچانک ان کی طبیعت خراب ہوگئی اور ڈاکٹر کے آتے آتے ختم ہوگئے۔ شادی کا گھر ماتم کدہ بن گیا۔"

والد کے انتقال کے بعد پے در پے مشکلات پیش آئیں۔ زمینوں کی نگرانی کرنے والا کوئی نہ تھا۔ چالیس ملازموں کی پلٹن کو آہستہ آہستہ رخصت کیا۔ صرف مہر دین رہ گیا جس نے جانے سے انکار کر دیا۔ گاؤں کی ایک عورت تھی جسے سب پھوپی پھوپی کہتے تھے وہ بھی رہ گئی۔ دونوں نے کہا ہم تنخواہ کے بغیر کام کریں گے یہ گھر کا انتظام کرتی تھی اور مہر دین باہر کا کام۔ فیض نے ان حالات میں بڑی سمجھداری سے کام لیا۔"

کسی بات پر کھانے کا ذکر چھڑا تو بی بی گل نے بتایا "فیض کو افغانی کھانے بہت پسند تھے۔ شب دیگ، قورمہ پلاؤ، حبشی پلاؤ، مگر خود کبھی فرمائش نہیں کی جو مل گیا کھا لیا۔ بلکہ اس کے مزاج کا یہ حال تھا جن دنوں حکم تھا کہ لڑکے اگر کھانے کے وقت پر یعنی رات نو بجے تک گھر نہ آئیں تو کھانا نہ دو تو محمد طفیل مجھے یا کسی اور کو جگا کر کھانا کھا لیتے اور گرم کرا کے کھاتے۔ چھوٹے بھائی عنایت خود باورچی خانے جا کر ڈھونڈ ڈھانڈ کر پیٹ بھر لیتے مگر فیض آتے تو نہ کسی کو جگاتے اور نہ کھانا تلاش کرتے بلکہ چُپ چاپ بھوکے سو جاتے۔ مجھے اس کے مزاج پر رحم آتا اور میں پوچھتی فیض کھانا کھاؤ گے؟ جواب دیتے ہاں مل گیا تو کھا لیں گے۔"

بی بی گل کہتی ہیں "فیض کو اپنے سب بھائی بہنوں میں مجھ سے بہت محبت تھی اور اپنے بہنوئی سے بھی۔ ان کا انتقال ہوا تو کئی دن تک بالکل خاموش اور گم صم رہے اور کھانا بھی نہیں کھایا۔ اپنی بھانجی کو اسکول میں داخل کرایا اور مجھے سمجھایا بچوں کو اچھی تعلیم دلوانی چاہیئے۔ ہمیشہ ہر طرح کی مدد کی اور ہر ضرورت کے وقت نیک رائے دی اور نصیحت کی۔

شادی کے متعلق میرے ایک سوال کے جواب میں بی بی گل نے بتایا: "فیض کے لیے بہت رشتے تھے مگر جہاں والدہ اور بہنیں چاہتی تھیں فیض نے شادی نہیں کی۔ ایلس کا انتخاب کیا۔ والدہ نے مشرقی روایات کے مطابق انہیں دلہن بنایا۔ چینی بروکیڈ کا غرارہ تھا اور گوٹے کناری والا دوپٹہ۔ جوڑا سُرخ تھا جیسا کہ شادیوں میں پہنایا جاتا ہے۔ ایلس نے کہا تھا میں سب کچھ مانوں گی برقع نہیں پہنوں گی۔"

ایلس کے متعلق کہا: "ان کی بہت سادہ طبیعت ہے۔ بہت خلیق اور محبت کرنے والی ثابت ہوئیں۔ انہوں نے سسرال میں قدم رکھتے ہی سب کا دل جیت لیا اور خاندان میں اس طرح گھل مل گئیں جیسے اسی گھر کی لڑکی ہوں وہی لباس اختیار کیا۔" یہاں سعادت نے کہا "ہم سب کی چہیتی ممانی ہیں۔ ساس بہو کے تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے بی بی گل نے کہا "ساس نے بہو کو محبت دی اور بہو نے ساس کی عزت کی۔"

"ایلس نے ثابت کر دیا کہ وفا ایثار اور محبت تنہا مشرق کی روایات نہیں ہیں، یہ تو عورت کی سیرت کا حصّہ ہیں۔"

■■

فیض اپنی شریکِ حیات
ایلس کے ساتھ

نگار زریں شاہد

فیض اپنے اہل خانہ کی نظر میں

بر سرِ چارہ گر کو نوید ہو صفِ دشمناں کو خبر کرو
وہ جو قرض رکھتے تھے جان پر وہ حساب میں نے چکا دیا

شاعر ادیب فلاسفر دانشور فیض احمد فیض انتقال کر گئے ان کے مداح ان کے پرستار ان کے نظریات کے حامی و مخالف سب ان کا آخری دیدار کرنے ان کی تعزیت کے لئے ان کے گھر اکٹھے ہو گئے۔ لوگوں کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے مگر ہونٹوں پر چپ کے تالے تھے۔ یہی حال گھر والوں کا تھا ان کے دل رو رہے تھے شدتِ غم کو ضبط کرنے سے آنکھیں اور چہرہ سرخ ہو رہا تھا مگر کمال حوصلے سے تسلی دینے کی کوشش پر وہ لوگوں کو ان کے فیض صاحب کے انتقال کی خبر بنا رہی تھیں انہیں ایک لمحہ بھی میسر نہیں تھا کہ وہ اپنے باپ کے بچھڑنے کا غم بھی کر سکیں ہم نے اس سلسلے میں فیض صاحب کے عزیزوں سے ان کے بارے میں تاثرات معلوم کئے۔

بیگم ایلس فیض :۔ فیض سے میری ملاقات آج سے ۴۵ سال پہلے ہوئی اس وقت وہ ہینڈسم نوجوان اور اسمارٹ تھے مجھے پہلی نظر میں ہی وہ بہت اچھے لگے لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ ان کی کون سی بات مجھے اچھی لگی تو میں کہتی ہوں ان کی ہر ادا مجھے دل سے پسند تھی آنکھوں سے لے کر دل تک خوب صورت تھا بحیثیت شاعر وہ بہت لاجواب تھے۔ بہت مشفق بہت پیار کرنے والے تحمل مزاج ان کو کبھی غصہ نہیں آتا تھا۔ آپ کو حیرت ہو گی کہ انہوں نے بے بے جی یعنی اپنی والدہ کے سامنے کبھی سگریٹ نہیں پیا تھا۔ بلکہ ایک مرتبہ بے بے جی نے کہا بھی۔

"تسی سگریٹ پی لو پیندے ای رہندے او"

مگر انہوں نے پھر بھی کبھی اپنی والدہ کے سامنے سگریٹ نہیں پیا۔ ان کی والدہ جب ان کے کمرے میں آتیں تو وہ اٹھ کر کھڑے ہو جاتے۔ میں نے یہ تمام آداب رکھ رکھاؤ اور روائتی طور طریقے بے بے جی اور فیض سے سیکھے وہ بہت ہی محبت اور ادب کرنے والے تھے وہ اچھے بیٹے مخلص اور محبت کرنے والے شوہر اور شفیق باپ تھے بے بے جی کو ان سے بہت پیار تھا اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ باپ کے انتقال کے بعد فیض صاحب نے کافی مشکل وقت دیکھا باپ کی زندگی میں بہت اچھے دن دیکھے بے بے جی بتاتی تھیں کہ ہمارے پاس چار چار کاریں ہوتی تھیں لیکن پھر ایسا وقت آیا کہ وہ سیالکوٹ سے گاؤں پیدل جایا کرتی تھیں فیض سے میرے خیالات بہت ملتے تھے۔ مجھے بھی سولہ سال کی عمر سے ہی سیاست سے شغف رہا اور فیض صاحب بھی کامریڈ تھے یوں ہمارے خیالات بھی ملتے تھے۔ یہی پسندیدگی اور خیالات کی ہم آہنگی ہماری شادی کا باعث بنی آج فیض میرا ساتھی میرا دوست میرا ہمدم مجھ سے بچھڑ گیا مرنے سے پہلے جو آخری بات انہوں نے کی وہ یہ تھی کہ منیزہ کا بیٹا علی ان کے پاس آیا تو اسے دیکھ کر مجھ سے کہا علی بڑا ہی خوب صورت بچہ ہے اسے کہیں نظر نہ لگ جائے۔

منیزہ ہاشمی آپ بتائیں ابا کی کتنی باتیں کریں۔ میں نے تمام زندگی یہی دیکھا کہ ان کا طرزِ عمل ہمیشہ مثبت رہا منفی طرزِ عمل انہوں نے کبھی اختیار نہیں کیا۔ اگر کبھی کسی نے انہیں برا بھی کہہ دیا تو خاموش رہتے تھے۔ حالانکہ میں ان کے بالکل برعکس ہوں۔ وہ خاموش تھے میں بہت بولتی ہوں وہ صابر تھے میری طبیعت میں تیزی ہے میں ان سے ہمیشہ کہتی تھی کہ اگر کوئی غلط بات کرتا ہے تو اس کی تردید کریں مگر وہ ہمیشہ چپ رہتے یوں معلوم

ہوتا تھا کہ ان کو اپنا راستہ صاف نظر آرہا ہے اور منزل سامنے نظر آرہی ہے۔ اور وہ خاموشی سے اس پر گامزن ہیں میں نے ان سے جو ایک چیز سیکھی وہ ہے اپنے ارادے پر کاربند رہنا اور خاموش جدوجہد۔ وہ کبھی کچھ تھوپتے نہیں کرتے تھے۔ میری زندگی کے تمام اہم فیصلے انہوں نے کئے تعلیم کیریئر ملازمت، شادی، بچوں کے لئے تعلیمی شعبے کا انتخاب سب انہوں نے کئے میرے بچے پیدا ہوئے تو ان کے کان میں اذان بھی ابا نے دی میرے بچوں کی روزہ کشائی بھی انہوں نے کی۔ میں سوچتی ہوں اب میری زندگی کے فیصلے کون کرے گا۔ ہم تو چھوٹی چھوٹی باتوں کے لئے بھی ان کے مشورے کے محتاج ہوتے تھے۔

مجھے ابا کی ایک بات یاد ہے کہ ایک مرتبہ میرے بیٹے نے مجھ سے پوچھا کہ شہرت کا کیا جملہ بناؤں تو میں نے کہا کہ یہ لکھ دو کہ میرے نانا کی بہت شہرت ہے تو اس نے کہا تو جھوٹ لکھ دوں۔ میں نے اس سے کہا کہ واقعی تمہارے نانا کی بہت شہرت ہے۔ مگر جب میں چھوٹی تھی تو میں بھی یہی سمجھتی تھی۔ ایک دفعہ ابا انڈیا گئے تو انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ تمہارے لئے وہاں سے کیا لاؤں۔ ان دنوں دلیپ کمار کا بہت دور دورہ تھا۔ میں نے کہا کہ آپ میرے لئے دلیپ کمار سے آٹو گراف لے آئیں۔

جب ابا واپس آئے تو آٹو گراف کے ضمن میں وہ بالکل چپ رہے جب میں نے پوچھا کہ ابا آپ دلیپ کمار کی آٹو گراف لائے تو کہنے لگے نہیں میں نے کہا کیا آپ کو دلیپ کمار نہیں ملا تو بولے ملا تھا میں نے کہا تو آپ نے آٹو گراف کیوں نہیں لی تو کچھ کھسیانے سے ہو کر بولے بیٹا دراصل بات یہ ہے کہ وہ تو مجھ سے آٹو گراف مانگ رہا تھا۔ تو میں نے حیران ہو کر کہا" ابا کیا دلیپ کمار آپ کو جانتا تھا — تو اس وقت میں بھی نہیں جانتی تھی کہ میرے ابا اتنے مشہور ہیں۔

میر اصدق ہاشمی :۔ جب دو سال پہلے نانا بیمار ہوئے اور ہسپتال گئے تو میں نے انہیں بہت سے شعر لکھ کر بھیجے۔ پھر جب وہ ہسپتال سے واپس گھر آگئے تو انہوں نے مجھ سے کہا تم تو اتنی اچھی شاعری کرتی ہو کہ اب مجھے شاعری چھوڑ دینا چاہئے۔ میرے نانا بہت ہی پیارے تھے۔

عدیل عمر ہاشمی :۔ مجھے نانا بہت عزیز تھے۔ وہ بچوں سے بے حد پیار کرتے تھے۔ میں ان کے ساتھ روزانہ شطرنج کی بازی کھیلتا کبھی وہ جیت جاتے اور کبھی میں۔ ان کو شطرنج بہت پسند تھی۔

سلیمہ ہاشمی :۔ باپ سے زیادہ وہ میرے دوست تھے۔ انہوں نے کبھی بھی عام روایتی باپ کی طرح ہمارے ساتھ سلوک نہیں کیا۔ ایک چیز جو انہوں نے ہمیں خاص طور پر سکھائی کہ سوچ ہمیشہ منطقی ہونا چاہئے جو فیصلے کرو منطق کے تحت کرو ایک مشفق باپ ہونے کے علاوہ وہ میرے دوست اور رہبر بھی تھے ہماری زندگی میں ایک خلا پیدا ہو گیا ہے ان کی کون کون سی بات یاد کی جائے۔ میں نے ایک دفعہ انہیں بیروت میں دیکھا وہاں ان کی حالت دیکھ کر میں نے محسوس کیا کہ وطن کی جدائی انہیں کھا گئی ہے۔ وہ ہر شام برآمدے میں بیٹھ جاتے اور اپنے پاس ٹیپ ریکارڈر رکھ کر روشن آرا، فریدہ خانم اقبال بانو اور بیگم اختر کی گائی ہوئی اپنی یا غالب کی غزلیں سنتے یا پھر بڑے غلام علی خاں کی ٹیپ سنتے اور سمندر کی طرف دیکھتے رہتے۔

نام فیض احمد خاں ۔ مشہور ہوئے ، فیض احمد فیضؔ کے نام سے

تاریخ ولادت : ۱۳ فروری ۱۹۱۱ء یا ۱۹۱۲ء
جائے ولادت : قصبہ قادر، ضلع سیال کوٹ

فیض احمد فیض سوانحی خاکہ

شمیم جہاں

تاریخ پیدائش اسکول کے کاغذات میں ۷ جنوری ۱۹۱۱ء بعد
میں ۷ جنوری ۱۹۱۲ء درج ہے۔ میں نے حال ہی میں ایک دوست سے
درخواست کی تھی کہ وہ سیالکوٹ کے دفتر بلدیہ سے پیدائش کے اندراجات کا
ریکارڈ دیکھ کر صحیح تاریخ معلوم کرنے کی کوشش کریں۔ ان کی تحقیق
کے مطابق بلدیہ کے کاغذات میں ۱۳ فروری ۱۹۱۱ء تاریخ پیدائش درج ہے

۶۵/۴/۲۱ء
فیض احمد فیض

ابتدائی تعلیم: ۱۹۱۵ء میں چار برس کی عمر میں قرآن پاک حفظ کرنا شروع کیا، ۱۹۱۶ء میں میر سیال کوٹی کے مکتب میں بٹھا دیا گیا جہاں انہوں نے عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔

۱۹۲۱ء میں لاہور کے ایک مشن ہائی اسکول میں داخل ہوئے۔ ۱۹۲۷ء میں فرسٹ ڈویژن سے میٹرک پاس کیا۔ ۱۹۲۹ء میں مرے کالج آف سیال کوٹ سے فرسٹ ڈویژن میں انٹرمیڈیٹ کیا۔ ۱۹۳۱ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے اور پھر عربی میں بی اے آنرز کیا۔ اس کے بعد ۱۹۳۳ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے انگریزی میں ایم۔ اے اور ۱۹۳۴ء میں اورنٹیل کالج لاہور سے عربی میں ایم اے میں فرسٹ ڈویژن حاصل کی۔

عملی زندگی کا آغاز: ۱۹۳۴ء میں تعلیم سے فارغ ہو کر ملازمت کا سلسلہ شروع ہوا۔ ۱۹۳۵ء میں امرتسر کے ایم۔ اے۔ او کالج میں فیض احمد فیض کا تقرر بحیثیت لیکچرار ہوا اس کے بعد ۱۹۴۰ء میں لاہور کے ہیلی کالج میں انگریزی کے استاد مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۲ء میں درس و تدریس کے پیشے کو خیرباد کہا اور فوجی خدمات انجام دینے لگے فوج میں کیپٹن کے عہدے پر ان کا تقرر ہوا اور لاہور سے دہلی آ گئے۔ ان کا تعلق فوج کے شعبۂ تعلقات عامہ سے تھا۔ ۱۹۴۳ء میں میجر اور ۱۹۴۴ء میں کرنل کے عہدے پر فائز ہوئے۔ یکم جنوری ۱۹۴۷ء میں فوج سے استعفیٰ دے کر لاہور چلے گئے۔ ۱۹۵۹ء میں پاکستان آرٹس کونسل کے سیکریٹری مقرر کیے گئے۔ یہاں انہوں نے ۲۲ جون تک خدمات انجام دیں۔ اس کے بعد فیض صاحب لندن چلے گئے ۱۹۶۲ء میں وہاں سے کراچی واپس آئے اور عبداللہ ہارون کالج کے پرنسپل و نگراں مقرر ہوئے۔

شادی: فیض احمد فیض نے ۱۹۴۱ء میں ایک انگریزی خاتون مس ایلیس جارج سے باقاعدہ اسلامی طریقے سے شادی کی۔ شیخ عبداللہ (شیرِ کشمیر) نے ان کا نکاح پڑھایا۔ ایلس جارج ادبی دنیا میں ایلس فیض کے نام سے جانی جاتی ہیں لیکن فیض کی والدہ نے اپنی بہو کا نام کلثوم رکھا تھا۔

بچے: فیض کی اولاد میں دو لڑکیاں ہیں۔ پہلی بیٹی سلیمہ ۱۹۴۲ء میں اور چھوٹی بیٹی منیزہ ۱۹۴۵ء میں پیدا ہوئی۔

والدہ کا نام: سلطان فاطمہ

والد کا نام: چودھری سلطان محمد خان۔ فیض احمد فیض کے والد سیال کوٹ کے مشہور بیرسٹر تھے۔ علم و ادب سے بچپن سے لگاؤ تھا۔ علامہ اقبال، سر عبدالقادر کا کو

ضیاء الدین، علامہ سید سلیمان ندوی
اور دیگر ادبی شخصیتوں کی صحبت نے
ان کے ادبی ذوق کو نکھارا تھا۔ وہ
علی گڑھ یونیورسٹی کورٹ کے ممبر، انجمن اسلامیہ
سیالکوٹ کے صدر اور انجمن
حمایت الاسلام کی انتظامیہ کے سرکردہ
رکن تھے۔ ان کی مشہور تصانیف ہیں
افغانستان کے دستوری قوانین اور
امیر عبدالرحمن کی سوانح عمری، جو انگریزی
میں ہے۔

بھائی بہن: فیض کی پانچ بہنیں اور چار بھائی تھے
دو بھائی اور تین بہنوں کا انتقال فیض
کی زندگی ہی میں ہو گیا تھا۔

فیض کا زمانۂ قید: فیض احمد فیض، قیام پاکستان کے
تقریباً تین سال بعد ہی ۱۹۵۱ء میں
لیاقت علی خاں حکومت کا تختہ پلٹنے کی
سازش میں گرفتار کر لئے گئے تھے، ساتھ
ہی دوسرے فوجی افسر اور ترقی پسند
تحریک کی اہم شخصیت سجاد ظہیر بھی گرفتار
ہو گئے۔ یہ کیس راولپنڈی سازش مقدمہ
کے نام سے مشہور ہوا۔ فیض نے چار سال
ایک ماہ گیارہ دن قید کی صعوبتیں اٹھائیں۔
تقریباً تین مہینے انہیں قید تنہائی کی سزا
ہوئی اور اس عرصے میں وہ باہری دنیا
سے بالکل کٹ کر رہ گئے۔ تین ماہ انہیں
سرگودھا اور لائل پور کی جیلوں میں گزارنے
پڑے۔ یہاں انہیں اپنے دوست احباب
بیوی بچوں سے ملنے کی اجازت نہیں تھی
حتیٰ کہ وہ اپنا قلم بھی استعمال نہیں کر سکتے
تھے۔ فیض کی بیشتر نظمیں ان کے زمانۂ قید
کی یادگار ہیں۔ "زنداں نامہ" کی بہت سی
نظمیں انہوں نے منٹگمری سنٹرل جیل اور
لاہور سنٹرل جیل میں قیام کے دوران لکھیں
مارچ ۱۹۵۳ء سے مارچ ۱۹۵۵ء تک
کی لکھی ہوئی نظمیں اس مجموعے میں شامل
ہیں۔ ان کے یہ اشعار جن میں تلخئ حیات
اور تلخئ کلام کا احساس ہوتا ہے، اسی
زمانے کی یادگار ہیں ے

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

سازش کیس کے سلسلے میں قید سے فیض
۲۰ اپریل ۱۹۵۵ء کو رہا ہوئے۔ دوسری
بار ۱۹۵۸ء میں سیفٹی ایکٹ کے تحت
گرفتار ہوئے اور اپریل ۱۹۵۹ء میں
رہائی ملی۔

فیض صحافت کے میدان میں: فیض کی شخصیت صحافت کے میدان میں
خوب نکھری اور عروج پر پہنچی ۱۹۳۸-۳۹ء
تک انہوں نے ماہ نامہ "ادب لطیف"
کی ادارت کے فرائض انجام دئے، ۱۹۴۷-۵۵ء تک
اخبار و رسائل میں مدیر اعلیٰ کی حیثیت سے خدمات
سر انجام دیں۔ ان میں چند قابل ذکر ہیں۔
روزنامہ پاکستان ٹائمز

روز نامہ امروز

ہفت روزہ لیل و نہار

اِس کے علاوہ فیضؔ صاحب بیروت میں افرو ایشیائی رائٹرز فیڈریشن کے جریدہ "لوٹس" کے کافی عرصہ تک مدیرِ اعلیٰ رہے۔

اعزازات: فیضؔ کو فوجی ملازمت کے دوران ۱۹۴۶ء میں ایم۔ بی۔ ای کا خطاب ملا۔ ۱۹۶۲ء میں فیض احمد فیضؔ کو لینن انعام سے سرفراز کیا گیا۔ فیضؔ پہلے ایشیائی شاعر تھے جنہیں یہ عزّت بخشی گئی اور جس سے نہ صرف فیضؔ کو بین الاقوامی عزّت اور شہرت حاصل ہوئی بلکہ پاکستان، ایشیا اور اردو زبان کا وقار بھی بلند ہوا۔ اِس کے علاوہ نوبل انعام کے لئے بھی ان کا نام دیئے جانے کی تجویز تھی۔

سیر و سیاحت: فیضؔ نے ایشیا اور یورپ کے بہت سے ممالک کے دورے کئے۔ ۱۹۴۸ء۔۱۹۴۹ء تک سان فرانسسکو اور جینوا میں رہے۔ جولائی ۱۹۶۲ء سے جنوری ۱۹۶۴ء کے دوران، انگلستان، روس، الجیریا، مصر، لبنان اور ہنگری کے بھی سفر کئے۔

۱۹۵۸ء میں ایشیا اور افریقہ کے ادیبوں کی پہلی کانفرنس، تاشقند میں ہوئی جس میں فیضؔ صاحب نے ترقی پسند تحریک کے لیڈر کی حیثیت سے شرکت کی۔

مطالعہ: فیضؔ علم دوست انسان تھے۔ مطالعہ کا شوق ورثے میں ملا تھا۔ زمانۂ طالب علمی سے لے کر آخر وقت تک یہ شوق برقرار رہا، ادب، سائنس، فلسفہ، نفسیات، سیاسیات، تاریخ اور مذہب، غرض، ہر موضوع پر اُن کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ جن اہم شخصیتوں کو انہوں نے پڑھا، استفادہ کیا اور متاثر ہوئے ان میں چند یہ ہیں۔

سرسیّد، حالی، گوئٹے، دانتے، ملٹن، ٹالسٹائی، برنارڈ شا، سقراط، افلاطون، ارسطو، ہیگل، مارکس اور نطشے۔

فیض بحیثیت ڈرامانگار: فیضؔ نے ۳۸-۱۹۳۹ء میں ریڈیو کے لئے ڈرامے لکھے جو لاہور ریڈیو سے نشر ہوئے اور پسند کئے گئے۔ اِن کے کامیاب ڈرامے ہیں۔ "پرائیویٹ سیکریٹری"، "سانپ کی چھتری"، "تماشا میرے آگے"، "پرائیویٹ سیکریٹری"، ادبِ لطیف ماہ نامے میں شائع ہو چکا ہے۔

فیض کی فلموں سے وابستگی: فیضؔ کا تعلق فلموں سے بھی رہا ہے۔ انہوں نے دو فلموں کے لئے گانے اور مکالمے لکھے۔ ایک فلم ہے "جاگو ہوا سویرا" جو ۱۹۵۹ء میں نمائش کے لئے پیش ہوئی۔ اِس فلم کو بین الاقوامی اعزاز بھی مل چکا ہے، دوسری فلم ہے "دور ہے سکھ کا گاؤں" یہ فلم ابھی زیرِ تکمیل ہے۔

سماجی خدمات: تعلیم ختم کرنے کے بعد جب فیضؔ صاحب

ملازمت کے سلسلے میں امرتسر آئے تو
اُن کی ملاقات پطرس بخاری، رشید جہاں
ہاجرہ بیگم، ڈاکٹر محمود الظفر اور دوسرے
کمیونسٹ رہنماؤں سے ہوئی۔ اُسی وقت
سے وہ سوشلزم کی طرف مائل ہوگئے
فیض نے اُن لوگوں کے ساتھ مل کر،
ریلوے، ڈاک و تار کے مزدوروں کو
منظم کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔
قیامِ پاکستان کے بعد فیض ٹریڈ یونین
کے ساتھ وابستہ ہوئے اور ایک
عرصے تک ٹریڈ یونین کے صدر رہے۔
سجاد ظہیر کے ساتھ انجمن ترقی پسند مصنفین
کے قیام میں حصہ لیا۔ فیض نے جینوا
اور سان فرانسسکو میں منعقدہ آئی۔
ایل۔ او کے اجلاس میں شرکت کی۔
یہ فیض کا جذبۂ خدمت ہی تھا جس نے
انہیں اپنے ملکی مسائل کے علاوہ فلسطینی
مہاجرین اور افریقی عوام کی آزادی کی
تحریک میں حصہ لینے پر مجبور کیا۔

فیض کی تخلیقات : شعری مجموعے

۱۔ نقشِ فریادی ۱۹۴۱ء میں پہلا مجموعۂ
کلام۔
۲۔ دستِ صبا ۱۹۵۲ء
۳۔ زنداں نامہ ۱۹۵۶ء
۴۔ دستِ تہِ سنگ ۱۹۶۵ء
۵۔ سرِ وادیِ سینا ۱۹۷۱ء
۶۔ شامِ شہرِ یاراں ۱۹۷۸ء
۷۔ میرے دل میرے مسافر ۱۹۸۱ء
۸۔ کلامِ فیض ۱۹۸۲ء

نثری مجموعے

۱۔ میزان (تنقیدی مضامین)
فروری ۱۹۶۲ء
۲۔ صلیبیں میرے دریچے میں
(خطوط) ۱۹۷۱ء
۳۔ متاعِ لوح و قلم ۱۹۷۳ء
۴۔ ہماری قومی ثقافت ۱۹۷۶ء
۵۔ مہ و سالِ آشنائی ۱۹۸۰ء
۶۔ سفرنامہ کیوبا ۱۹۷۴ء

دستِ تہِ سنگ کے علاوہ فیض کے مجموعوں
کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

کلیّات : نسخہ ہائے وفا (پاکستانی ایڈیشن)
سارے سخن ہمارے (برطانوی ایڈیشن)

زیرِ ترتیب : ۱۔ اردو شاعری کا انتخاب
۲۔ پاکستانی کلچر
(اردو اور انگریزی میں)
۳۔ اقبال کی شاعری

وفات : فیض احمد فیض دمہ کے مرض میں مبتلا
تھے جس نے اُن کو کافی کمزور کر دیا تھا۔
۱۸ نومبر کی رات کو ہاسپٹل میں داخل کیا
کیا گیا۔ اُن کو بچانے کی پوری کوشش کی
گئی۔ لیکن افسوس ۲۰ نومبر ۱۹۸۴ء بروز
منگل، دن میں ایک بج کر پندرہ منٹ
پر میو ہاسپٹل کے ایسٹ میڈیکل وارڈ
میں فیض احمد فیض کی شمعِ حیات گُل ہوگئی

سیما سوری
تازہ ترین
کا چوتھا ہنگامہ خیز ناول
دیکھتے دیکھتے
کیا ایک ٹی وی اداکارہ کو محبت کا حق نہیں؟
قیمت: بارہ روپے پچاس پیسے (ڈاک خرچ علاوہ)
تیسری انگلی
بے پناہ دولت، بے پناہ حسن
اور بے رحم دلوں کی داستان
قیمت: بارہ روپے پچاس پیسے
ٹیڑھی لکیریں
اونچی دکان
سیما سوری کے قلم سے
ایک باأصول لڑکی کی
داستان

فیض سیمینار لندن

پروفیسر گوپی چند نارنگ

۹۔ اور ۱۰۔ جولائی کو لندن یونی ورسٹی کے اسکول آف ایجوکیشن میں فیض سمپوزیم تھا۔ اس میں شرکت کرنے کے لئے لندن پہنچا تو اسی شام میں اور افتخار عارف فیض صاحب سے ملنے کے لئے زہرہ نگاہ اور ماجد بھائی کے یہاں پہنچے۔ ڈاکٹروں کی ہدایت کے مطابق فیض صاحب بہت احتیاط کرنے لگے تھے اور سگریٹ اور مے نوشی بھی ترک کر دی تھی۔

فیض سیمینار لندن یونی ورسٹی کے اسکول آف ایجوکیشن کے آڈیٹوریم میں ۹۔ جولائی کو صبح دس بجے شروع ہوا — افتتاحی تقریب کی صدارت فیض صاحب نے فرمائی۔ پروفیسر گندھارا نے مختصر سا مضمون پڑھا

اور فیض کی شاعری پر بھی اظہارِ خیال کیا۔ مجاہد ترمذی نے استقبالیہ تقریر کی اور سب کا خیر مقدم کیا۔ اس کے بعد فیض صاحب نے سمپوزیم سے خطاب کیا اور اپنے ذہنی و فکری سفر کی بعض جہات پر روشنی ڈالی۔ دونوں روز مقالوں کے دو دو اجلاس ہوئے۔ افتتاحی مقالہ پڑھنے کے لئے راقم الحروف سے کہا گیا۔ موضوع تھا "فیض کی شاعری کا اسلوبیاتی اور ساختیاتی مطالعہ" کل آٹھ مقالے پڑھے گئے۔ ڈاکٹر ایوب مرزا، پروفیسر جارج فشر، نقی علی، ڈاکٹر محمد حسن، محمود جمال، ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب اور ڈاکٹر قمر رئیس۔ سیمینار کی زبان انگریزی تھی، لیکن ایوب مرزا، محمد حسن اور قمر رئیس نے اردو میں مقالے پڑھے۔ پہلے اجلاس کی صدارت جارج فشر نے کی۔ دوسرے اجلاس کی صدارت راقم الحروف نے کی اور تیسرے اور چوتھے اجلاس کے لئے محمد حسن اور ڈاکٹر قمر رئیس سے کہا گیا۔

شام میں محفلِ شعر منعقد ہوئی۔ سیمینار کا ماحصل البتہ وہ کھلے اجلاس تھے۔ جن میں فیض کے فکر و فن کے بارے میں کھل کر گفتگو ہوئی۔ اور فیض صاحب نے با ترتیب جواب دئے۔ دورانِ گفتگو فیض صاحب نے شاعر کے منصب پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ سب سے بنیادی بات یہ ہے کہ شاعر کے پاس کہنے کے لئے کچھ ہونا چاہئے۔ لیکن کہنے کے لئے کچھ ہونا ہی کافی نہیں ہے، کہنے کا سلیقہ بھی ضروری ہے۔ ایک اور سوال کے جواب میں فیض صاحب نے پوسٹر بنانے والے اور پینٹ کرنے والے آرٹسٹ میں فرق کیا، انہوں نے کہا کہ پوسٹر بنانے والے کی افادیت معاشرے میں مسلّم ہے، اس کی بھی ضرورت ہے، لیکن پینٹر کی بات ہی اور ہے۔ فن کی خدمت پینٹر کرتا ہے۔ انہوں نے کہا استحصال اور جبر کی قوتوں کو پہچاننا ضروری ہے۔ لیکن شاعری کو نعرے بازی سے بچانا بھی فن کار کا کام ہے۔ فیض نے کہا۔ مجھ سے جو ہو سکا ہے، کرتا رہا ہوں۔ اس کی قدر و قیمت کا تعین کرنا اور اس کا تجزیہ کرنا آپ لوگوں کا کام ہے۔ پہلے دن کے کھلے اجلاس میں کئی سوالات میرے معروضات کے بارے میں بھی پوچھے گئے تغزل کی روایت سے فیض کی تخلیقیت کے جس رشتے پر میں نے اصرار کیا، اس کی روشنی میں فیض کی انفرادیت کا تعین کیوں کر ہوگا۔ میں نے فیض کے کلام کے حوالے سے وضاحت کی کہ فیض کے یہاں تمام کلیدی علائم غزل کی روایت سے آئے ہیں۔ البتہ ان کی معنیاتی تقلیب ہوئی ہے۔ اردو شاعری میں سیاسی سماجی جہت کا اضافہ تحریکِ آزادی کا تقاضا بھی تھا اور اس میں فیض سے پہلے دیگر شعراء بھی شریک رہے تھے۔ لیکن فیض نے سیاسی، سماجی شعور کو غنائی عناصر کے ساتھ ملا کر ایک نئی جمالیاتی

● لندن یونی ورسٹی میں فیض سمپوزیم کے شرکاء، ایستادہ - دائیں سے بائیں: ڈاکٹر محمد حسن، احمد فراز، محمود جمال، ڈاکٹر شکیب، نقی تنویر، ایک مہمان، بخش لائل پوری، ڈاکٹر نارنگ (بیٹھے ہوئے): ڈاکٹر جگدیش گندھارا، مجاہد ترمذی، فیض احمد فیض، ڈاکٹر قمر رئیس

شان پیدا کی۔ یہ بھی پوچھا گیا کہ فیض کی آواز تیسری دنیا کے دبے کچلے ہوئے معاشروں کی آواز تو ہے، لیکن اس کے استناد کے لئے ضروری ہے کہ اس میں کچھ مقامیت بھی ہو۔ فیض کی مقامیت مشتبہ ہے۔ میں نے اس رائے سے اختلاف کیا اور اسلوبیاتی نیز معنیاتی دونوں اعتبار سے وضاحت کی کہ فیض کی شاعری کو اصلاً برِصغیر کے دونوں ملکوں کے اور بالخصوص پاکستان کے تاریخی سیاسی حالات کے پیشِ نظر ہی پڑھا جا سکتا ہے۔ نیز فیض کی پیکر تراشی پر جہاں انگریزی شاعری کا اثر ہے، وہاں فیض کے رچے ہوئے احساسِ جمال کی تشکیل میں علاوہ فارسی اردو کلاسیکی اثرات کے پنجابی جڑوں کا بھی کچھ نہ کچھ عمل دخل ہے۔ اس پہ ابھی مزید غور کرنے کی ضرورت ہے۔ بہرحال یہ تقریب کئی اعتبار سے تاریخی تھی۔

یہ پہلا سیمینار تھا جو لندن یونیورسٹی میں کسی اردو شاعر کے بارے میں منعقد ہوا جس میں فیض اکیڈمی کے سکریٹری مجاہد ترمذی اور لندن یونیورسٹی کے پروفیسر گندھارا کی کوششوں کو بڑا دخل تھا۔

لندن یونیورسٹی کا فیض احمد فیض سیمینار اس اعتبار سے تاریخی اہمیت کا حامل ہو جاتا ہے کہ یہ فیض صاحب کی زندگی کا آخری سیمینار تھا۔ اس وقت ہم میں سے کس کو یہ خیال تھا کہ فیض صاحب سے ہماری یہ ملاقات آخری ملاقات ثابت ہوگی۔ اس ملاقات میں کس قدر کھل کر اُن سے باتیں ہوئیں اور کتنے اہم پہلوؤں پر انہوں نے اظہارِ خیال کیا۔ میں نے ایک موقع پر ان سے پوچھا کہ آزادی کے بعد جب پاکستان میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنا ڈالی گئی تو بے حد شدید ادعائیت کا مظاہرہ کیا گیا۔ اور بہت سے صفِ اول کے لکھنے والوں کا بائیکاٹ بھی کیا گیا۔ کیا آپ اس سے متفق تھے۔ فرمایا کہ ہرگز نہیں۔ جس طرح بعض لوگ ترقی پسندی کو ہنگامی تعبیر کرتے تھے، میں نے اس سے اختلاف کیا تھا۔ ترقی پسندی کو پارٹی لائن کے ساتھ خلط ملط کرنا بہت غلط بات ہے۔ ہنگامی موضوعات کی اپنی اہمیت ہوتی ہے، لیکن ادب میں جب تک دائمی کیفیت نہ ہو، وہ زیادہ دور تک نہیں جا سکتا۔

● لندن کی ایک یادگار تصویر: (دائیں سے بائیں) زہرہ نگاہ، احمد فراز، فیض احمد فیض، پروفیسر گوپی چند نارنگ، ایک مہمان، جمیلہ بیگم اور افتخار عارف

فیض صاحب نے کہا کہ نعرے بازی کا ادب یا کھوکھلی جذباتیت کا ادب کبھی ادب نہیں ہو سکتا۔ فیض صاحب نے مزید کہا کہ اسی زمانے میں انہوں نے جوش ملیح آبادی کی شاعری کے بعض ہنگامی پہلوؤں پر اعتراض کئے تھے کہ یہ انقلابی شاعری نہیں ہے۔ اس پر بعض لوگ ان سے ناراض بھی ہوئے۔ میری اس بات سے انہوں نے اتفاق فرمایا کہ انہوں نے برہنہ گفتاری سے ہمیشہ جان بوجھ کر اجتناب کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر ترقی پسندی ادبی تقاضوں کا احترام نہیں کرتی تو اس سے ترقی پسندی کو نقصان پہنچتا ہے اور اگر ادب سماجی مسائل سے بالکل کنارہ کش ہو جاتا ہے تو ادب کو نقصان پہنچتا ہے۔ میں نے سیمینار میں جو افتتاحی مقالہ پڑھا تھا، اس کا مقدمہ یہی تھا کہ فیض نے اپنی انقلابی فکر کے اظہار کے لئے غنائیت کو اور غنائیت کے اظہار کے لئے انقلابیت کو قربان نہیں کیا ہے۔ یہ کہنا کہ فیض کے یہاں رومان اور حقیقت کا سنگم ملتا ہے بہت آسان ہے، لیکن اس کا تجزیہ کرنا بے حد مشکل ہے۔ اسلوبیاتی اور ساختیاتی سطح پر آپ نا ضرور کر سکتے ہیں کہ عاشق، معشوق اور رقیب کی جو پرانی ساختیاتی تثلیث چلی آ رہی تھی اور مذہبی ریاکاری اور ظاہرداری کا پردہ چاک کرنے کے لئے حق پوشی، انسان پرستی اور آزادہ روی کی جو دوسری ساختیاتی سطح عہد وسطیٰ کی شاعری میں پیدا ہو گئی تھی، اور جسے تمام کلاسیکی اردو شعراء نے بھی نبھایا۔ عہد جدید میں اسی تثلیث میں ایک تیسری ساختیاتی سطح پیدا ہوئی۔ جو نوعیت کے اعتبار

● دائیں سے: نارنگ، ساقی فاروقی، فیض احمد فیض اور عارف ۔ لندن یونیورسٹی سیمینار

سے سیاسی اور سماجی تھی ۔ یہ اضافہ عہدِ حاضر کی دین ہے۔ اور یہ سیاسی، سماجی، شعری اظہار فیض کے انقلابی آہنگ سے مخصوص ہو گیا اور فیض کے رنگِ سخن کی پہچان قرار پایا۔ یہ حقیقت ہے کہ فیض کا دامن روایت سے بندھا ہوا ہے، لیکن اُن کی شاعری روایتی اور رسمی شاعری نہیں ہے۔ اس میں معانی کی برابر تقلیب ہوئی ہے اور فیض کا سارا معنیاتی نظام اور آگہی آج کے عہد سے جُڑی ہوئی ہے۔ فیض کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ اُنہوں نے قفس میں جو طرزِ فغاں ایجاد کی' وہی بالآخر سب کی طرزِ بیان قرار پائی۔ میں نے اس بارے میں ان کی نظموں، غزلوں دونوں سے استصواب کیا۔ اُردو شاعری میں محتسب، رند، ساقی، پیمانہ، مے سے زیادہ گھسا پٹا شاید ہی کوئی اظہار ہو، لیکن فیض جب کہتے ہیں:

محتسب کی خیر اُونچا ہے اُسی کے نام سے
رند کا، ساقی کا، مے کا، خم کا، میخانے کا نام

تو ان تمام لفظوں کی معنویت یک سر بدل جاتی ہے اور ایک نیا ساختیاتی نظام اُبھرتا ہے۔ یہ ہمارے عہد کا مزاج ہے۔ اس سے جُڑے ہوئے جتنے بھی اور جا گتے

کلاسیکی شاعری میں موجود ہیں، فیض کے ہاتھوں اُن سب کی تقلیب ہوئی ہے۔ میں نے اپنے مضمون میں ان سب کا تجزیہ کیا تھا۔ اور یہ نتیجہ نکالا تھا کہ انقلابی فکر اور تغزل کی آمیزش سے اُردو شاعری میں ایک نئی جمالیاتی جہت پیدا ہوئی ہے، جس میں فیض کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ سیمینار کے پہلے اجلاس کے بعد جب لنچ کے وقفے میں فیض صاحب سے ملاقات ہوئی تو مبارک باد دیتے ہوئے بغل گیر ہوئے اور مضمون کا شکریہ ادا کیا۔ حق بات یہ ہے کہ فیض کی شاعری پر ابھی وہ توجہ نہیں ہوئی، جو اس کا حق ہے۔ فیض صاحب سے آخری ملاقات کے لمحے ابھی تک نظروں کے سامنے چمک رہے ہیں۔ وہ بہت احتیاط کرنے لگے تھے۔ احمری گلاس میز پر جوں کا توں لرزتا رہتا تھا۔ انگلیاں سگریٹ سے نا آشنا ہو گئی تھیں۔ اپنے مداحوں کے ہجوم میں اُن کی آنکھوں کی چمک دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ افسوس یہ آنکھیں کس قدر جلد بند ہو گئیں۔

کب ٹھہرے گا درد اے دل کب رات بسر ہوگی
سنتے تھے وہ آئیں گے سنتے تھے سحر ہوگی

فیض پر بین الاقوامی مذاکرہ

رپورٹ: شاہد علی سید

لندن یونیورسٹی میں فیض اکیڈمی اور انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن کے اشتراک سے فیض احمد فیض پر اپنی نوعیت کا پہلا بین الاقوامی مذاکرہ ۹ اور ۱۰ جولائی کو منعقد ہوا۔ اس مذاکرے میں مختلف نشستوں میں فیض احمد فیض کے فن اور تخلیقات پر

کئی ادیبوں اور عالموں نے مقالے پیش کیے اور شرکار نے بحث میں حصّہ لیا۔ ۹ جولائی کی شام کو سمپوزیم کے تحت فیض اکیڈمی کی جانب سے مشاعرے کی محفل منعقد کی گئی جس میں مقامی شعراء نے فیض احمد فیضؔ کے بارے میں اپنا کلام سُنایا۔ مذاکرے کا افتتاح کرتے ہوئے انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن کے ڈاکٹر جگدیش گندھارا نے کہا کہ فیض کی شاعری کا مقام لورکا، نورڈا، ناظم حکمت، قاضی نذرالاسلام اور لوئیس ارگان جیسے شعراء کے فن کے زمرے میں آتا ہے۔ انہوں نے کہا فیض کی شاعری سماجی حالات سے متعلق ہے اور اس نے ایک نئی نہج کو جنم دیا ہے۔ ڈاکٹر گندھارا نے کہا کہ اس مذاکرے کے ذریعے فیض احمد فیضؔ کے کام کو برطانیہ میں موثر طور پر متعارف کروانے کے علاوہ یہ پیغام بھی دیا جا رہا ہے کہ ہمارے ملکوں کے ادیبوں اور فنکاروں نے جو خدمات سرانجام دی ہیں انہیں آئندہ نسل تک پہنچایا جائے اور یونیورسٹی جیسے ادارے اس سلسلے میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں

فیض اکیڈمی کی جانب سے مجاہد ترمذی نے اپنی تنظیم کی داغ بیل ڈالنے کے مقاصد واضح کرتے ہوئے کہا کہ یہ ادارہ ایک ایسے پلیٹ فارم کی مانند ہے جہاں فیض احمد فیضؔ کے فلسفے پر مبنی نظریات کو فروغ دیا جا سکے اور ایسے نظریات کی تخلیق کی جائے جس کے تحت امنِ انسانیت اور سماجی انصاف کی جدوجہد تیز تر ہو اور قوتِ ارادی کے ساتھ ظلم و ناانصافی تعصب اور امتیاز کے خلاف تحریک چلائی جائے انہوں نے کہا کہ فیض سمپوزیم کا انعقاد اس لحاظ سے منفرد حیثیت رکھتا ہے کہ برطانیہ میں مقیم اقلیتوں کی جانب سے ادبی اور علمی لحاظ سے یہ ایک اہم اجلاس ہے جس میں مختلف دانشور اور ادیب حصّہ لیں گے۔ فیض احمد فیضؔ نے سمپوزیم کا باقاعدہ افتتاح کرتے ہوئے دونوں اداروں اور شرکار کا شکریہ ادا کیا اور اپنی حالیہ مصروفیت کا ذکر کیا۔ اس موقع پر انہوں نے اپنی ادارت میں شائع ہونے والے جریدے "لوٹس" کے ایک

فیض پر منعقد مذاکرہ میں ایک انگریز خاتون اپنے تاثرات بیان کر رہی ہیں

ادارے کا نفس مضمون سنایا۔ اس میں انہوں نے سچائی اور
خوب صورتی کی ہئیت اور ان کے باہمی تعلق کا تجزیہ کیا۔
انہوں نے کہا کہ سچائی یہ ہے کہ بحران کے دور میں انسانیت
چیلنج کا سامنا کرتی ہے اور اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کا پیغام
خوب صورتی ہے ایسا لٹریچر جو اس امتزاج سے جنم لیتا ہے وہ
اس پیغام کو آگے بڑھاتا ہے۔ لٹریچر کی خوب صورتی یہ ہے
کہ سیاسی اور معاشی حقائق کی سچائی بیان کرتے وقت وہ ذاتی
تجربے اور مسائل کو ایک طرف نہ رکھ دے بلکہ یہ ضروری
ہے کہ یہ سب معروضی حالات کے سائے میں بیان کیا جائے
انہوں نے کہا اگر ہم چیلنج کا مقابلہ نہیں کرتے تو خوب صورتی
اور سچائی خام خیالی ہے۔

پہلی نشست

اس نشست جس کی صدارت فرانس کے پروفیسر جارج
فشر نے کی، میں گوپی چند نارنگ نے اپنا مقالہ پیش کیا جس میں
انہوں نے اس بنیادی بات کو اٹھانے کی کوشش کی کہ فیض کی
شاعری میں روایت اور جدت کی کس طرح آمیزش کی گئی ہے
انہوں نے بلیغ مثالوں کے ساتھ ثابت کیا کہ فیض نے کس طرح
عاشق معشوق جیسے لفظوں کو سماجی اور معاشرتی معنویت عطا
کی۔ انہوں نے کہا فیض نے اقبال کے بعد کلاسیکی روایت کو
لے کر اپنی شاعری کی بنیاد استوار کی اور اپنے تجربات، مشاہدات
اور سماجی حالات کے درد کو ان میں سمو دیا۔ فیض نے دراصل
روایت کی بنیاد سے اٹھنے والی شاعری کو انقلابی راہوں سے استوار کیا
اس نشست میں دوسرا مقالہ ڈاکٹر ایوب مرزا کا تھا۔ جنہوں نے
فیض کی شاعری کے سیاسی پس منظر پر بحث کی۔ ان کا مضمون
تین حصوں پر مشتمل تھا۔ ایک حصہ تو پیدائش سے لے کر اب تک
کے عالمگیر اثرات پر مبنی تھا جس میں عالمی جنگوں کا ذکر چین اور
روس میں سرخ انقلابات اور برصغیر میں جدوجہد آزادی جیسے
واقعات کا ذکر تھا جن کے اثرات فیض کی شاعری پر ثبت ہوئے
دوسرا حصہ ان کی شاعری کے مزاج اور تیسرا حصہ فیض کی شاعری میں
نئے انداز کی مرثیہ نگاری کے تجزیے پر مبنی تھا۔ ڈاکٹر مرزا نے کہا
فیض عوامی امنگوں کا آئینہ دار شاعر ہے جس میں زندگی اور شاعری
دونوں رواں دواں ہیں

دوسری نشست

اس نشست کی صدارت پروفیسر نارنگ نے کی اور
فرانس کے پروفیسر جارج فشر نے اپنے مقالے میں فیض کے ساتھ
اپنی ملاقاتوں کے حوالے سے بحث کی۔ انہوں نے ۱۹۴۹ سے
لے کر اب تک ہونے والی ملاقاتیں جو کبھی پاکستان بھارت
اور کبھی ملان اور اکثر و بیشتر فرانس میں ہوئیں کا تفصیل سے
ذکر کیا اور بتایا کہ فیض لوگوں کا شاعر ہے اور اس کی شاعری
میں دیہات میں کام کرنے والے کسانوں اور فیکٹریوں میں
سرگرم عمل مزدوروں سے رابطہ محسوس ہوتا ہے۔ انہوں
نے کئی ایک واقعات کے ذریعے ثابت کیا ہے کہ فیض انسانیت
اور انصاف کا علم بلند رکھتا ہے۔ برطانیہ میں مقیم صحافی نقی علی
نے اپنے مقالے میں فیض کی شاعری اور مسئلہ فلسطین کو موضوع
بحث بنایا۔ انہوں نے پہلے تو اس مسئلے پر روشنی ڈالی اور
پھر فیض کی اس مسئلے پر تشویش اور عملی تعلق کا ذکر کیا۔ فیض
نے اپنی شاعری میں غیر انسانی رویّوں کے خلاف آواز بلند کی
ہے۔ یہی وجہ ہے فیض فلسطینیوں کے جلتے ہوئے گھر، یتیم
بچے اور بے کس عورتیں اور مُردہ جسم دیکھ کر لرز اٹھتا ہے اور
اپنی شاعری میں تمام دنیا کے لوگوں سے اکٹھے ہو کر اس ظلم و
ناانصافی کو ختم کرنے کا پیغام دیتا ہے۔
ان دو نشستوں کے بعد شرکا نے فیض کی شاعری اور
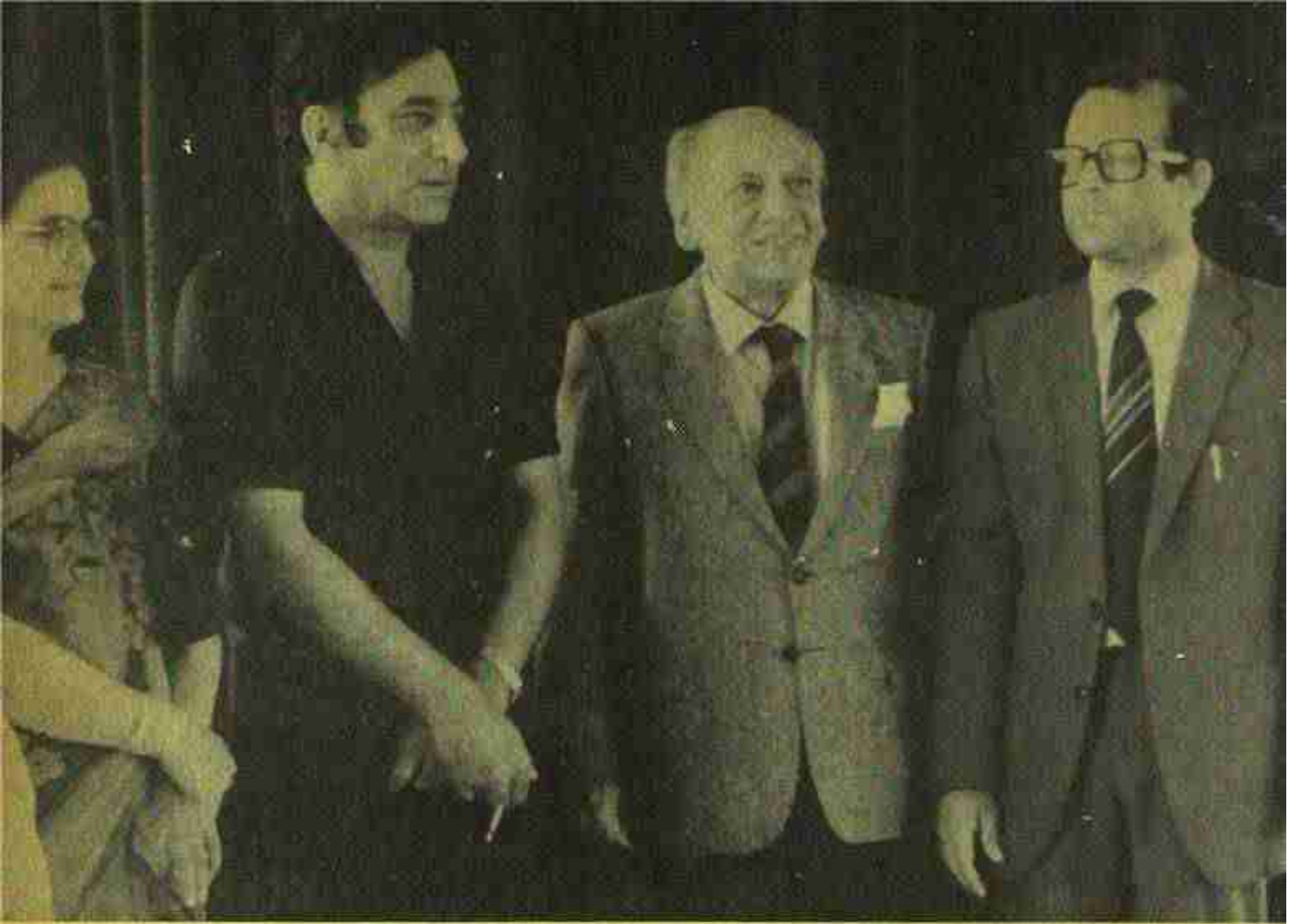
صحافی سلطان محمود (دائیں طرف) فیض احمد فیض ، احمد فراز ، بیگم شمیم

ادبی تخلیقات پر بحث کی اور پروفیسر نارنگ اور پروفیسر قمر رئیس نے کئی ایک سوالات کے جواب دیے۔

تیسری نشست

۱۰ جولائی کو ہونے والی اس نشست کی صدارت دہلی یونیورسٹی کے ڈاکٹر قمر رئیس نے کی۔ پروفیسر محمد حسن جو نہرو یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو ہیں نے اپنے مقالے میں فیض احمد فیض کی شاعری میں نشاط و کرب کے عنصر پر روشنی ڈالی انہوں نے کہا درد و کرب کی اتھاہ گہرائیاں فیض کی شاعری میں جابجا بکھری ہوئی ہیں اتنی مثالیں کہ اردو شاعری کے پورے سرمائے سے پیش نہیں کی جاسکتیں۔ فیض کی شاعری کا درد دل و دماغ کو متاثر کرنے کے علاوہ اپنے مقدر کے بدلنے کا حوصلہ پیدا کرتا ہے۔ انہوں نے کہا فیض کا دکھ ان کا ہی نہیں ان کے زمانے کی شناخت بھی ہے یہ دکھ درد در اصل تمام دکھ درد کو دور کرنے کا وسیلہ ہے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب نے فیض کی شاعری کے اسلوبیاتی پہلو پر بحث کی۔ انہوں نے کہا شاعری میں دو طرح کے اسلوب ہیں ایک انڈو اسلامک اور دوسرے انڈو پرشین۔ پہلا پیچیدہ اور دقیق ہے اور دوسرا آسان اور سلیس۔ فیض نے اس دوسرے اسلوب کو اپنایا۔ مقامی شاعر محمود جمال نے فیض کی شاعری میں جلاوطنی اور جیل میں صعوبتوں کے اثرات پر گفتگو کی۔ انہوں نے کہا اگرچہ فیض کی جلاوطنی ۱۹۵۱ء سے شروع ہوئی لیکن یہ احساس اس سے قبل بھی جھلکتا ہے وہ اپنے وطن میں بھی جلاوطن محسوس کرتا ہے اور قید خانے

فیض صاحب اپنے مداحوں کے درمیان

میں رہتا ہے۔

آخری نشست

اِس نشست میں پروفیسر قمر رئیس نے فیض کی جیسہ شاعری کا قومی اور بین الاقوامی تناظر پیش کیا اس مرتبہ صدارت کے فرائض پروفیسر محمد حسن نے ادا کئے پروفیسر قمر رئیس نے اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ فیض کی شاعری میں اُن کی زندگی کی کم وبیش ساری اہم واردات اور ان کے تناظرات کا عکس دیکھا جا سکتا ہے۔ انہوں نے فیض احمد فیض کی گرفتاری اور دیگر سیاسی واقعات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ فیض جبر و تشدّد کی آگ میں سلگتے ہوئے کروڑوں انسانوں کے چہرے دیکھنے لگے اپنے وطن میں کرب تنہائی کا یہ تجربہ اتنا دور رس تھا کہ فیض کے اعصابی وجود میں جذب ہو کر ایسا لگتا ہے کہ ہمیشہ کے لئے اس کا حصّہ بن گیا اور اس نے ان کے بعد کے شعری لب ولہجہ کو بھی متاثر کیا ۔انہوں نے فیض کی "وطن" سے معمور شاعری کا بالخصوص

اپنے مداحوں میں گھرے فیض صاحب

ذکر کیا۔ پروفیسر قمر رئیس کے مقالے کے بعد شرکا نے مدعو سکالروں سے سوالات کئے۔ بحث کے دوران پروفیسر محمد حسن نے کہا کہ تیسری دنیا ایک غلط اصطلاح ہے دراصل دو ہی دنیا ہیں ایک استحصال کرنے والوں کی اور دوسرے ان کی جن کا استحصال ہوتا ہے۔ آخر میں پروفیسر قمر رئیس نے سمپوزیم میں ہونے والی بحث کا خلاصہ پیش کیا اور کہا فیض نے یورپ کی ادبیات کو اپنے فن میں جذب کیا جس طرح انہوں نے فارسی اور اردو ادب کو اپنی شاعری میں سمویا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے مذاکرے میں اس بات کی کمی کو محسوس کیا کہ فیض کو خراج تحسین تو زیادہ ادا کیا ہے لیکن ان کی شاعری کے کمزور پہلوؤں کی جانب کوئی اشارہ نہیں کیا گیا۔ اس طرح مذاکرے میں شاعری کے تجریدی ارتقار سیاسی طور پر ان کی شاعری کے اثرات اور نوجوانوں پر ان کی شاعری کے اثرات جیسے موضوعات پر کچھ نہیں کہا گیا۔ انہوں نے یونیورسٹی میں مذاکرہ منعقد کرنے پر بنگلہ دیش

گندھارا کا شکریہ ادا کیا اور فیض اکیڈمی کی جانب سے اس کے انتظامات کروانے پر مجاہد ترمذی کی کوششوں کو سراہا کہ واقعی انہوں نے اس ضمن میں مجاہدہ کیا ہے۔ مذاکرے کے آخر میں دونوں میزبانوں نے شرکا اور مہمانوں کا شکریہ ادا کیا اور فیض احمد فیض نے سامعین سے خطاب کیا۔ انہوں نے کہا شروع شروع میں جب اس قسم کے مذاکرے ہوتے تھے تو عجیب سا لگتا تھا اب تو ان کی عادت ہو گئی ہے۔ انہوں نے کہا ضرورت اس بات کی ہے کہ اگر کوئی بات بہتری کی سمجھ میں آئے تو اس پر عمل کرنے کی کوشش کی جائے۔

یہاں یہ امر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ادبی سطح پر ہونے والے اس سمپوزیم کے بارے میں لندن سے شائع ہونے والے اردو کے دو روزناموں نے کوئی اہمیت نہ دی۔ دونوں اخبارات نے صرف ایک آدھ تصویر شائع کرنے پر اکتفا کیا۔

○○

فیض کا پیرہن

ڈاکٹر قمر رئیس

ڈاکٹر قمر رئیس کے تاشقند میں قیام کے دوران لی گئی ایک یادگار تصویر (دائیں سے بائیں) فیض احمد فیض، ڈاکٹر قمر رئیس کی بچی اور ایک روسی خاتون

فیض کی شاعری عشق و محبت کے والہانہ جذبات سے معمور ہے۔ اس عشقیہ شاعری میں جہاں ہزار شیوۂ حسن کی رعنائیاں سانس لیتی ہیں۔ وہاں اس میں سوز دردر کی تیکھی لہریں بھی ہیں۔ کبھی یہ عشق لہو کی دھیمی دھیمی آنچ میں سلگتا نظر آتا ہے تو کبھی سیلِ جنوں بن کر جنگل کی آگ کی طرح پھیل جاتا ہے۔ کبھی یہ ایک شخص کے تصور کی رعنائی خیال بن جاتا ہے اور کبھی ساری انسانیت، ساری کائنات پر محیط ہو جاتا ہے۔ الغرض فیض کی شاعری کے ہر دور میں محبت کا جذبہ ہی ان کی شاعری کا غالب محرک اور موضوع رہا ہے۔

فیض کی بیٹی منیزا نے اپنے ابو کی سیرت کے ایک بنیادی پہلو کا ذکر اس طرح کیا ہے:

"ان کے جسم و جان میں، میرے خیال میں، خون کے بجائے، محبت کا پیار کا دریا ٹھاٹھیں مارتا ہے۔ وہ کہتے تھے جتنا لوگوں کو پیار کرو گے، وہ اس سے بڑھ کر تمہیں پیار کریں گے۔ میں کوشش کرتی ہوں کہ زندگی کی کدورتیں زندگی کے اس دریا میں ڈبو دوں، جو مجھے ابو سے ملا ہے اور پھر سارے

فیض سیمینار لندن (دائیں سے بائیں) ڈاکٹر قمر رئیس، فیض اور ڈاکٹر محمد حسن

انسانیت سے والہانہ پیار کروں۔"

اس آفاق گیر محبت کا جذبہ یوں تو خمیر کی
طرح فیض کے وجود میں ہی موجود تھا، لیکن اس کا شعور
اور اُن کی شاعری میں اس کا اظہار آہستہ آہستہ ہوا۔
جیسے جیسے اپنے وطن کے اور ساری دنیا کے دُکھی
انسانوں سے اُن کا رشتہ مضبوط ہوتا گیا۔ جیسے جیسے

پریم چند سیمینار کے موقع پر لی ہوئی تصویر:
دائیں سے بائیں: ڈاکٹر اجمل اجملی، ڈاکٹر سید محمد عقیل، ڈاکٹر قمر رئیس اور فیض احمد فیض

لندن کے ایک جلسے میں
علی سردار جعفری فیض کے بارے میں اظہارِ خیال کر رہے ہیں

اُن کے بے شمار دکھوں اور محرومیوں کے اسباب کو اُنھوں نے سمجھا اسی طرح اُن کے دل میں ان کی محبت اور دردمندی کے جذبات جگہ بناتے گئے۔ اور اُن کے بے ساختہ اظہار سے اُن کی شاعری میں بھی زیادہ وسعت، گہرائی اور تاثیر پیدا ہوتی رہی۔

لیکن اس کا ذکر ذرا بعد میں، اُن کے دوسرے عشق کے ذیل میں آئے گا۔ پہلے ہم اُن کے اوّلین عشق کو سمجھنے کی کوشش کریں، جس کو وہ ہمیشہ چھپاتے رہے۔ اگرچہ اُن کی شاعری میں یہ عشقِ بلاخیز اشاروں کنایوں میں سہی، ہمیشہ نمایاں رہا۔ اپنی نظم

لندن میں ایک ضیافت کے موقع پر بائیں سے دائیں،
مجاہد ترمذی، اور فیض احمد فیض

"دو عشق" میں اُنھوں نے پہلے عشق کا ذکر کچھ اس انداز سے کیا ہے:

تازہ ہیں ابھی یاد میں اے ساقیٔ گلفام
وہ عکسِ رُخِ یار سے لہکے ہوئے ایّام
وہ پھول سی کھلتی ہوئی دیدار کی ساعت
وہ دل سا دھڑکتا ہوا اُمید کا ہنگام
پھر دیکھے ہیں وہ ہجر کے تپتے ہوئے دن بھی
جب فکرِ دل و جاں میں فغاں بھول گئی ہے
ہر شب وہ سیہ بوجھ کہ دل بیٹھ گیا ہے
ہر صبح کی لَو تیر سی سینے میں لگی ہے
تنہائی میں کیا کیا نہ تجھے یاد کیا ہے
کیا کیا نہ دلِ زار نے ڈھونڈی ہیں پناہیں
آنکھوں سے لگایا ہے کبھی دستِ صبا کو
ڈالی ہیں کبھی گردنِ مہتاب میں باہیں

سوال یہ ہے کہ یہ پہلا عشق کس حسینہ سے ہوا، کب ہوا اور کس زمانے میں ہوا۔ ہمارے مشرقی آداب اور ہماری عشقیہ شاعری کی یہ روایت رہی ہے کہ اصل معشوق کا اتا پتہ نہیں بتاتے۔ وہ پردہ نشین ہو یا نہ ہو شاعر اسے پردہ میں ضرور رکھتا تھا۔ فیضؔ نے یا ان کے کسی دوست نے بھی اُن کے پہلے عشق کے بارے میں تفصیل سے نہیں بتایا ہے، لیکن بعض اشاروں سے یہ پتہ ضرور چلتا ہے کہ بیس سال کی عمر میں ۲۳-۱۹۲۲ میں جب فیضؔ گورنمنٹ کالج لاہور میں زیرِ تعلیم تھے۔ تو پہلے عشق کا تیر ان کے سینے میں لگا تھا اور میر تقی میر کے عشق کی طرح اُس کا زخم اتنا کاری تھا کہ ساری زندگی مندمل نہ ہو سکا۔ قرائن سے ایسا لگتا ہے کہ یہ کسی بڑے اور باعزّت گھرانے کی نہایت حسین و جمیل دوشیزہ تھی۔ یوں تو اس حُسنِ دلآرا کی سج دھج فیضؔ کی ہر دور کی شاعری میں دیکھی جا سکتی ہے، لیکن عنفوانِ شباب کی ایک نظم میں اس کا سراپا اُنھوں نے اِس طرح پیش کیا ہے:

وہ جس کی دید میں لاکھوں مسرتیں پنہاں
وہ حُسن جس کی تمنا میں جنتیں پنہاں
شباب، جس سے تخیل پہ بجلیاں برسیں
وقار، جس کی رفاقت کو شوخیاں ترسیں
سیاہ زُلفوں میں وارفتہ نکہتوں کا ہجوم
طویل راتوں کی خوابیدہ راحتوں کا ہجوم
وہ آنکھ جس کے بناؤ پہ خالق اترائے
زبانِ شعر کو تعریف کرتے شرم آئے
وہ ہونٹ فیض سے جن کے بہارِ لالہ فروش
بہشت و کوثر و تسنیم و سلسبیل بدوش
گداز جسم، قبا جس پہ سج کے ناز کرے
دراز قد جسے سروِ سہی نماز کرے

فیضؔ کے ایک بے تکلّف دوست ڈاکٹر ایوب مرزا نے فیضؔ سے اپنی بے شمار ملاقاتوں اور مکالموں کی روداد اپنی کتاب "ہم کہ ٹھہرے اجنبی" میں لکھی ہے۔ ایک ملاقات کا ذکر اِس طرح کرتے ہیں۔

"پنڈی کلب کے لان میں ایک خاموش شام تھی اور ہم تھے۔ میں اور فیضؔ ....
"فیضؔ صاحب، آپ نے کبھی محبت کی ہے؟" میں نے پوچھا۔
"ہاں کی ہے اور کئی بار کی ہے۔" یہ کہہ کر پھر

مجیب ہو گئے۔

"سیریس SERIOUS محبت ہے؟" میں نے
پوچھا۔

بولے "ہاں ہاں تمہارا مطلب پہلی محبت سے ہے
نا۔ محبت پہلی ہی ہوتی ہے، اس کے بعد سب ہیرا پھیری
ہے۔ اچھا شعر سن لو۔ صبح سے شعر آ رہے ہیں۔ یہ دفتری
کام انسان کے بھیجے سے عقل غائب کر دیتا ہے اور
قابل گھسیٹر دیتا ہے۔ شعروں کے بعد اُن کی پہلی محبت
کا قصہ ہوا۔ میں نے پوچھا" اس کا انجام؟" بولے "بھئی
وہی نا، جو ہوا کرتا ہے۔ اُس کی شادی ہو گئی اور ہم
نوکر ہو گئے۔"

فیض کو پہلی نوکری ایم۔ اے۔ او کالج امرتسر
میں ملی، جہاں اُن کی ملاقات محمود الظفر اور ان کی
کمیونسٹ شریک حیات ڈاکٹر رشید جہاں سے ہوئی۔

ڈاکٹر ایوب مرزا اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

"پہلی محبت میں دونوں جہان ہارنے کے بعد
فیض امرتسر ایم۔ او کالج پہنچے۔ ان کی عجیب کیفیت
تھی۔ محبت کے میدان میں پہلے تجربہ کا اہم ترین پہلو
تحیر ہوتا ہے۔ اسی تحیر کے عالم گو مگو میں فیض امرتسر
کے شہر میں "گواچ" گئے۔ غور فرمائیں: فیض کبھی بیڈمنٹن
کھیل رہے ہیں تو کبھی کرکٹ ٹیم کی تشکیل کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر
رشید جہاں کی نگاہِ دُور رَس نے اس تنہا لیکچرار
کو بھانپ لیا۔

"پوچھا: معاملہ کیا ہے۔ کسی کام میں تیرا جی
نہیں لگتا۔" جب فیض نے جواب میں تکلف کیا
تو بلا تکلف بولیں "محبت میں ناکامی؟" اور فیض نے
اثبات میں سر ہلا دیا۔ ڈاکٹر صاحبہ نے مشورہ دیا۔ یہ
حادثہ تمہاری ذاتِ واحد کا بہت بڑا حادثہ ہو سکتا ہے
مگر یہ اتنا بڑا بھی نہیں کہ زندگی بے معنی ہو جائے۔
اُنہوں نے فیض کو ایک کتاب مطالعہ کے لئے دی اور
پھر ملنے کے لئے کہا۔ بقول فیض اُنہوں نے اُس
کتاب کو پڑھا اور ان پر چودہ طبق روشن ہو چکے تھے۔
یہ کتاب (کارل مارکس کی) کمیونسٹ مینی فسٹو تھی۔
اور پھر فیض پکار اُٹھے۔ ع:

مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ

نیا فیض جنم لے چکا تھا۔ اب فیض نئی منزلوں کا مسافر
بن گیا اور پھر: ؎

مقام فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

فیض کے اُس پہلے عشق کے بارے میں بس اتنا
ہی معلوم ہے کہ اُس کا انجام ناکامی پر ہوا، لیکن اس
ناکامی کے تئیں غم کو وہ ساری زندگی سینے سے لگائے
رہے۔ اُس نے اُنہیں مایوسی کے اندھیروں میں پناہ
لینے کے بجائے حوصلہ مندی اور اُمید کی ایک نئی روشنی
عطا کی۔ عشق میں مایوسی سے دل کو لہو کر دینے والا جو
غم اُنہیں ملا۔ جس رُوحانی اذیت سے وہ دوچار ہوئے
اُس کی سرحدیں بنی نوعِ انسان کے بے کراں دُکھوں
اور محرومیوں سے مل گئیں۔ اپنی ابتدائی دَور کی ایک نظم
میں فیض اپنے رقیب سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:

ہم نے اِس عشق میں کیا کھویا ہے کیا سیکھا ہے
جُز ترے اور کو سمجھاؤں تو سمجھا نہ سکوں
عاجزی سیکھی غریبوں کی حمایت سیکھی
یاس و حرمان کے، دُکھ درد کے معنی سیکھے
زیر دستوں کے مصائب کو سمجھنا سیکھا

سرد آہوں کے رُخِ زرد کے معنی سیکھے
جب کہیں بیٹھ کے روتے ہیں وہ بے کس جن کے
اشک آنکھوں میں بلکتے ہوئے سو جاتے ہیں
ناتوانوں کے نوالوں پہ جھپٹتے ہیں عقاب
بازو تولے ہوئے منڈلاتے ہوئے آتے ہیں
جب کبھی بکتا ہے بازار میں مزدور کا گوشت
شاہراہوں پہ غریبوں کا لہو بہتا ہے
آگ سی سینے میں رہ رہ کے اُبلتی ہے نہ پوچھ
اپنے دل پر مجھے قابو ہی نہیں رہتا ہے

مفلوک الحال اور غریب محنت کش انسانوں کی زندگی سے یہ تعلقِ خاطر صرف اشتراکی مبنی فلسفہ کے مطالعہ کا نتیجہ نہیں تھا۔ اس کی جڑیں کہیں اور تھیں۔ اگرچہ عشق کی ناکامی نے اُسے اُبھارا اور اشتراکی ادب کے مطالعہ نے اُسے نظریاتی بنیاد فراہم کی۔ اس جذبہ کا سرچشمہ اُن کی اپنی طبقاتی وابستگی تھی۔ فیض یہ حقیقت کبھی فراموش نہیں کر سکتے کہ اُن کے والد سلطان بخش (جو بعد میں سلطان محمد خاں کہلائے) پنجاب کے ایک چھوٹے سے گاؤں کالا قادر کے سب سے مفلس اور نادار کسان گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا حال خود فیض کی زبانی سنئے:

"جب یہ (آبا) پانچ برس کے ہوئے تو غربا کی روایت کے مطابق اُنہیں پڑھنے کے بجائے روٹی کمانے کا فن سکھایا گیا۔ دیہات والوں نے ہمارے آبا کو مویشی چرانے پر لگا دیا۔ اور اس خدمت کے معاوضہ میں اُن کی روٹی کا خرچ برداشت کر لیا۔ اب آبا صبح سویرے ریوڑ لے کر دیہات سے باہر چلے جاتے۔ گلہ بانی کرتے۔ مویشی گھاس چرتے اور یہ کسی درخت کے سائے میں بیٹھے دُور اسکول اور اس میں طلبا کو مسرت بھری نظروں سے دیکھتے۔"

فیض بتاتے ہیں کہ ان کے والد کو بچپن سے ہی پڑھنے کا شوق تھا، لیکن ان کا گھرانہ اتنا غریب تھا کہ گاؤں کے اسکول میں بھی اُنہیں پڑھنے نہیں بھیج سکا۔ پر وہ ایک ماسٹر کی مہربانی سے اسکول میں جا کر سبق لیتے تھے اور مویشی چراتے ہوئے سبق یاد کرتے تھے۔ اِس طرح اُنہوں نے پرائمری اور مڈل کے امتحان پاس کر لئے۔ ہائی اسکول کی تعلیم کے لئے وہ لاہور میں موچی دروازے کی ایک مسجد میں جا کر رہنے لگے۔ فیض بتاتے ہیں:

"اب والد صاحب دن میں اسکول جاتے۔ دوپہر اور شام مسجد کا کام کرتے۔ کھانا محلے سے آ جاتا اور پھر عشا کی نماز کے بعد لاہور ریلوے اسٹیشن چلے جاتے۔ وہ رات گئے تک قلی گیری کرتے۔ اِس طرح جو رقم جمع ہوتی وہ اپنے گھر والوں کو بھیج دیتے۔"

یہ بات فیض کبھی نہیں بھول سکے کہ اُن کے والد نے گاؤں کے ایک چرواہے اور پھر ایک قلی کی خدمت انجام دی۔ (یہ بات الگ ہے کہ بعد میں وہ اپنی محنت اور کوشش سے انگلستان میں افغانستان کے سفیر اور بیرسٹر بنے) اس لئے فیض ہمیشہ اپنے مقدر کو غریب

محنت کش انسانوں کے مقدر سے ہی وابستہ سمجھتے رہے۔ اور ایک بہتر زندگی کی جدوجہد میں ان کا ساتھ دیتے رہے۔

یہ فیض کا دوسرا عشق تھا، جو پہلے عشق سے بڑھ کر ایک مستقل جنون بن کر اُن کے سارے وجود پر چھایا رہا۔ اس کے لئے اُنہوں نے ہر طرح کی قربانیاں دیں۔ قیدِ تنہائی کے دُکھ جھیلے، برسوں اپنے بچوں اور عزیزوں سے دُوری کا عذاب سہا، لیکن اس عشق سے دست بردار نہیں ہوئے۔

چھوڑا نہیں غیروں نے کوئی ناوکِ دشنام
چھوٹی نہیں اپنوں سے کوئی طرزِ ملامت
اِس عشق نہ اُس عشق پہ نادم ہے مگر دل
ہر داغ ہے اِس دل میں بجز داغِ ندامت

پاکستان بننے کے بعد جب وہاں مزدوروں کی ٹریڈ یونینیں اور تنظیمیں از سرِ نو تشکیل دی گئیں تو فیض نے بڑی سرگرمی کے ساتھ اُن کی رہنمائی کی۔ وہ شاعر اور صحافی تھے بظاہر مزدور تنظیموں سے اُن کا کیا واسطہ؟ لیکن نہیں۔ یہی بدحال طبقہ تو ان کی تخلیقی فکر کا محرک اور موضوع تھا۔ اس لئے اُن کے حقوق، اُن کی آزادی اور بہتری کی ہر لڑائی میں اُنہیں شریک رہنا تھا۔ وہ محکمۂ ڈاک و تار اور ریلوے کرمچاریوں کی یونین کے سربراہ رہے۔ صرف یہی نہیں اُنہوں نے پاکستان کی ٹریڈ یونین فیڈریشن کے نائب صدر اور مزدوروں کے نمائندے کی حیثیت سے مزدور تنظیموں کی عالمی کانفرنسوں میں بھی حصّہ لیا۔

پاکستان ٹائمز (انگریزی) کے ایڈیٹر کی حیثیت سے بھی فیض پاکستانی حکومت کی عوام دشمن پالیسیوں کو کڑی تنقید کا نشانہ بنا رہے تھے اور سامراجی طاقتوں سے اس کی سانز باز کے نتائج سے متنبہ کر رہے تھے۔ اس زمانے میں ایشیا اور افریقہ کے دوسرے ملکوں کے محنت کش عوام میں محکومی سے نجات کی جو اُمنگ پیدا ہو رہی تھی جو انقلابی قوتیں بیدار ہو رہی تھیں فیض ان کی اہمیت بھی جتا رہے تھے۔ الغرض ان کی یہی وہ خطائیں تھیں، جن کی پاداش میں پاکستانی حکومت نے اُنہیں مارچ 1951 میں گرفتار کر کے قیدِ تنہائی میں ڈال دیا اور اس طرح چار سال اُنہیں اُس جرم (بغاوت) کی سزا دی گئی، جو اُنہوں نے نہیں کیا تھا۔

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات اُن کو بہت ناگوار گزری ہے

آخر راولپنڈی سازش کیس کی حقیقت کیا تھی۔ جس کے سرکردہ میجر اکبر خاں تھے اور جس میں فیض احمد فیض اور سجاد ظہیر جیسے ادیبوں کو بھی گرفتار کیا گیا۔ بے شک سجاد ظہیر پاکستانی کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری تھے، لیکن فیض پارٹی کے عہدہ دار نہیں تھے۔ اس سازش کے بارے میں ایک موقع پر میں نے اور ڈاکٹر محمد حسن صاحب نے سیّد سجاد ظہیر سے دریافت کیا تھا۔ اُنہوں نے تقریباً وہی بات بتائی جو پاکستان کے بائیں بازو کے نوجوان دانشور طارق علی نے اپنی کتاب "CAN PAKISTAN SURVIVE" میں لکھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"پاکستان کی نوعمر کمیونسٹ پارٹی اُس منصوبہ میں اُس وقت ملوث ہوئی، جب سجاد ظہیر ایک کاکٹیل پارٹی میں

■ مشہور شاعرہ زہرہ نگاہ اور ڈاکٹر قمر رئیس لندن کی ایک تقریب میں

میجر جنرل اکبر سے ملے۔ جنرل نے ان سے مجوزہ بغاوت کے مسئلہ پر بات کی اور اُن سے ملیٹی فسٹو ڈرافٹ کرنے اور ہٹ لسٹ تیار کرنے کی درخواست کی، کمیونسٹ قیادت نے اس کی تائید کی اور فوجی افسروں کے ساتھ کئی نشستوں میں شرکت کی (سجاد ظہیر مرحوم نے ان ملاقاتوں کا ذکر نہیں کیا۔ ق ر) پھر یہ طے پایا کہ کچھ دنوں کے لئے "اس منصوبے کو التوا میں رکھا جائے، لیکن فوجی سازش کاروں میں سے ایک نے اس خوف سے کہ شاید حقیقت کھل جائے سرکاری گواہ بن کر سب اُگل دیا۔ سب سازشی گرفتار کر لئے گئے۔"

ص: ۵۶

فیض اس سازش کی حد تک بے گناہ تھے۔ لیکن قید میں رہ کر وہ اپنے ملک کے عوام سے دُور ہونے کے بجائے کچھ اور قریب ہو گئے۔ اس دور میں وطن کی محبت اور شیفتگی کے جذبات اُن کے اشعار میں کثرت سے در آئے ہیں۔ اُن کی محبت کے داغ اب اور زیادہ دُکھنے لگے تھے۔ یہ چند اشعار دیکھئے:

یہ دل کے داغ تو دُکھتے تھے یوں بھی، پر کم کم
کچھ اب کے اور ہے ہجرانِ یار کا موسم
یہی جنوں کا یہی طوق و دار کا موسم
یہی ہے جبر یہی اختیار کا موسم
قفس ہے بس میں تمہارے، تمہارے بس میں نہیں
چمن میں آتشِ گُل کے نکھار کا موسم

اسی قید میں انہوں نے اپنا وہ مشہور ترانہ لکھا تھا، جس میں ایک نئے ولولے کے ساتھ خاک نشینوں

فیض احمد فیض سیمینار لندن میں ڈاکٹر قمر رئیس اظہارِ خیال کر رہے ہیں۔ بائیں سے دائیں: ڈاکٹر قمر رئیس، فیض اور مجاہد ترمذی

کے انقلابی عزم کو دُہرایا تھا۔

اے خاک نشینو اُٹھ بیٹھو وہ وقت قریب آ پہنچا ہے
جب تخت گرائے جائیں گے جب تاج اُچھالے جائیں گے

اب ٹوٹ گریں گی زنجیریں اب زندانوں کی خیر نہیں
جو دریا جھوم کے اُٹھیں گے تنکوں سے نہ ٹالے جائیں گے

کٹتے بھی چلو، بڑھتے بھی چلو، بازو بھی بہت ہیں سر بھی بہت
چلتے بھی چلو کہ اب ڈیرے منزل ہی پہ ڈالے جائیں گے

اے ظلم کے ماتو لب کھولو چپ رہنے والو چپ کب تک
کچھ حشر تو ان سے اُٹھے گا کچھ دور تو نالے جائیں گے

فیض دیکھ رہے تھے کہ ظلم و استبداد کے خلاف یہ حشر خیز تحریکیں صرف اُن کے وطن میں نہیں، ایشیا اور افریقہ کے دوسرے ملکوں میں بھی سر اُٹھا رہی ہیں۔ اُنھوں نے ساری دنیا کے حریت پسندوں اور باغیوں کی جد و جہد سے اپنے آپ کو وابستہ کر لیا تھا۔ اپنی نظم "آ جاؤ افریقہ" میں اُنھوں نے کینیا اور دوسرے افریقی ملکوں کے حریت پسند عوام کی آواز سے آواز ملائی ہے۔ ایران کے قید خانوں میں وطن پرست نوجوان شاہ کی جبرہ دستیوں کا شکار ہو رہے تھے۔ "ایرانی طلباء کے نام" میں فیض نے اُن کی شہادت کا نوحہ اس طرح لکھا ہے:

یہ کون جواں ہیں ارضِ عجم
یہ لکھ لُٹ جن کے جسموں کی
بھرپور جوانی کا کندن
یوں خاک میں ریزہ ریزہ ہے
یوں کوچہ کوچہ بکھرا ہے
یہ طفل و جواں
اِس نور کے نورس موتی ہیں
اِس آگ کی کچی کلیاں ہیں
جس میٹھے نور اور کڑوی آگ
سے ظلم کی اندھی رات میں پھوٹا
صبحِ بغاوت کا گلشن

■ فیض احمد فیض، دہلی کے کمیونسٹ لیڈر پریم ساگر گپتا کے ساتھ

اور صبح ہوئی من من ۔ تن تن

اسرائیلی جبرِ و استبداد کے مقابلے میں فلسطینی مجاہدینِ آزادی برسوں سے جو قربانیاں دے رہے ہیں، فیض نے اس کے درد بھرے نوحے اس طرح لکھے ہیں کہ وہ ان کا ذاتی غم محسوس ہوتا ہے۔ سرد جنگ کے زمانے میں سامراجی ممالک باغی نوجوانوں کی سرگرمیوں کو امنِ عالم کے مجاہدوں کو ہر طرح کے تشدد سے کچل رہے تھے۔ ایتھل اور جولیس روزنبرگ بھی امن عالم کے ان ہی شہیدوں میں تھے۔ فیض کو ان کے آہنی عزم اور جذبۂ ایثار و سپردگی نے متاثر کیا اور وہ ان کی نظم میں جنگ اور ظلم کی اندھی طاقتوں کے خلاف انسانی مدافعت اور جہاد کی علامت بن گئے۔ منٹگمری جیل میں فیض نے جب یہ نظم لکھی تھی تو خود ان کے سر پر موت کی تلوار جھول رہی تھی۔ لیکن انہوں نے اپنے وجود کو دنیا کے مظلوم محنت کش انسانوں کی جد و جہد، ان کے مستقبل اور ان کی انقلابی آرزو مندیوں سے پوری طرح ہم آہنگ IDENTIFY کر لیا تھا، اس لئے ایتھل اور جولیس کی آواز میں انہیں اپنی ہی آواز سنائی دیتی ہے۔ یہاں ان کا عشق حسینۂ خیال اور وطن سے گزر کر آفاقی

■ اُپندر ناتھ اشک (دائیں) اور فیض احمد فیض اپنے مداحوں کے ساتھ

جہتوں میں داخل ہو چکا ہے۔

ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے
سولیوں پر ہمارے لبوں سے پرے
تیرے ہونٹوں کی لالی لپکتی رہی
تیری زلفوں کی مستی برستی رہی
تیرے ہاتھوں کی چاندی دمکتی رہی
جب گھلی تیری راہوں میں شامِ ستم
ہم چلے آئے، لائے جہاں تک قدم
لب پہ حرفِ غزل، دل میں قندیلِ غم
اپنا غم تھا گواہی ترے حسن کی
دیکھ قائم رہے اس گواہی پہ ہم
ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

فیض کی شاعری میں اُن کے یہ دونوں عشق ان کی شخصیت کے ارتقاء، ارتفاع اور عظمت کی علامت بن کر ابھرتے ہیں۔ ان دونوں میں وہی اندرونی ربط و تسلسل جو گنگوتری اور بحرِ بنگال میں ہے۔ گنگوتری عنفوانِ شباب کا بلاخیز اور ہیجان انگیز عشق تھا۔ وطن اور اہلِ وطن کی محبت گنگا کی طرح مقدس اور گہری تھی۔ جس کے پُرسکون آغوش میں گنگوتری سو رہی تھی اور پھر یہ دُکھی انسانیت کے سمندر میں اس کے انقلابی اور شولا کی وسعت میں اس طرح مل گئے کہ دوئی کا احساس مٹ گیا۔ فیض کی عشقیہ شاعری کی عظمت کا مطالعہ کرنے والے ہمیشہ اسی لازوال محبت کی رُوداد دُہرائیں گے۔

■ ■

دو عشق

تازہ ہیں ابھی یاد میں اے ساقیِ گلفام
وہ عکسِ رخِ یار سے لہکے ہوئے ایام
وہ پھول سی کھلتی ہوئی دیدار کی ساعت
وہ دل سا دھڑکتا ہوا امید کا ہنگام

امید کہ لو جاگا غمِ دل کا نصیبہ
لو شوق کی ترسی ہوئی شب ہو گئی آخر
لو ڈوب گئے درد کے بے خواب ستارے
اب چمکے گا بے صبر نگاہوں کا مقدر

اس بام سے نکلے گا ترے حسن کا خورشید
اس کنج سے پھوٹے گی کرن رنگِ حنا کی
اس در سے بہے گا تری رفتار کا سیماب
اس راہ پہ پھوٹے گی شفق تیری قبا کی

پھر دیکھے ہیں وہ ہجر کے تپتے ہوئے دن رات
جب فکرِ دل و جاں میں فغاں بھول گئی ہے
ہر شب وہ سیہ بوجھ کہ دل بیٹھ گیا ہے
ہر صبح کی لو، تیر سی سینے میں لگی ہے

تنہائی میں کیا کیا نہ تجھے یاد کیا ہے
کیا کیا نہ دلِ زار نے ڈھونڈی ہیں پناہیں
آنکھوں سے لگایا ہے کبھی دستِ صبا کو
ڈالی ہیں کبھی گردنِ مہتاب میں باہیں

چاہا ہے اسی رنگ میں لیلائے وطن کو
تڑپا ہے اسی طور سے دل اس کی لگن میں
ڈھونڈی ہے یونہی شوق نے آسائشِ منزل
رخسار کے خم میں، کبھی کاکل کی شکن میں

اس جانِ جہاں کو بھی یونہی قلب و نظر نے
ہنس ہنس کے صدا دی، کبھی رو رو کے پکارا
پورے کیے سب حرفِ تمنا کے تقاضے
ہر درد کو اجیالا، ہر اک غم کو سنوارا

واپس نہیں پھیرا کوئی فرمان جنوں کا
تنہا نہیں لوٹی کبھی آواز جرس کی
خیریتِ جاں، راحتِ تن، صحتِ داماں
سب بھول گئیں مصلحتیں اہلِ ہوس کی

اس راہ میں جو سب پہ گزرتی ہے وہ گزری
تنہا پسِ زنداں، کبھی رسوا سرِ بازار
گرجے ہیں بہت شیخ سرِ گوشۂ منبر
کڑکے ہیں بہت اہلِ حکم برسرِ دربار

چھوڑا نہیں غیروں نے کوئی ناوکِ دشنام
چھوٹی نہیں اپنوں سے کوئی طرزِ ملامت
اس عشق نہ اس عشق پہ نادم ہے مگر دل
ہر داغ ہے اس دل میں، بجز داغِ ندامت

یادِ فیض
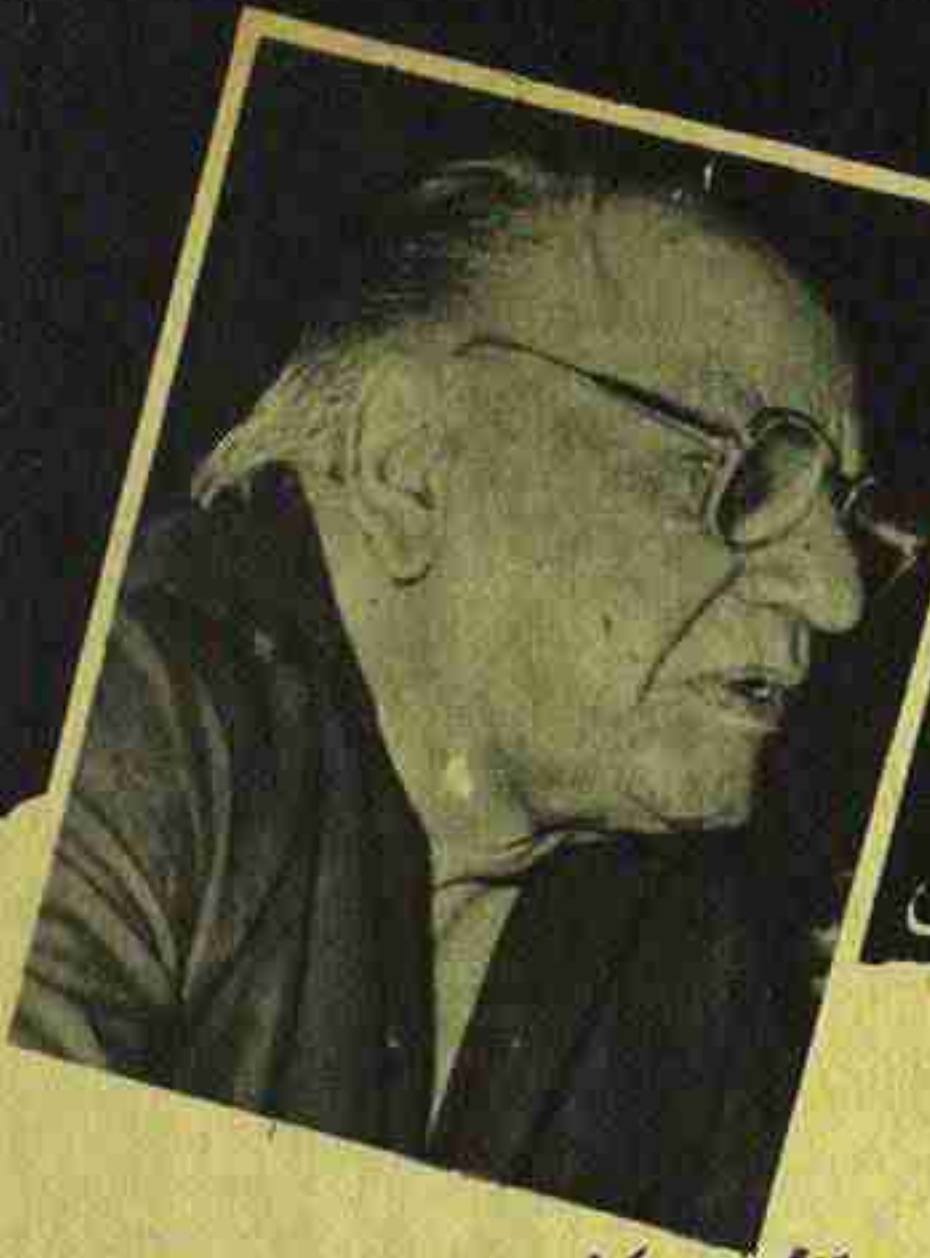
اندر کمار گجرال

فیض نے ایک دفعہ لکھا تھا ؎

آب کوئی پوچھے بھی ہم سے کیا شرحِ حالات لکھیں
دل ٹھہرے تو درد سنائیں اور درد ٹھمے تو بات کریں

دسمبر ۱۹۸۳ء میں اسلام آباد میں ایک بین الاقوامی کانفرنس کے لئے مجھے بھی دعوت نامہ ملا، پرانے دوستوں سے ملاقات کی خواہش، اپنا پرانا وطن دیکھنے کی پُرزور کشش مجھے کھینچ کر تین ہفتوں کے لئے وہاں لے گئی۔ لیکن جانے سے تشنگی بڑھی، کم نہیں ہوئی۔

لاہور سے میرا خاص طور پر رشتہ بہت گہرا تھا۔ اسی شہر کی گلیوں اور سڑکوں پر جوانی کا بیشتر حصہ کٹا تھا۔ وہی یونی ورسٹی کی پرانی بلڈنگ، وہی میرے کالج اور ہوسٹل وہی مزنگ روڈ پر واقع میری سسرال کی کوٹھی میں ہماری شادی ہوئی تھی۔ اس شام کی یادیں عود کر آئیں جب

نیشنل میوزیم کی تقریب میں (دائیں سے بائیں) بھیشم ساہنی، کملیشور، ڈاکٹر محمد حسن، امریتا پریتم، فیض، قمر رئیس، خوشونت سنگھ اور اندر کمار گجرال

بارات میں فیض اور مظہر علی باراتی تھے۔ یہ بات تو فیض نے بھی نہ بھولی تھی۔ میری بیوی سے ملتے ہی پوچھا

"اپنا گھر دیکھ آئی ہو نا"

لاہور میں وہ تاریخی بریڈلا ہال بھی اور لاجپت رائے بھون بھی تھے۔ جہاں بقول مجاز ؔ—

فطرت نے سکھائی تھی ہم کو
افتاد یہاں، پرواز یہاں
گائے تھے وفا کے گیت یہاں
چھیڑا تھا جنوں کا ساز یہاں

اور اسی جنون نے فیض سے ملاقات بھی کروائی تھی۔

اسلام آباد میں کانفرنس ختم ہوئی تو پشاور ہوتے ہوئے لاہور پہنچے۔ فون پر بات تو پہلے ہی ہو چکی تھی۔ اطلاع ملتے ہی فیض اور ایلس ہمارے ہوٹل آ گئے۔ یوں تو ان کی دعوت تھی کہ ہم دونوں اُن کے ہاں

ٹھیریں لیکن ان کا گھر ماڈل ٹاؤن میں تھا۔ شہر سے باہر اور ہم ڈھیر بھر دوستوں سے ملنے کے متلاشی بھی تھے اور اس سے زیادہ خواہش تھی اُن گلیوں اور سڑکوں پر گھومنے کی جو جانی مانی تھیں۔ یوں بھی فطرتاً فیض ظاہری تکلفات سے پرہیز کرتے تھے۔ ہماری معذرت کی وجوہات انہیں معقول لگیں۔

اُن دنوں ہندوستان کی کرکٹ ٹیم بھی لاہور میں میچ کھیلنے گئی تھی۔ ہمارے سفیر کبیر نے ان کے اعزاز میں ہمارے ہی ہوٹل میں ایک دعوت دے رکھی تھی۔ جوں ہی ان کو معلوم ہوا کہ فیض اور ایلیس میرے کمرے میں ہیں تو بہ مع عملہ آ گئے۔ فیض سے پہلے تو ان کی ملاقات نہ تھی لیکن اس بہانے سے ان کا تعارف ہو گیا اور ہم سب تھوڑی دیر میں پارٹی میں جا پہنچے۔ پارٹی تو پرہیزگاروں کی تھی۔ ہر قسم کے کباب تو حاضر تھے لیکن پاکستانی قوانین شراب بندی پر مصر تھے، کافی دیر تک فیض کو کا کولا قسم کے ڈرنکس پر صبر کرتے رہے۔

ماسکو کے بعد فیض سے میری ملاقات کوئی دو برس بعد ہو رہی تھی۔ چہرہ کچھ ڈھلا ہوا تھا اور چال بھی معمول سے دھیمی۔ میں نے ایلیس سے وجہ پوچھی۔ کہنے لگیں، ڈاکٹروں نے قلب کے متعلق وہم میں ڈالا تھا لیکن اب ان کی تسلی ہو گئی ہے اور فیض حسب عادت سگریٹ کی جھڑی لگا رہے تھے؛ لیکن یہ کوئی پہلی دفعہ تو تھی نہیں کہ ڈاکٹروں نے ان کو کچھ "پرہیز نس" کی صلاح دی تھی۔ ماسکو میں بھی ایک دفعہ ڈاکٹروں نے اُن کو ہسپتال میں بند کر دیا تھا۔ یوں تو ان کے لئے وہاں کا قیام اچھا تھا۔ ڈاکٹر زیڈ۔ اے۔ احمد، ہاجرہ بیگم، پی۔ سی۔ جوشی ان دنوں وہیں تھے اور ہسپتال میں ان کی آپس میں خوب جمی تھی۔ ایک دن مجھ سے فون پر کہنے لگے "بھائی صاحب سے ملنے آؤ گے تو ہماری پیاس کا دھیان رکھنا۔" میں نے کہا "غضب کر رہے ہیں آپ۔ ڈاکٹروں نے آپ کو سختی سے منع کر رکھا ہے۔" "ارے بھئی تم بھی خوب ہو، ڈاکٹروں نے مجھے منع کر رکھا ہے آپ کو نہیں۔ اور یوں بھی ڈاکٹر احمد ہرا ماں رہے ہیں لیکن غضب تو یہ ہوا ہے کہ ان کی موت اس وقت آئی جب تقریباً ایک برس سے وہ مکمل پرہیزگار ہو گئے تھے اور لوگ انہیں جو حال ہی میں لندن میں مل کر آئے تھے۔ اِس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ وہ اب پہلے سے زیادہ صحت مند لگ رہے ہیں۔"

اگلے دن شام کو ہم دونوں کھانے کے لئے ان کے گھر پہنچے۔ ایلیس نے صرف اپنی دونوں بیٹیوں اور دامادوں کو بلایا تھا۔ سلیمہ اور منیزہ بہت پہلے بھی آئے تھے لیکن جب وہ بہت چھوٹے تھے۔ اب تو اُن کے بچے بہت پیارے لگ رہے تھے۔ فیض کو تو معلوم تھا کہ میں ہمیشہ سے ہی بوتل سے دور رہتا ہوں لیکن پھر بھی ہندوستانی وہسکی حاضر تھی۔ "ارے!" میں نے پوچھا۔ "یہ کیسے؟"۔ ہم تو سنتے ہیں کہ قانون اب گھروں کے اندر بھی محتسب بھجوا دیتا ہے۔ اور پھر یہ ہندوستانی وہسکی یہاں کیسے پہونچی؟" "ارے سب چلتا ہے میاں ہم اور کون سے حکم مان رہے ہیں جو اس پر پابند رہیں۔"

کراچی میں کسی نے ایک لطیفہ سنایا کہ اکیلے پینا زیادہ خطرناک ہے کیونکہ ضیا صاحب کے راج میں اب دیواروں کے بھی آنکھیں ہوتی ہیں، لیکن بڑی پارٹی میں آسان ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ پارٹی کے سائز کے حساب سے حسب درجہ کسی فوجی افسر کو بھی مدعو

کر دیجئے۔ اس دن بات زیادہ تر سیاسی موضوعات پر ہی رہی۔ بدلتے ہوئے حالات میں ہند پاکستان کے تعلقات روس کی افغانستان میں آمد کا اثر مختلف لوگوں پر مختلف تھا۔ بایاں طبقہ اِس میں خطرہ محسوس نہیں کرتا تھا بلکہ اُن کے نظریے میں یہ سب نہ ہوتا اگر حکومت پاکستان امریکہ کی آلۂ کار نہ بنتی اور اشتمالی انقلاب کو چھوڑنے کی کوشش میں شریک نہ ہوتی۔ ایک اور سوچ زیادہ تھی کہ اس موقع پر پاکستانی پر دگریسو عناصر کو بھارت سے تعلّقات سُدھارنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

ان ہی دنوں فیضؔ بیروت سے لوٹے تھے۔ وہاں کے لوگوں کی بدحالی نے اُن کے من پر گہرا اثر چھوڑا تھا۔ اس زمانے کی نظمیں اس کرب کا اظہار کرتی ہیں۔ اُس شام ہم نے اُن سے "فلسطینی بچے کے نام لوری" سُنی۔

ابھی کچھ ماہ پہلے دہلی میں ہم لوگوں نے مل کر فیضؔ کی ۷۰ ویں جنم دن کا جشن منایا تھا۔ فیض صاحب کے داماد ہاشمی صاحب کہنے لگے کہ اس کا اثر پاکستان کے لوگوں پر بہت گہرا تھا۔ مہینوں لوگ ہندوستان کے لوگوں کی جمہوریت اور لبرل سماج کی باتیں کرتے رہے۔ بہت سے لوگوں نے تو ہندوستانی اس ٹی۔وی کے پروگرام کی کیسٹ بھی بنالی تھی۔ لیکن ہمارے یہاں کی بھی سنئے۔ فیضؔ تو یہاں تھے نہیں۔ یہاں بھی ایک جنم دِن کمیٹی بنائی گئی خبر نکلتے ہی اس کے سب ارکان میرے ساتھ گرفتار کر لیے گئے اور ہم نے جنم دن پرانی انارکلی کے تھانے کے گندے سل میں گزارا اور پھر وہ بتلانے لگے کہ اسی تھانے میں ایک دِل چسپ واقعہ ہوا۔ ہمارے ساتھ نہ جانے کیوں پولیس والے ایک نوجوان مولوی کو بھی پکڑ لائے تھے۔ وہ بے چارہ پریشانی میں بہت رو رہا تھا اور بار بار کہتا تھا کہ میں تو جنرل صاحب کا حامی ہوں مجھے پکڑنے میں کوئی غلطی ہوئی ہے۔ ہم میں سے کسی نے کہا کہ ارے صاحب، ہم سب بھی تو ضیا صاحب کے مدّاح اور حامی تھے۔ لیکن کل رات کچھ فوجی افسروں نے ضیا صاحب کو باہر کر دیا ہے اس لئے اُن کے سب حامی پکڑے جا رہے ہیں۔" باہر کھڑا سنتری سُن رہا تھا وہ بھاگا تھانے دار کو بتانے۔ تھانے دار نے کسی کو فوراً فون کیا۔ جواب میں ڈانٹ پڑی تو ہمارے پاس آکر کہنے لگا۔ "آپ کا یہ مذاق ہم کو تو چوپٹ ہی کرنے والا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ آفیسر مہربان تھا۔ یہ ہماری آخری ملاقات تھی۔ اگلے دِن ہم واپس دہلی آ رہے تھے۔

پچھلے سال میں نے ان کو انبالہ کے مشاعرہ میں شرکت کے لئے لکھا تھا لیکن قلبی دورہ آپڑا، اس لئے یہاں آنے کی بجائے ہسپتال داخل ہو گئے۔ مظہر نے ان کی بیماری کی اطلاع بھیجی اور ساتھ ہی وہ نظم جو انہوں نے میو ہسپتال میں لکھی تھی حسبِ معمول اس میں کرب تھا اور عزم بھی ہے

اس وقت تو یوں لگتا ہے اب کچھ بھی نہیں ہے
مہتاب نہ سورج، نہ اندھیرا نہ سویرا
آنکھوں کے دریچوں کسی حُسن کی جھلکن
اور دل کی پناہوں میں کسی درد کا ڈیرا
ممکن ہے کوئی وہم ہو، ممکن ہے سنا ہو
گلیوں میں کسی چاپ کا اِک آخری پھیرا
شاخوں میں خیالوں کے گھنے پیڑ کی شاید
اب آ کے کرے گا نہ کوئی خواب بسیرا
اِک بیر، نہ اک مہر، نہ اک ربط نہ رشتہ
تیرا کوئی اپنا، نہ پرایا نہ کوئی میرا

مانا کہ یہ سنسان گھڑی سخت کڑی ہے
ہمت کرو جینے کی ابھی عمر پڑی ہے
کرو جینے کی ابھی عمر پڑی ہے۔

فیض کی شاعری میں جہاں کرب کی گہرائی ہے، اس کے ساتھ ہی ہمت اور عزم ہمیشہ امید کی طرف لے جاتے ہیں۔

لمبی قید اور یہ ڈر کہ پھانسی کی سزا نہ ہو جائے اِس رجحان کو کم نہ کر پائے بلکہ ان کی شاعری کو اصل چانٹ لگایا تھا۔

"لمبی ہے غم کی شام، مگر شام ہی تو ہے"

یوں تو راولپنڈی کیس سے پہلے بھی سب کی طرح کئی دفعہ ان پر بھی مایوسی کا درد نظر آتا ہے۔ مگر بہت کم۔

"یہ بزم چراغاں دیتی ہے، اِک طاق ویراں ہے تو کیا"

اور یا ؎

شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں
کیوں آس لگائے بیٹھے ہو

لیکن ان کی شاعری کی خوب صورتی یہ تھی کہ اس دُکھ اور مایوسی کے پیچھے ماحول کے دُکھ درد کی کہانی ہے جسے وہ خوب صورتی سے اپنے میں سمیٹ کر اور نکھار کر پیش کر دیتے ہیں۔ فیض کے اس زمانی اور انقلابی نے ہی ہماری پیڑھی کو ان کی طرف کھینچا تھا۔ اب تو بات بہت پرانی معلوم ہوتی ہے۔ بڑی لڑائی پورے زوروں پر تھی۔ کہنا مشکل تھا کہ آخر میں ہٹلر ہارے گا یا جیتے گا لیکن ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد کو پورا وشواس تھا کہ اس کی تکمیل کی گھڑی آپہونچی ہے۔ میں اس زمانے میں کالج کے آخری دنوں میں تھا لیکن پڑھائی سے بھی زیادہ اُلجھاؤ تھا۔ بائیں بازو کی سیاست کے ساتھ تھا اور اس ناطے ہمیں جیل بندی ہوئی تھی۔ ہم جیسے لوگوں کے سیاسی خواب آزادی کے بھی اگلے پڑاؤ کی سوچتے تھے اسی لئے وقتی سماجی رشتے، ادب اور انقلاب کے باہمی اثرات پر اکثر بحث رہتی تھی۔ اسی زمانے میں ترقی پسند مصنفین کی تحریک بھی ابھر کر سامنے آ رہی تھی۔ نئے لکھنے والوں میں فیض کے خصوصی انداز کا چرچا چل نکلا تھا۔

اچانک ہی ہمارے کالج میں خبر آئی کہ فیض امرتسر چھوڑ کر لاہور ہمارے ہی کالج میں انگریزی ادب کے لکچرر بن کر آ رہے ہیں۔ حیرانی ہوئی کیونکہ نہ صرف ہمارا کالج سرکاری تھا بلکہ ہمارے پرنسپل بھی انگریز تھے۔ لیکن تھے بڑے کھلے دماغ کے آدمی۔ ان کو تحریکِ آزادی کے ساتھ ہمدردی تھی، شاید اسی لئے فیض کے چناؤ میں ان کو کوئی پس و پیش نہ تھا۔ کسی حد تک غائبانہ ملاقات تو تھی ہی۔ تھوڑے ہی دنوں میں ہمارا رشتہ شاگرد، استاد کی حد کو پھلانگ گیا اور ایک لمبی دوستی کی بنیاد پڑی۔ (ADOLESCENCE) میں کئی کھنچاؤ ایک ساتھ نمودار ہوتے ہیں، اور ہم لوگوں کے لئے انقلاب کے کئی معنی تھے۔ اس میں دیش دوستی بھی تھی۔ سماجی رشتوں کو بدل دینے کا عزم بھی تھا۔ نئے قسم کی شاعری (کو نئے موضوعات) سے دلچسپی بھی تھی اور اس پیڑھی میں ہمارے دوست ساحر اور سردار جعفری جیسے ابھی ہونہار دکھا رہے تھے لیکن ان سب چہروں اور رجحانوں میں رومانیت کا عنصر غالب رہتا تھا اسی لئے فیض کی اس وقت کی شاعری ہماری ان تمام جذباتی کشمکشوں کی ترجمانی کرتی تھی اور دل میں اتر جاتی تھی۔ ہمارا کوئی بھی ساتھی یا دوست ہوگا جس کو

• نقش فریادی "یاد نہ ہو یا روزمرّہ کے مشغلوں میں
"مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ"
کی بات نہ کرتا ہو۔

فیض کی مقبولیت کی ایک وجہ ان کی سادہ اور عام فہم زبان بھی تھی۔ اُسی زمانے میں CAUD WELL کی کتاب STUDIES IN A DYING CULTURE شائع ہوئی۔ اس کا پیش لفظ آج بھی یاد آتا ہے جس میں اس نے کہا تھا کہ شاعری ایک رومان بھی ہے کیونکہ اس کا رشتہ زبان اور سماج سے ہے، اس لئے ان کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔ یہی بات فیض نے اپنے ڈھنگ سے پیش کر دی ہے۔

اُسی زمانے میں JOHN FREEMAN کی سوانح حیات NEW TESTAMENT کا بھی چرچا چلا اور اس نے بائیں بازو کے دانشوروں میں ایک NEGATIVE قسم کی ہلچل پیدا کر دی FREEMAN ایک منحرف کمیونسٹ تھے۔ شاعر بھی تھے اس لئے ان کے متعلق رائے میں شدید اختلاف تھا۔ لیکن ان کی زندگی کا ایک واقعہ بڑی خوب صورتی سے بیان کیا گیا تھا۔ اپنے یونی ورسٹی کے دوران ان کی ملاقات ایک خوب صورت لڑکی سے ہوئی۔ جس نے ایک دن ان سے پوچھا۔ "کالج چھوڑنے کے بعد آپ کیا کریں گے؟" "شاعری اور انقلاب" لڑکی کو یہ خیال بڑا خوب صورت نظر آیا لیکن اس نے بہتر یہی سمجھا کہ ابھرتی محبت کو چھوڑ کر کسی خوش حال نوجوان سے شادی کر لی جائے۔ فیض بھی تو "شاعری اور انقلاب" کو اپنا چکے تھے۔ لیکن ان کی قسمت FREEMAN سے بہتر تھی۔

یہ خبر کہ فیض ایک انگریز عورت سے شادی کر رہے ہیں اور وہ بھی انگلستان گئے بنا بڑی عجیب لگی، لیکن اس میں بھی فیض کا انوکھا پن تھا۔ ایلیس اپنی بہن مسز تاثیر سے ملنے امرتسر آئی ہوئی تھیں کہ فیض سے ملاقات ہو گئی۔ ہم خیالی نے پیار کے رشتے کو مضبوط منبسط کر دیا۔ جس زمانے میں فیض لاہور آئے اس وقت تاثیر سری نگر میں پرنسپل ہو کر چلے گئے۔ اس لئے شادی وہاں پر رچائی گئی اور نکاح شیخ عبداللہ مرحوم نے پڑھایا۔ قید کے سالوں میں شیخ صاحب اکثر اس کا ذکر کیا کرتے تھے۔ شادی میں کشمیر نیشنل فرنٹ کے تمام سرکردہ ممبر شامل ہوئے تھے۔ صادق صاحب اور بخشی غلام محمد کے ساتھ فیض کی دوستی اسی وقت شروع ہوئی۔ فیض کو قدرت نے بہت سی نعمتوں سے نوازا تھا۔ لیکن ایلیس جیسی رفیقۂ حیات بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ جس ڈھنگ اور بانکپن سے بیگم فیض نے مشکل کے دن کاٹے ہیں وہ ان کی قابلِ رشک ہمت کا ثبوت ہیں۔ فیض کی جنگ میں شمولیت سے بائیں بازو کے فنکار اور سوچنے والے یہ محسوس کرنے لگ گئے تھے کہ پہلی بات نازی بربریت کو ہرانے والی ہے اور ہٹلر کی فتح کے پس منظر میں کوئی انقلابی اور ترقی پسند طاقت اس اصلیت کو نظر انداز نہیں کر سکتی یہ سوچ فیض اور مظہر علی جیسے حساس لوگوں کو فوج میں لے گئی اور فیض کالج کی نوکری چھوڑ کر دہلی آ گئے۔ میں کالج ختم کر کے کراچی چلا گیا تھا۔ کچھ دنوں کے لئے دہلی آیا۔ اس زمانے میں نئی دہلی بھی کچھ اور تھی رات کو "بلیک آؤٹ" ہوتا تھا اور انڈیا گیٹ کے

اُس طرف تو تھا ہی جنگل۔ فیضؔ صاحب کو گھر ملا تھا لودھی اسٹیٹ میں، رات کو ان کے ساتھ کھانا تو مان لیا لیکن تانگے پر پہنچتے پہنچتے پسینہ نکل گیا۔ اب فیضؔ صاحب کے سامنے دو ہی راستے تھے کہ یا تو مجھے اپنی بوسیدہ آسٹن گاڑی میں واپس پہنچائیں یا رات کے قیام کا انتظام کریں۔ پھر تو پاکستان بن گیا۔ ہم لوگ وطن بدر ہو کر دلی آگئے لیکن فیض واپس لاہور چلے گئے۔ کچھ برسوں تک رشتے معطّل ہو گئے۔ اب فیضؔ کی زندگی کا نیا دَور شروع ہوا۔ میاں افتخار الدین نے "پاکستان ٹائمز" اور "امروز" کا اجرا کیا۔ فیضؔ اور مظہر علی اس کے ایڈیٹر اور جائنٹ ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ یہاں ہم لوگ یہ خبر سُن کر اُن پر رشک کرنے لگے۔ یہاں تو دن رات مکانوں کی الاٹمنٹ اور راشن کارڈوں کی گردش میں کٹتے تھے اور وہ نئے ملک میں نئی قدروں کے رجحان بنا رہے تھے، لیکن نہ ہی ان کی وہ حالت بہت دن رہی اور نہ اپنی۔ ایوب خاں کا راج آیا تو پاکستان ٹائمز اور امروز کو سرکار نے دبوچ لیا، اب بھی وہ سرکاری ٹرسٹ کی ملکیت میں ہیں۔ کچھ ہی دنوں بعد راولپنڈی سازش کیس کا ڈراما رچایا گیا۔ فیضؔ اور سجّاد ظہیر لمبے عرصے کے لئے جیل میں بند کر دیئے گئے۔ تھوڑے دنوں بعد میاں افتخار الدین انتقال فرما گئے۔ اپنے وقت میں بڑے ٹھاٹ کے اِنسان تھے۔ آکسفورڈ میں پڑھتے پڑھتے انقلابی بن گئے۔ واپس آکر پنجاب کانگریس کے صدر جواہر لال جی کے ساتھ ان کا نہایت قریبی رشتہ تھا۔ فیضؔ، محمود علی، منظر علی اور ہم جیسے LEFTIST لوگوں کے ساتھ بہت گہرا تھا فیضؔ کو ان کی موت کا بہت رنج ہوا اور جیل سے انہوں نے ایک دردناک مرثیہ لکھا۔

کر دیجِ جبیں پہ سرِ کفن
مرے قاتلوں کو گماں نہ ہو
کہ غرورِ عشق کا بانکپن
پسِ مرگ ہم نے بھلا دیا

جب ہم لوگوں نے یہاں اس شعر کو سُنا تو ہندوستان کی سیاست ایک نیا موڑ مڑ رہی تھی۔ کانگریس دو حصّوں میں بٹ رہی تھی جس دن اندرا جی کو کانگریس سے نکال دیا گیا تو میں نے ان کو یہی شعر لکھ کر بھیج دیا تھا ان کو بہت بھایا گو ان کو شعر یاد کرنے کی مہارت تو نہ تھی، پھر بھی کئی دفعہ کہہ دیتی تھیں۔

"کیا تھا وہ فیضؔ کا شعر"

فیضؔ کا رشتہ پنڈت جی اور اندرا جی سے بہت قریب کا تھا۔ ۱۹۵۴ء میں جب فیضؔ دہلی آئے تو پنڈت جی نے پوری شام اُن کے ساتھ گزاری تھی ۱۹۷۱ء کے بعد پاکستان میں حالات نے پلٹا کھایا۔ بھٹّو کے دَور میں فیضؔ نیشنل آرٹس کونسل کے ڈائرکٹر بنے۔ دہلی آئے۔ میں ان دنوں انفارمیشن براڈ کاسٹنگ کا منسٹر تھا۔ کہنے لگے۔ "دو کام کردو۔ ایک تو شیلا بھاٹیہ کا مقبول اوپیرا OPERA ہیر رانجھا اور دوسرے اپنے بھائی ستیش گجرال کی تصویروں کی نمائش پاکستان بھجوا دو۔" میں نے کہا۔ "اصولاً تو اعتراض نہیں ہو سکتا، لیکن ہماری بھی ایک شرط ہے کہ آپ دہلی ٹی وی پر اپنا پورا پروگرام نشر کر دیں۔ فیضؔ صاحب نے تو اپنی بات پوری کر دی لیکن نہ ہی شیلا بھاٹیہ کا اوپیرا اور نہ ہی ستیش گجرال پاکستان جا پائے۔ ابھی تعلّقات ہی کچھ ایسے تھے اور دن بدن بھٹّو کے اطوار بدل رہے

سجاد ظہیر ورضیہ سجاد ظہیر میموریل کمیٹی کے جلسے میں (دائیں سے بائیں) پروفیسر نورالحسن (تیسرے) فیض اور اندر کمار گجرال

تھے۔ فیض اس سے مایوس تو ہو رہے تھے لیکن کوشش میں تھے کہ بھٹو اور ان کے مصاحب سامنے والی کھائی کو دیکھیں۔ فیض ان لوگوں میں سے تھے جو محسوس کرتے تھے کہ بھٹو اپنی غلطیوں سے صرف فوجی راج کی واپسی کی راہ ہموار کر رہے ہیں۔ لیکن یہ ہو کر ہی رہا۔

لیکن ہمارے ہاں تاریخ ایک نیا صفحہ الٹ کر ایمرجنسی لے آئی۔ فیض نے سوچا کہ شاید ایمرجنسی صرف بائیں بازو کے زور کو توڑنے کے لئے "لائی گئی ہے" لیکن وہ جلد ہی اس کے تیور سمجھنے لگے۔ جب ملے تو فیض نے کہا۔ "یہ تم نے خوب کیا۔ پاکستان کو جمہوری راہ پر لانے کے بجائے تم لوگ خود ہی ڈھلک گئے۔

جنرل ضیا کا زمانہ آیا تو پھر ماحول میں گھٹن اور دانش وروں کی پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی۔ فیض تو کسی طرح نکل کر ماسکو چلے گئے۔ لیکن ایلیس اور بچوں کو بہت دیر تک اکیلے ہی مشکلوں سے جوجھنا پڑا۔ تب تک ایمرجنسی کے دور نے مجھے بھی ماسکو دھکیل دیا تھا۔ فیض جب ملے تو انہوں نے کہا کہ

"ستم سکھلائے گا راہِ وفا لیے نہیں ہوتا"

اور ان کی نظم "میرے دل میرے مسافر" تو بس دل میں ہی اتر گئی۔ ہم کو تو ان کی وطن بدری کا بہت فائدہ ہوا۔ ہندوستان کا سفارت خانہ ان کا دوسرا گھر تھا اور اکثر شام کو ہمارے ہاں نواز کرتے تھے۔ ایک دن پرانی باتیں بسمل کی نظم سے

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے

کی ہوئی آزادی کی جدوجہد میں اس نے مجاہدوں کی صفوں کو گرمادیا تھا۔ تب فیض نے بتایا کہ اِس زمین پر انہوں نے بھی ایک نظم کہی ہے۔

سرفروشی کے انداز بدلے گئے
دعوتِ قتل پر مقتلِ شہر میں
ڈال کر کوئی گردن میں طوق آگیا
لاد کر کوئی کاندھے پہ دار آگیا
فیض کیا جانے کس آس پر
منتظر ہیں کہ لائے گا کوئی خبر
میکشوں پر ہوا محتسب مہرباں
دلِ فگاروں پہ قاتل کو پیار آگیا

اب تو کئی دفعہ شام کو جب شعر و شاعری کی محفل جمتی تو پاکستان اور بنگلہ دیش کے ڈپلومیٹ بھی ہمیں نوازتے۔ بھارت میں موجودہ پاکستان کے سفیر ہمایوں خاں سے بھی اسی دور میں ملاقات ہوئی۔ فیض کی اردو زبان کو ایک دین یہ بھی ہے کہ انہوں نے اس کو ایک بین الاقوامی زبان بنا دیا۔ روس میں اُن کے بہت سے مداح تھے جن کو فیض کی شاعری نے زندگی کا ایک اور ہی رُخ دکھایا ہے۔ ایک واقعہ ہماری ہندی بھاشا کے چوٹی کے کوی "بچن جی" ماسکو آئے۔ اس شام تو باقاعدہ مشاعرہ ہوا۔ گئی رات تک بچن جی، نئی اور پرانی کویتائیں سناتے رہے۔ فیض اپنی باری بھی خوب صورتی سے نبھاتے رہے۔ اس دن کا ایک شعر آج بھی میرے دماغ میں گھومتا ہے۔

سہل یوں راہ زندگی کی ہے
ہر قدم ہم نے عاشقی کی ہے

ہم نے دل میں سجا لیے گلشن
جب بہاروں نے بے رخی کی ہے
زہر سے دھو لیے ہیں ہونٹ ہم نے
لطفِ ساقی نے جب کمی کی ہے

فیض کے ماسکو کے قیام کے دوران میں ہی ان کو عالم گیر میگزین لوٹس LOTUS کی ایڈیٹری سونپی گئی۔ اس لئے ان کو زیادہ عرصہ بیروت ہی میں رہنا پڑتا تھا۔ اسی اثناء میں ایلیس بھی آگئیں۔ بیروت کی غارت گری کا فیض کی شاعری پر گہرا اثر پڑا۔

چاند پھر آج بھی نہیں نکلا
کتنی حسرت تھی اُن کے آنے کی

یہ جاننا مشکل ہے کہ فیض چپکے سے سو گئے ہونگے یقیناً انہوں نے فرشتۂ اجل سے پوچھا ہوگا۔

لاؤ تو قتل نامہ مرا، میں بھی دیکھ لوں
کس کس کی مہر ہے سرِ محضر لگی ہوئی

لیکن بات ختم کرنے سے پہلے ایک واقعہ کا ذکر ضرور کرنا چاہتا ہوں۔ فیض کی شاعری کو اور سوچ کو نیا موڑ دینے میں محمود الظفر اور رشید جہاں کا بہت ہاتھ تھا۔ انہی دو نے ان کو کوئے یار سے نکال کر کوئے دار کا راستہ سمجھایا تھا۔ میں ابھی ماسکو گیا ہی تھا کہ فیض کا پیغام ملا۔ "رشید جہاں کی قبر پر میری طرف سے بھی پھول چڑھا دینا۔" دسمبر کی برفیلی سردی میں ہم دونوں میاں بیوی نے اُن کی قبر ڈھونڈ نکالی اور وہاں پہنچ کر فیض صاحب اور رشید جہاں یادگاری کمیٹی کی طرف سے ہم نے ہربے کے پھول چڑھائے۔

فیض شاعر تو تھے ہی لیکن ایک پیارے دوست اور خوب صورت انسان تھے۔ یہ خلا کبھی پورا نہ ہوگا۔

اپنے عہد کی آواز — فیض

اردو مرکز اور لندن یونیورسٹی کے زیرِ اہتمام تعزیتی جلسے منعقدہ ۲۳ نومبر ۱۹۸۴ء میں پڑھا گیا۔

پچھلے دنوں موت نے ہم سے اِس دور کا سب سے بڑا افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی اور ہمارے عہد کا سب سے بڑا شاعر فیض احمد فیض چھین لیا۔ اردو نثر اور نظم کی تاریخ میں اس سے ظالم عشرہ کبھی نہیں آیا اور آج جب اپنے محبوب شاعر کی موت پر ہم سب یہاں ایک دوسرے کو پرسا دینے آئے ہیں تو سمجھ میں نہیں آتا کیا کہیں اور کیسے کہیں۔ زرد پتوں کا وہ بن جو ان کا دیس ہے۔ درد کی وہ انجمن جو ان کا دیس ہے، آج اُن کے غم میں بہت اُداس ہے۔ ہر ذی روح کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے اور آخرش اپنے پیدا کرنے والے کی

طرف لوٹتا ہے۔ فیضؔ صاحب اِس طرح جیے جس طرح جینا چاہیے اور یوں شتابی رُخصت ہوئے جس طرح وہ رخصت ہونا چاہتے تھے۔

جس طرح آئے گی جس روز قضا آئے
خواہ قاتل کی طرح آئے کہ محبوب صفت
دِل سے بس ہوگی یہی حرفِ وداع کی صورت
للہ الحمد! بانجامِ دِل دِل زدگاں
کلمۂ شکر بنامِ لبِ شیریں دہناں

میں نے ذہن پر بہت زور ڈالا، کوئی مثال ایسی یاد نہ آئی جہاں لوگوں کو شاعر کے سیاسی مسلک سے ایسا شدید اختلاف رہا ہو اور اس کی شاعری سے ایسا ٹوٹ کے پیار۔ فیضؔ صاحب کا سیاسی مسلک ہمیشہ ہی متنازعہ فیہ رہا۔ ان کی شخصیت اور شاعری ہمیشہ ہر تنازعہ سے بالاتر رہی۔ شاید ہی کوئی شاعر اپنی زندگی میں اِس طرح چاہا اور سراہا گیا ہو۔ جس طرح فیضؔ صاحب اور کون ہے جس نے اپنی زندگی میں نصف صدی سے زیادہ اقلیمِ سخن میں دلوں پر یوں راج رچا ہو، اور اتنی محبتیں اور عقیدتیں سمیٹی ہوں؟

اُردو ادب کی تاریخ میں تین اہلِ قلم ایسے گزرے ہیں جن کی ذاتی شرافت و شائستگی اور عظمت و برگزیدگی ان کی تحریر سے بھی جھلکتی ہے۔ یہ تینوں اپنے مزاج و اقدار کی بلندی، شیرینی اور شائستگی کو اپنے الفاظ میں سمو دیتے ہیں اور اپنے لہجے میں اپنے کردار کا سارا حسن لے آتے ہیں۔ یہ ہیں خواجہ الطاف حسین حالیؔ، رشید احمد صدیقی اور فیض احمد فیضؔ۔ جہاں قول و فعل کو اپنے پیچھے ہانپتا ہوا چھوڑ آئے وہاں حرف اپنی حرمت و تاثیر کھو دیتا ہے۔ خالی ظرف کی طرح لفظ بھی جتنے کھوکھلے ہوتے ہیں اتنے ہی زیادہ بجتے ہیں۔

کچے آنسو، پچھلی آگ
کچا پانی، کچی آگ

حرفِ بے تاثیر بومرینگ کی مانند ہر بار شاعر کے پاس واپس آجاتا ہے جو حرف کسی تجربے اور آدرش کی آنچ پر نہ تپایا گیا ہو وہ کبھی دل میں نہیں اُترتا، یہ بات نہ صناعی سے آتی ہے نہ عروض و ریاض سے شاعری میں فیضؔ کا رشتہ اہلِ قال سے نہیں، اہلِ حال سے ملتا ہے انہوں نے اس رمز کو ابتدائے سفر ہی میں پا لیا کہ حرف کرایا یا نہیں۔ بہر حال میں دو گھنٹے تک حسبِ معمول و موقع، خاموش بیٹھا مزے مزے کی باتوں سے محظوظ ہوتا رہا۔ دوسرے دِن علی الصبح عزیز گرامی افتخار عارف کا فون آیا کہ فیضؔ صاحب آپ کے یہاں آج کسی وقت آنا چاہتے ہیں۔ ہُوا یہ کہ آپ کے جانے کے بعد انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ وہ صاحب جو اپنی بیگم کے پہلو میں سر نہوڑائے، گُم صم بیٹھے تھے وہ کون تھے؟ میں نے انہیں بتایا کہ وہ یوسفی صاحب تھے اور یہ ان کا نارمل پوز اور پرموس ہے۔ فیضؔ صاحب کہنے لگے "تم نے تعارف کیوں نہیں کرایا؟ میں نے کہا فیض صاحب میں تو سوچ بھی نہیں سکتا کہ آپ یوسفی صاحب سے کبھی نہیں ملے۔ کہنے لگے "ہاں کچھ ایسا ہی ہے۔ مجھے بڑی ندامت ہے، صبح ہی مجھے لے چلو۔

میں نے افتخار عارف سے کہا۔ "فیضؔ صاحب سے عرض کر دیجیے کہ آج شام عطار خود حاضرِ خدمت ہو کر اپنے مُشک کا تعارف کروا دے گا۔ جائے واردات وہی مرجعِ خلائق ماجد علی صاحب کا دولت کدہ، شام کو ملاقات ہوئی تو فیضؔ صاحب اتنے محجوب تھے کہ مجھے

فیض صاحب کی سالگرہ کی ایک یادگار تصویر، دائیں سے بائیں عبداللہ، کشور ناہید، فیض صاحب یوسف نادان، حسن رضوی اور سلیم ہاشمی۔

خود اپنے آپ سے شرم آنے لگی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ خود کو اس کوتاہی پر بھی قصوروار ٹھیرا رہے ہیں کہ میری اور ان کی ملاقات پندرہ بیس سال پہلے کیوں نہ ہوئی! فیض صاحب کے اِس انکسار اور حسنِ اخلاق سے میں اِس لئے اور بھی متاثر ہوا کہ مجھے نہ جانے کیوں اب بھی یقین ہے کہ اس وقت تک انہوں نے میری کوئی تحریر نہیں پڑھی تھی۔ سُنی سُنائی تعریف پر ایمان لے آئے تھے۔ بات صرف اِتنی سی تھی کہ وہ کم سخن تھے اور میں حسبِ معمول اپنے خول میں بند اور جب دونوں بزرگ فریق شرمیلے واقع ہوں تو برخوردار افتخار عارف کا طوطی اگر بولے نہیں تو کیا کرے۔

بعض باتیں ایسی ہیں جو فیض صاحب کے مزاج اور مسلک کے خلاف تھیں، مثلاً انہیں کبھی روپے کا ذکر کرتے نہیں سنا۔ اپنی کسی ضرورت کا ذکر کرتے ہوئے نہیں سنا۔ زمانے کی شکایت یا اپنے سیاسی مسلک کے بارے میں نثر میں کبھی گفتگو کرتے ہوئے نہیں سنا۔ کسی کی غیبت اور برائی نہیں سن سکتے تھے۔ کوئی اُن کے سامنے اَدبدا کر کسی کا ذکر بہ بدی کرتا تو وہ اپنا ذہن، زبان اور کان سب سوچ آف کر دیتے تھے۔

ایک دفعہ مجھ سے پوچھا "آج کل کچھ لکھ رہے ہیں یا بینک کے کام سے فرصت نہیں ملتی۔" میں نے کہا۔ "فرصت اور فراغت تو بہت ہے مگر کاہل ہو گیا ہوں۔ پتا نہیں مارا جاتا۔ مطالعہ کی عیاشیوں میں پڑ گیا ہوں اور جب کسی لکھنے والے کو پڑھنے میں زیادہ مزا آنے لگے تو سمجھئے حرام خوری پر اُتر آیا ہے۔" میں بہت دیر تک خود کو اِسی طرح بُرا بھلا کہتا رہا۔ فیض صاحب خاموش سنتے رہے پھر شفقت سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اتنے نزدیک آگئے کہ اُن کی سگریٹ کی راکھ میری ٹائی پر گرنے لگی، کہنے لگے۔ "بھئی ہم کسی کی غیبت نہیں سن سکتے، کسی سے کینہ رکھنا اچھا نہیں۔ اپنے آپ کو معاف کر دیا کیجئے۔ درگزر ثواب کا کام ہے۔"

فیض صاحب کی بارہ مصرعوں کی نظم "بول" کو ان کا عہد نامہ اور THE TESTAMENT OF THE THIRD WORLD کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ یہ نظم آج سے کم و بیش پچاس سال پہلے کہی گئی تھی جب برٹش راج اپنے عروج پر تھا اور زبان کھولنے پر قدغن تھا۔ اس میں ان کے جرّی لہجے کی گونج صاف سنائی دیتی

ایک جذبۂ صادق اور سوزِ دروں ہے جو

حرفِ سادہ کو عنایت کرے اعجاز کا رنگ

اور یہ فیضؔ کے کلام کا اعجاز نہیں تو اور کیا ہے کہ اپنے کلام کو بگاڑ کر پڑھنے کی انتہائی کوشش کے باوجود ان کے چاہنے والوں کو یہ انداز ایسا بھایا کہ آخر کو بھی معیار ٹھیرا۔ ان کا اکھڑا اکھڑا انداز دیکھتے دیکھتے ایک فیشن بن گیا۔ فیض صاحب "چین اسموکر" تھے، میرا مطلب ہے کہ سگریٹ سے سگریٹ ہی نہیں قالین بھی سلگاتے رہتے تھے۔ مصرع اور فقرہ کی سانس ٹوٹ ٹوٹ جاتی، وقفے وقفے سے ایک گھائل سی سسکی بھی سنائی دیتی اور سننے والوں کا پیار سکوتِ سخن میں حلاوتیں گھولتا چلا جاتا۔ کسی کہنے والے نے ازراہِ تفنن نے کہا بھی کہ فیضؔ صاحب نے دراصل اپنے نقالوں کا خانہ مزید خراب کرنے کے لئے تحت اللفظ پڑھنے کی یہ طرز ایجاد کی۔

بات خواہ داغ داغ اُجالے کی ہو یا دریچے میں گڑی صلیبوں کی، نظم کا عنوان " آج کی رات" ہو یا "سرِ وادیٔ سینا"، یا " آج بازار میں پا بجولاں چلو"۔ فیضؔ صاحب کا اصل موضوع اوّل تا آخر انسان کا دُکھ رہا ہے۔ انہوں نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ یہ دُکھ کسی اندھی مشیت کا پیدا کردہ نہیں ہے انسان کے دُکھ کا سب سے المناک پہلو یہی ہے کہ اس کے پیچھے ہمیشہ کسی نہ کسی انسان یا غولِ انسانی کا ہاتھ نظر آتا ہے غالباً یہی اس کا روشن پہلو بھی ہے اس لئے کہ مرض قابلِ علاج و تدارک ہے۔ تیسری دنیا کے دکھ اور اس کے اسباب اور مختلف پہلوؤں پر ان کی بڑی گہری نظر تھی۔ تیسری دُنیا کا اصل دُکھ بھوک اور قحط نہیں ہے۔ تیسری دُنیا کا دُکھ قحط الرّجال بھی نہیں ہے جس کا اتنا رونا رویا جاتا ہے۔ جناب والا! تیسری دُنیا قحط الرّجال کی نہیں، قہر الرّجال کی ماری ہوئی ہے۔

جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں، فیضؔ صاحب کے سیاسی مسلک سے لوگوں کو اختلاف رہا ہے اور میں بھی انہی میں سے ہوں، لیکن آزادی، احترامِ آدمیت اور انسانی اقدار کی پاسداری جس پامردی اور استقامت سے انہوں نے کی وہ لائقِ تحسین و تکریم ہے جس مسلک کج کلاہی کی سمت انہوں نے ایک دفعہ اپنا قبلہ درست کر لیا پھر اُسے تاعمر نہیں بدلا اور اپنے اسی عہدِ وفا میں علاجِ گردشِ لیل و نہار ڈھونڈا اور انہوں نے یہ اس زمانے میں کیا جب مصلحت کدہ میں ایسے لکھنے والوں کا سکّہ چلتا تھا جو ہر کھیل کے بعد اپنے انٹینا ANTENNA کا رُخ بدلتے رہتے تھے بلکہ بعضے تو دوسرے کے "انٹینا" میں اپنا تار جوڑ کے "تماشائے اہلِ قلم دیکھتے ہیں" کتنے ایسے ہیں جو نصف صدی تک ایک ہی وضع پر قائم رہے ہوں؟ بدلتی رُت کے ساتھیوں نے وفاداریاں بدلیں، مسلک بدلے۔ کچھ دُکھیاروں پر تو ایسا جوگ پڑا کہ انہوں نے مارے ڈر کے فقط مشرب ہی نہیں بدلا مشروب بھی بدل دیا یعنی سادہ پانی پی پی کے بہکنے اور لڑکھڑانے لگے۔ برگزیدگی کی تلاش میں نکلے تھے صرف گزیدگی ہاتھ لگی۔ ان کا ضمیر تو کیا صاف ہو گا ان بچاروں کا تو مافی الضمیر تک صاف نہیں۔

فیضؔ صاحب سے میری پہلی ملاقات چھ سال پہلے مخدومی ماجد علی صاحب کے یہاں ہوئی بہت سے نیازمند فیضؔ صاحب کا حلقہ کئے بیٹھے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد نہیں کہ کسی نے فیضؔ صاحب سے میرا تعارف

ہے مدھم مگر مضبوط سُروں کی اٹھان کے بعد وہ اپنی رجز کی لے تیز کر دیتے ہیں۔ ہر چوتھی لائن کے بعد ٹیمپو، (TEMPO) بڑھتا جاتا ہے یہاں تک کہ رجز خواں کے نفسِ گرم کی آنچ محسوس ہونے لگتی ہے اور آخری بند میں اس کے لحن میں عہد عتیق کی بشارتوں کا جاہ و جلال گونج اٹھتا ہے۔

فیض صاحب کی صحت یوں تو کچھ عرصے سے ایسی چلی آرہی تھی کہ ہر مرتبہ یہی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ شاید یہ آخری ملاقات ہو۔ وہ بیمار ہوتے اور ہر مرتبہ لوٹ پوٹ کر کھڑے ہوجاتے۔ چند ماہ پیشتر اپنی بیگم کے ساتھ لندن آئے تو تھکے تھکے ضرور لگے لیکن پہلے سے کہیں زیادہ صحت مند، اُن کی سانس بھی پھولی ہوئی معلوم نہیں ہوتی تھی، نئے سوٹ میں وہ بہت اچھے لگ رہے تھے۔ دیر تک ایک دِل چسپ فلم اور برجو مہاراج کے رقص کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ چند غزلیں اور نظمیں بھی شوق سے سُنائیں۔ آخری زمانے کے اشعار میں ایک تھکن اور ایک اُداسی ضرور جھلکتی ہے مگر مایوسی نہیں۔ موت کا ذکر بھی کبھی کنایتاً اور کبھی کُھل کر ملتا ہے مگر زندگی اور شاعری دونوں میں ان کی طبیعت خود رحمی سے گریز کرتی تھی۔ وہ اپنی موت کا ذکر بھی اس طرح کرتے ہیں جیسے کہ سُنا ہے اگلے وقتوں میں لوگ دُشمن کی موت کا ذکر کیا کرتے تھے یعنی خوش ہو ہو کر۔

پرسوں لاہور میں ان کے سوگواروں نے مٹی کا حق مٹی کے سپرد کر دیا۔ لیکن شاعر فیض کی موت کے ساتھ اُن کا دور ختم نہیں ہوتا۔ شروع ہوتا ہے، بڑے شاعر کی زندگی اُس کی آنکھیں بند ہونے کے بعد شروع ہوتی ہے۔ چشمِ خود بر بست و چشمِ ما کشاد۔

انہوں نے بڑی بھرپور اور شاداب زندگی گزاری وہ دنیا اور اہلِ دُنیا سے کچھ لینے والے نہیں تھے دینے والوں میں سے تھے۔ انہوں نے شاعری کو اپنے دور کے دکھ درد سے آشنا کیا اردو کو ایک نیا لہجہ اور آہنگ بخشا۔ "یادِ ماضی سے غمگیں اور دہشتِ فردا سے نڈھال" لوگوں کو انہوں نے ایک تازہ ولولہ اور جینے کی نئی آس دی۔ سہمے ہوئے لب بستہ انسانوں کو انہوں نے جرأتِ گفتار سکھائی۔

بول، کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول، زباں اب تک تیری ہے
تیرا سُتواں جسم ہے تیرا
بول، کہ جاں اب تک تیری ہے
دیکھ کہ آہنگر کی دکان میں
تند ہیں شعلے، سُرخ ہے آہن
کُھلنے لگے قفلوں کے دہانے
پھیلا ہر اک زنجیر کا دامن
بول، یہ تھوڑا وقت بہت ہے
جسم و زباں کی موت سے پہلے
بول، کہ سچ زندہ ہے اب تک
بول، جو کچھ کہنا ہو کہہ لے

فیض اپنے عہد کی آواز نہیں، بلکہ اُن کا عہد اُن کی آواز بن گیا۔ ہم کتنے خوش نصیب ہیں کہ ہم نے فیض کو دیکھا۔ آیئے ربِّ کریم کا شکر ادا کریں جس نے ہماری نسل کو اِس نعمتِ عظیم سے نوازا اور دعا کریں کہ اُس بے پایاں پیار کے صدقے جو اُن کو اُس کے بندوں سے تھا۔ خداوندِ غفور رحیم اُن کو اپنی مغفرتوں سے نوازے۔

■■

وقفِ حرمان و یاس رہتا ہے
دل ہے اکثر اداس رہتا ہے
تم تو غم دے کے بھول جاتے ہو
مجھ کو احساں کا پاس رہتا ہے

فیض نے اپنی عمر کی اتنی بلیغ اور اتنی جمیل ترجمانی کی ہے کہ اس کی ذات اس کی زندگی ہی میں ایک تحریک ایک ادارے ایک روایت کا مرتبہ اختیار کر گئی تھی۔ اس کے ہم عصر شعراء میں بے شمار ایسے ہیں جن کے ہاں فیض کے نرم لہجے اور ان کی مخصوص لفظیات کی گونج سنی جا سکتی ہے بیسویں صدی میں اقبال اور جوش کے بعد فیض سے زیادہ شاید ہی کسی شاعر نے اپنے معاصرین اور اپنے قارئین کو اس شدت اور گہرائی سے متاثر کیا ہو۔

فیض انسانی معاشرے میں ایک مثبت انقلاب کا داعی تھا تاکہ ایک ایسا معاشرہ تشکیل پذیر ہو سکے جس کی بنیاد عدل و انصاف، مساوات اور انسان کے وقار پر ہو اس انقلابی امنگ کے باوجود اُس کے ہاں انقلابیوں کی سی گھن گرج کی بجائے ایک مترنم سرگوشی کا سا انداز ہے۔ اس نے زندگی کو بھی کے لئے با معنی اور بھرپور اور خوب صورت بنانے کے لئے
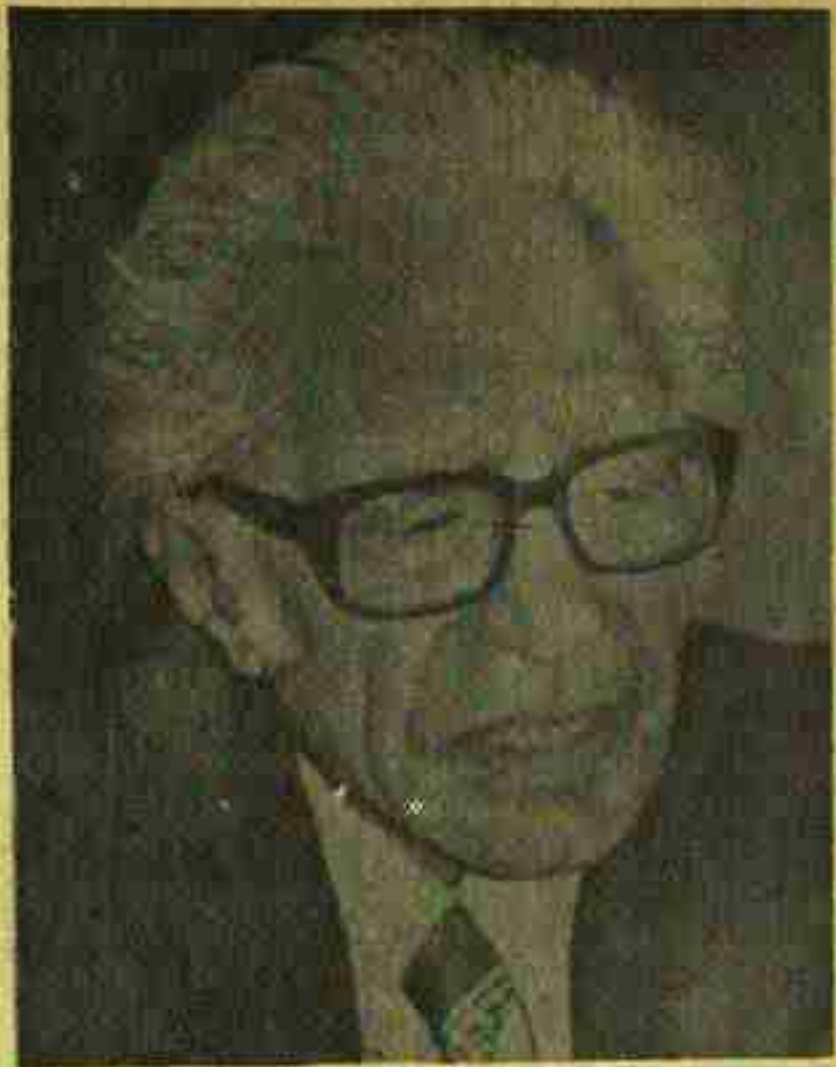
احمد ندیم قاسمی

شاعری کو ایک ذریعہ قرار دیا، مگر مجال ہے کہ اس کے ہاں کہیں بھی پند و موعظیت کی پیوست راہ پاسکے۔ اس کی شاعری پھول کی پتیوں پر شبنم کے اترنے کی مثال ہے مگر اس کے باوجود اس کی کاٹ آہنی ہے۔

دراصل فیض کی سرگوشی قاری اور سامع کے اندر ایک انقلاب برپا کردیتی ہے، انقلاب کے حوالے سے جو شور بلند ہونا چاہئے وہ فیض کی شاعری میں نہیں بلکہ اس کے اثرات میں پوشیدہ ہے چنانچہ فیض کی نغماتی سرگوشی کو اپنے اندر اتارنے جانے والے کے باطن میں جو قیامت برپا ہوتی ہے اس کو فیض کے مثبت انقلاب کی شروعات سمجھنا چاہئے۔

فیض کی شاعری کا آغاز رومان و وجدان میں لپٹا ہوا ہے مگر جلد ہی زندگی کے کڑوے اور تلخ حقائق اس خول کو چٹخا دیتے ہیں اور وہ ذاتی دکھ کے ساتھ ہی عالمِ انسانیت پر مسلط دوسرے بے شمار دکھوں کی جلن

دل رہینِ غمِ جہاں ہے آج
ہر نفس تشنۂ فغاں ہے آج
سخت ویراں ہے محفلِ ہستی
اے غمِ دوست! تو کہاں ہے آج

بھی اپنے اندر محسوس کرنے لگتا ہے، اس کے فن میں محبّت اور حقیقت کا یہ امتزاج وہ وہ جادو جگاتا اور وہ وہ طلسم کاری کرتا ہے کہ اردو شاعری کے کم ہی بڑے نام اس خصوصیت میں فیض کے مقابل لائے جا سکتے ہیں۔ ان دو بڑی قوّتوں کا امتزاج بھی فیضؔ کا اسلوب قرار پاتا ہے۔ یہ امتزاج اتنا متوازن ہے کہ نہ تو فیض کو محبّت کرتے ہوئے اپنے انقلابی نظریات کی قربانی دینے کی ضرورت پیش آئی اور نہ اُس نے انقلابی موضوعات پر نظمیں لکھتے ہوئے۔" اس شوخ کے آہستہ آہستہ کھلتے ہوئے ہونٹوں" پر سے نظریں ہٹا لینے کے گناہ کا ارتکاب کیا۔ اسے عشق اور انقلاب ...... دونوں بہ یکسو یک وقت محبوب رہے اور یوں فیض کا نہ صرف اپنا اسلوب خاص صورت پذیر ہوا بلکہ اس نے اپنے زمانے کے شاعروں کا بھی ایک اسلوب متعیّن کر دیا۔ ماضی میں ساحر لدھیانوی اور حال میں احمد فراز اس کی خوب صورت اور بلیغ مثالیں ہیں۔

فیض بہت پڑھے لکھے شاعر تھے، عالمی ادب کے علاوہ انہیں قرآن وحدیث کا بھی امتیازی علم حاصل تھا۔ انگریزی اور اردو کے علاوہ عربی کے بھی طالب علم تھے، چنانچہ بعض نجی صحبتوں میں وہ اپنے موقف کی تائید میں قرآن کی بعض آیات اور احادیث کے بعض ٹکڑے بے تکان سنا دیتے تھے۔ اس کے باوجود بحیثیت شاعر انہوں نے فکر و حکمت کی گہرائیوں سے شاید شعوری طور پر گریز کیا یا پھر یہ سوچا کہ جب اس دور میں علامہ اقبال فکر و حکمت کی معراج کو چھو چکے ہیں تو اس دور کے کسی دوسرے شاعر کو ذرا سوچ سمجھ کر اس طرف کا رُخ کرنا چاہئے

میں سمجھتا ہوں اگر فیض ایسا نہ کرتے تو اردو شاعری پر دوسرے کئی احسانات کے ساتھ ایک اور احسان بھی کر جاتے، جس طرح غوغائے انقلاب ان کے ہاں مترنّم شعر میں ڈھل گیا ہے اسی طرح وہ فکر شاعری کو بھی فنی جمالیات کا ایک شعبہ بنا دیتے ہیں۔ اگر فیض فکر و حکمت کے مسائل سے (بظاہر شعوری طور پر) گریز نہ کرتے تو ان کی شاعری بیسویں صدی میں غالب کی توسیع ثابت ہوتی کہ غالبؔ ہماری اردو شعری روایت کا پہلا بڑا شاعر ہے جس نے شعور کو بھی شعر میں ڈھال دیا۔

فیضؔ کی ڈکشن کو دیکھئے کہ جس طرح غالب نے اپنے وقت میں اردو غزل کی زبان سراسر بدل ڈالی اور جس طرح اقبال نے اردو شاعری پر زبان کے معاملے میں بھی متعدّد جہات کھول دیں۔ اس طرح کا انقلاب فیض کی ڈکشن میں نہیں مگر فیض اپنی طلسم کاری سے یہاں بھی باز نہیں آیا۔ اُس نے اردو شاعری اور خاص طور پر اردو غزل کی مروّجہ روایتی لفظیات کو اس سلیقے کے ساتھ اور ایسے تیوروں سے استعمال کیا کہ ان لفظوں کے آفاق پھیل گئے، ان کے دامان معانی میں وسعتیں پیدا ہو گئیں اور وہ مروّجہ روایتی مفہوم دینے کے بجائے فیض کے ہاتھ سے تر و تازگی حاصل کر کے نئے مفاہیم سے لد گئے، قاتل، بسمل اور عدو اور دار و رسن اور قفس اور صیّاد وغیرہ وغیرہ ایسے الفاظ ہیں کہ وہ گھس گھسا کر اور پٹ پٹا کر بے معنی ہو رہے تھے مگر فیضؔ کے معجزنما لمس نے انہیں نئی زندگی بخش دی۔

فیض نے خواجہ حافظ شیرازی کی ڈکشن کو اپنی غزلوں میں اتنی استادانہ مہارت سے برتا کہ فارسی کی یہ ساری ترکیبیں

سبھی علامتیں اور تشبیہیں اور استعارے اور پیکر اردو کا سرمایہ بن گئے اور آج قریب قریب اسی ڈکشن فیض ہی کی ڈکشن میں ہو رہی ہیں۔ فیض نے اپنے کمالِ فن سے یہ بھی ثابت کر دیا کہ ایک خاص نقطۂ نظر ایک خاص موقف، ایک خاص نظریہ کی شاعری بھی بلکہ شاعری ہی۔ شاہپارۂ فن ہوتی ہے۔

فیض کو سامراج سے نفرت ہے۔ سرمایہ داری اور جاگیرداری سے نفرت ہے۔ محکومی اور غلامی سے نفرت ہے۔ گنے چنے انسانوں کے ہاتھوں کروڑوں انسانوں کے سفاکانہ استحصال سے نفرت ہے، جبر اور ظلم سے نفرت ہے۔ اتنی بہت سی نفرتیں جب اظہار پاتی ہیں تو شاعری میں چیخوں اور فریادوں سے کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی مگر فیض کے ہاں شور کی کوئی کیفیت ہے ہی نہیں۔ دراصل اِن سب نفرتوں پر فیض کی بنی نوعِ انسان سے محبت آسمان کی طرح چھا گئی ہے۔ یہ ساری نفرتیں فیض کی ہمہ گیر انسان دوستی کی لپیٹ میں آ گئی ہیں اور یوں فیض کی مقصدی شاعری اُس اعلیٰ معیار کی شاعری ہے جس کے علاوہ کوئی اور معیار ابھی تک انسانی ذہن کو سوجھا ہی نہیں۔

فیض اپنا جتنا بھی سرمایہ نسلوں کے سپرد کر گیا ہے وہ اتنا گراں بہا ہے کہ آئندہ صدیوں تک فیض کے فن کی نو بہ نو توجیہات ہوتی رہیں گی اور پڑھنے والے اُس کے کلام کے مطالعے سے کچھ زیادہ ہی مہذب زیادہ منصف مزاج اور باطنی لحاظ سے زیادہ ہی خوب صورت ہوتے رہیں گے۔ فیض کے صرف لہجے اور صرف زبان اور صرف اندازِ بیان پر درجنوں کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔ نقادوں کو صرف اپنے ذاتی اور غیر جانب دارانہ اور غیر متعصبانہ مطالعے کے نتائج کو سمیٹنے کی ضرورت ہے وہ فیض کو بغور اور مکرّر پڑھیں گے تو انہیں محسوس ہوگا کہ ان مترنم لفظوں کے عقب میں ہمارا ماضی بول رہا ہے، ہمارا پورا حال کراہ رہا ہے اور ہمارا پورا مستقبل جگمگا رہا ہے۔

فیض نے پاکستان کو اور تیسری دنیا کو بلکہ پوری دنیا کو فن اور رجائیت اور انسان کے روشن مستقبل پر اعتماد کی صورت میں بہت کچھ دیا ہے۔ اس کے باوجود میں فیض کی رحلت کے بعد بار بار کہہ چکا ہوں کہ فیض کی رخصت سے ہم تہذیبی اور ثقافتی اور فنی لحاظ سے غریب ہو گئے ہیں۔ غریبی کا یہ احساس اس وقت شدت اختیار کر لیتا ہے جب ہم یہ سوچتے ہیں کہ اگر فیض دو چار سال اور زندہ رہ جاتا تو ہماری تہذیب کچھ زیادہ پُرمایہ ہو جاتی اور ہمارا ادبی افق کچھ زیادہ روشن ہو جاتا۔ فیض کے جسدِ خاکی کے زیرِ خاک چلے جانے سے ہمیں اپنے غریب ہو جانے کا احساس ہوتا ہے، ورنہ فیض تو اپنا بہت کچھ لٹا کر ہمیں تہذیبی لحاظ سے بہت امیر بہت باثروت بنا کر رخصت ہوا ہے

■■

▲ فیض احمد فیض اور موجودہ ہندوستانی سفیر برائے ماسکو پروفیسر نورالحسن

کلیاتِ فیض بعنوان "سارے سخن ہمارے" کی رسمِ اجراء کے موقع پر (دائیں جانب سے) ▲ زہرہ نگاہ، افتخار عارف اور فیض صاحب اپنا کلام سنا رہے ہیں

▲ فیض احمد فیض اور ہمایوں گوہر منیجنگ ڈائرکٹر انگریزی ماہ نامہ "ساؤتھ"

(دائیں جانب سے) افتخار عارف، زہرہ نگاہ، اختر اصفہانی اور فیض ▲

▼ ناول نگار عارف رشید مرحوم اور فیض احمد فیض

(دائیں جانب سے) آصف جیلانی، وسیم صدیقی، سوہن راہی، اطہر راز، شہرت بخاری، ہمراز احسن افتخار عارف، فیض احمد فیض، فارغ بخاری، ڈاکٹر ممتاز حسین اور افتخار احمد ▼

فیض

قرب و دوری کا کرشمہ

فیض صاحب نے کہیں اپنے سوویت روس کے دنوں کا ذکر کرتے ہوئے ایک بات لکھی ہے کہ شعر لکھنے کے لئے غالباً محسوسات کی دنیا سے قرب اور دوری، ربط اور علیحدگی دونوں ضروری ہیں۔

شاعری کے بارے میں تو یہ بات سچی اور پکی ہے ہی، مگر فیض صاحب کے یہاں یہ کشف شاعری کی حد تک نہیں ہے ان کے جینے کے طور پر

انتظار حسین
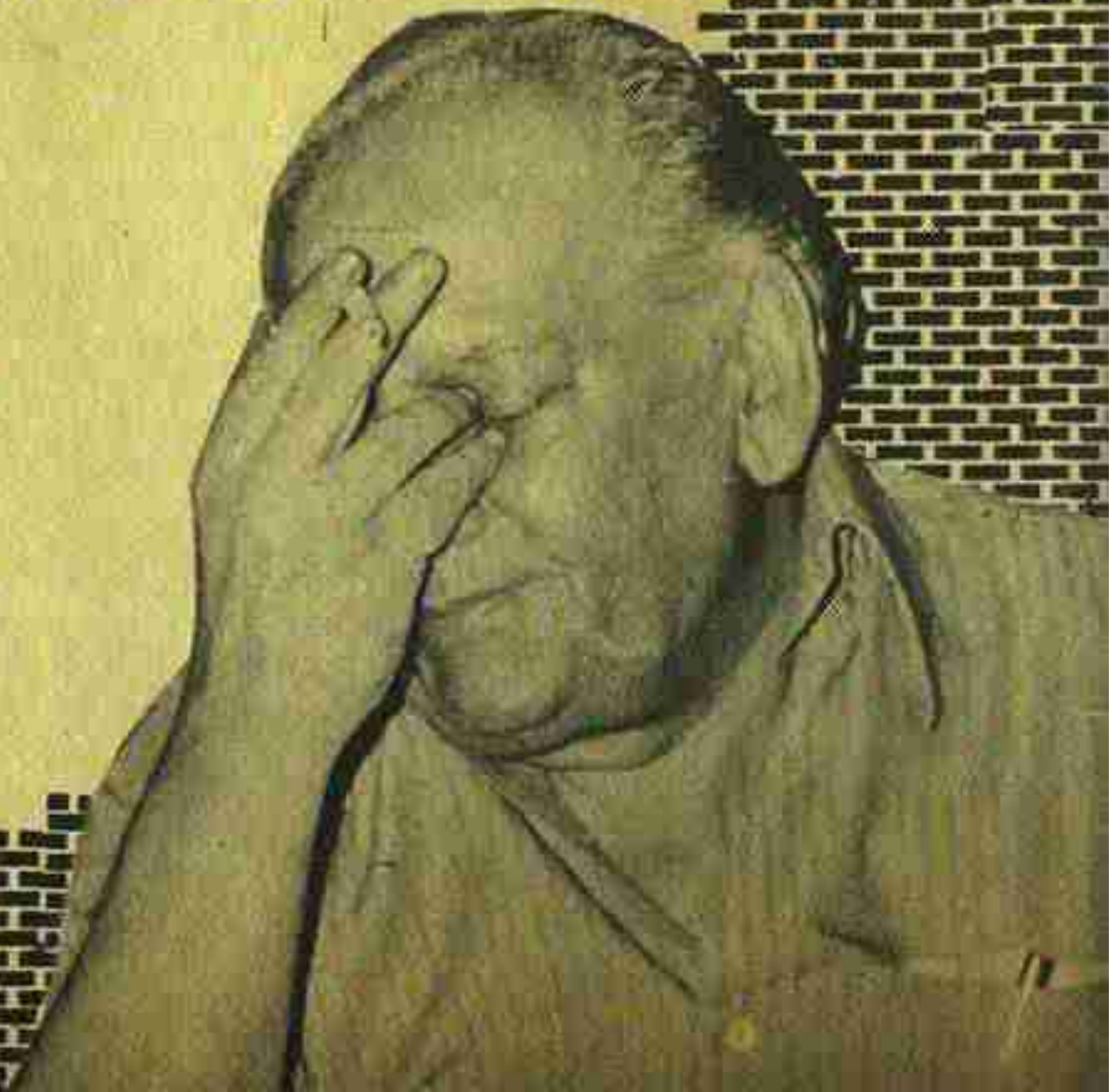
بھی سایہ ڈالتا نظر آتا ہے۔ جینے کے دو طور ہمارے جانے پہچانے ہیں، ایک طور کی انتہا یہ ہے کہ آدمی سگِ دنیا بن جائے۔ دوسرے طور کی انتہا یہ ہے کہ آدمی تارک الدنیا ہو جائے۔ فی زمانہ اس دوسری انتہا تک کون جاتا ہے۔ ادیب اور دانشور لوگ بالعموم اوّل الذکر انتہا کے آس پاس منڈلاتے دیکھے گئے ہیں۔ اب یہ اپنی اپنی قسمت ہے یا سلیقہ اور بدسلیقگی کا معاملہ ہے کہ کسی کو دنیا مل جاتی ہے اور کوئی دنیا کے سارے بکھیڑوں میں پڑ کر بھی دنیا نہیں کما پاتا۔ اپنا ادیب ولدین البتہ گنوا بیٹھتا ہے۔

فیض صاحب نے دنیا سے تعلق رکھا مگر ایک بے تعلقی کے رویے کے ساتھ زندگی کے اس کارگہِ شیشہ گری میں تعلق اور بے تعلقی کا یہ کاروبار بہت ہی نازک ہے۔ مگر فیض صاحب نے سلیقے سے اسے نبھایا جب ہی تو انہوں نے زندگی میں کبھی ٹھوکر نہیں کھائی۔ ورنہ ٹھوکریں کھانا اور خراب ہونا ہمارے یہاں شاعروں کا مقدر چلا آتا ہے۔ میر نے جو ایک بات کہی تھی کہ

کیا جنوں کر گیا شعور سے

وہ تو فیض صاحب نے سب جنون کیے، شاعری کا جنون، انقلاب کا جنون مگر بڑے شعور کے ساتھ۔ بس یہی تعلق اور بے تعلقی کا کرشمہ اُن کی شاعری میں نظر آتا ہے۔ شاعر کبھی تعلق پیدا کرنے کے چکر میں مارا جاتا ہے، کبھی بے تعلقی اسے لے بیٹھتی ہے مگر فیض صاحب نے قرب و دوری، تعلق اور بے تعلقی کا گُر پا لیا تھا۔ ابھی کل ہندوستان کے ٹی۔ وی پر مجروح سلطان پوری یہ کہہ رہے تھے کہ فیض صاحب انقلابی شاعر تھے مگر ان کے یہاں انقلابی نعرہ بازی نہیں تھی، ان کا لہجہ لیڈرانہ نہیں، عاشقانہ تھا۔ بس وہ ترقی پسندوں کے میر تقی میر تھے۔

اچھا ہوا یہ بات فیض صاحب کے ایک ترقی پسند رفیق کی طرف سے آئی ہے، ورنہ اس وقت ایسی بات کہنے پر فتنہ ہو سکتا تھا۔ اور اگر مجروح سلطان پوری کا خیال درست ہے تو پھر یہ اچھا ہی ہوا کہ فیض صاحب کے وسیلے سے ترقی پسند شاعری کی روایت میں میر والی ایک لہر بھی آ گئی۔ یوں شاعری کی کھری روایت سے بھی اس کا کچھ رشتہ قائم ہوا۔

ہوتا یوں ہے کہ کسی سیاسی جوش میں شاعر ہنگام میں کود تو پڑتا ہے مگر ہنگامے سے نکلنا اُسے نہیں آتا۔ بس اسی میں کھیت ہو جاتا ہے۔ جوشِ عشق میں بھی یہی ہوتا ہے کبھی کوئی جوشیلا عاشق اچھی عشقیہ شاعری کرتے ہوئے نہیں پایا گیا۔ وہاں بس INVOLVEMENT ہوتا ہے DETACHMENT نہیں آ پاتا۔ فیض صاحب نے قرب و دوری کی اور ربط و علیحدگی کی حکمت کو پا لیا تھا۔ اپنی اسی بصیرت کی بدولت وہ خالی انقلابی شاعر بننے سے بچ گئے۔ اسی بصیرت کے باعث اُن کا عاشقانہ لہجہ عاشقانہ ہی رہا ہے۔ رقیق القلب رومانیت میں آلود لہجہ نہیں ہوتا۔ ان کے ترقی پسندوں کے ہم عصروں کا لہجہ اونچا تھا۔ کہیں خطیب والی گھن گرج، کہیں رقت کا عالم فیض صاحب خطابت اور رقت دونوں صورتوں سے بچ کر نکل گئے۔ ایک متوازن لہجے کو اپنا فن بنایا۔ ان کے بلند آہنگ ہم عصر جلدی چپ ہو گئے۔ جو بھی جانا چاہیے تھا۔ سٹیج پر آدمی کتنی دیر کھڑا رہ سکتا ہے اور کتنی دیر اونچا بول سکتا ہے۔ فیض صاحب آہستہ بولے اور لمبے چلے کس سلیقے سے اپنی نظریاتی وابستگی اور شعری تجربے میں ایک توازن قائم کیا اور اس نازک توازن کے ساتھ نباہتے ہوئے ایک لمبا تخلیقی سفر کیا۔

■■

قطعۂ تاریخ فیض احمد فیض

خالی رہتی ہے دیکھیے کب تک
ترک تو نے جو کی ہے مسندِ فیض
کل فلک تھا جو زین و زیبِ جہاں
آج ہے زیب و زینِ مرقدِ فیض
ہے معلم کا مصرعۂ تاریخ
"سالکِ علم، فیض احمد فیض"

۱۹۸۴ء

شہاب کاظمی

۱۹ر اور ۲۰ر نومبر کی درمیانی رات

یہ رات عام راتوں سے مختلف رات نہیں تھی۔

جیسی اور راتیں ہوتی ہیں، ویسی یہ رات بھی تھی۔

مگر یہ رات باقی راتوں سے مختلف بھی تھی کہ اپنے پیچھے ہمارے لئے گھرے اندھیرے چھوڑ کر جانے والی تھی، کیوں کہ اس رات ہماری محفلِ ادب کا روشن ترین چراغ جھلملانے لگا تھا۔ اس رات کے بعد جو دو پہر آئی تھی، اس کے چند لمحوں کے اندر اس چراغ کی تھرتھراتی ہوئی لَو ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی تھی۔

چراغ اس محفل سے پہچانا جاتا ہے جس میں یہ جلتا ہے مگر یہ چراغ ہماری محفل کی پہچان بن گیا تھا۔

یہ چراغ صرف پاکستان کا چراغ نہیں تھا۔ بلکہ عالم انسانیت کا چراغ تھا کہ اس کی روشنی جہاں تہاں دنیا کے دُور دُور گوشوں میں پھیل گئی تھی۔

بیسویں صدی اردو کے دو عظیم شاعروں کو کبھی فراموش نہیں کرے گی۔ ان میں ایک علامہ اقبالؔ اور دوسرے فیض احمد فیضؔ۔

ایک نے اس صدی کے نصف اول میں وادیٔ خاموشاں کی طرف رخ کیا تھا اور دوسرا اس صدی کے نصف دوم میں رخصت ہو گیا ہے۔

سیالکوٹ کی سرزمین کو سلام کہ ان دونوں عظیم اور زندہ جاوید شاعروں کا خمیر اسی خاک سے اٹھا تھا۔

سیالکوٹ اپنی خاک پر جتنا بھی ناز کرے بجا ہے۔

علامہ اقبال اور فیض کے درمیان نظریاتی فاصلہ تھا لیکن دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب بھی ہیں کہ دونوں کو انسانیت محبوب ہے۔ دونوں انسان کی سربلندی چاہتے ہیں۔ دونوں کی دلی آرزو ہے کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ جسے انسان کہتے ہیں مسئلہ کا حل بن جائے۔

فیض کی شاعری بڑی خوب صورت، بڑی توانا، بڑی جاندار شاعری ہے۔

فیض کی شاعری زندہ شاعری ہے۔

زندہ رہنے والی شاعری ہے۔

فیض نے اپنی شاعری کے ذریعے پرورش لوح و قلم کی ہے۔

یہ شاعری معجزہ فن بن گئی ہے کہ اس میں شاعر کے خون جگر کی سرخی جھلک رہی ہے۔

فیض بڑا حوصلہ مند شاعر ہے کہ جب اس سے متاعِ لوح و قلم چھین گئی تھی تو اس نے اپنے خونِ جگر میں انگلیاں ڈبو لی تھیں۔

فیض کی شاعری کا تعلق کائنات کی ہر خوب صورت شے سے ہے۔

فیض کی شاعری کا واسطہ ہر بدصورت شے سے بھی ہے کہ وہ اسے بدصورتی سے الگ کر کے خوب صورت بنانے کا آرزومند ہے۔

ایک بڑا شاعر ہئیتی تجربوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتا وہ جو کچھ کہتا ہے، کلاسیکی انداز سے کہتا ہے۔ اور اس کی آواز ہزاروں لاکھوں دلوں کی گہرائیوں میں گونجنے لگتی ہے۔

فیض ایک ایسا ہی بڑا شاعر تھا۔ اس نے ہئیتی تجربوں کی بجائے ہماری شاعری کی کلاسیکی علامتوں کو نئے مفاہیم دیئے ہیں۔

انتہائی خوب صورت تشبیہات دی ہیں۔ انتہائی دلآویز استعارے دیئے ہیں۔

فیض جن عظیم شاعروں کی برادری کا ایک فرد ہے ان میں سے ایک نے کہا تھا۔

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

اس شاعر نے یہ بات اپنے دور کی کسی شخصیت کے بارے میں کہی تھی۔ مگر آج ہم یہ فیض کے متعلق بھی کہہ سکتے ہیں۔

فیض احمد فیض کا نام جب بھی ہماری زبان پر آئے گا ہمارا نطق ہماری زبان کو ضرور بوسے دے گا۔

فیض کل تک ہمارے درمیان مسکرا رہا تھا۔ بول رہا تھا۔ رونق محفل تھا، جان محفل تھا۔

وہ بہت کم گو تھا۔ مگر آج تو اس نے ہمیشہ کے لئے چپ سادھ لی ہے۔ ہم اس کی آواز سننے کے لئے ترس ترس جائیں گے۔

کہاں ڈھونڈیں گے اسے
کہاں پائیں گے اسے

مگر ہمارے لئے اطمینان کی ایک صورت موجود رہے گی۔ فیض نے انسانیت کے طاق پر محبتوں کے چراغ جلائے ہیں، جلاتے رہے ہیں۔ لیکن آج وہ خود ان چراغوں کی روشنی بن گیا ہے۔ اور یہ روشنی تابد رہے گی۔

فیض احمد فیض

پیر علی محمد راشدی

کشمیر کے پہاڑوں میں پھرا تو دو بوٹیاں نظر آئیں۔ ایک کا کام تھا خارش دینا اور دوسری کا کام تھا خارش کو رفع کرنا۔ اثر دونوں کا متضاد تھا مگر دونوں ایک ہی زمین سے اُگی تھیں اور پہلو بہ پہلو لہلہاتی رہتی تھیں۔

جس مستبد دنیا کا شغل ہو انسانی حقوق تک ہر چیز کو آنکھیں بند کر کے کھانا اور ہضم کر جانا اور جس دنیا میں ہر سو انسانی زبان سے صرف زنجیروں کی جھنکار ہی سنائی دے رہی ہو وہاں انسان کی اشک شوئی کے لئے فیض سے تھا جن کا کام تھا زخمی دلوں کے لئے مرہم فراہم کرنا۔ مایوسیوں اور محرومیوں کے مارے انسانوں کے سامنے اُمیدوں کی جوت جلائے رکھنا۔ مظلوموں اور ستم رسیدوں کی اشکوں کی لڑیوں کو اشعار کے دھاگے میں پرو کر سنبھال رکھنا تاکہ مستقبل کے مورّخ کے سامنے بیسویں صدی کے انسان کے خلاف انسان کی ستم کوشیوں کا ریکارڈ رہے۔ اور سب سے بڑی بات محزوں اور دل گرفتہ انسانوں کو ڈھارس دینا کہ :

ہے اگر ابھی اندھیرا تو کبھی سحر بھی ہوگی

کے فیض کی آبشاروں کا موجزن رہنا قدرت کردگار کا ہی کرشمہ ہو سکتا تھا۔ رات کی تاریکیوں کے ہوتے ہوئے اگر صبح کی آمد کا یقین نہ ہوتا تو انسان کا دل پھٹ جاتا اور اگر وہ مایوس ہو کر خودکشی کر لیتا مار گزیدہ کے لئے تریاق کا انتظام نہ ہوتا تو دنیا میں سانپوں کا ہی راج ہوتا اور غالباً انسان ایک نہیں دکھائی دیتا۔ یہ قدرت کا انتظام ہے بلکل دا ہِ دوا۔ ہر فرعونِ را موسیٰ جہاں انسان کو رُلانے والے بہت ہوں وہاں قدرت کچھ آنسو پونچھنے والوں کی موجودگی کا بندوبست کر رکھتی ہے۔ فیضؔ قدرت کے اُن چُنے ہوئے انسانوں میں

یا بقولِ ایازؔ سندھی :

”بیاباں سے ابھی طاؤس کی پکار سُنائی دے رہی ہے، سُنی جا رہی ہے۔ یہ نہ سمجھنا کہ مور مر گئے ہیں۔“

فیضؔ کا سب سے بڑا کمال تو یہ تھا کہ جو کچھ خود اُس پر بیتی اِس کے باوجود اُس کی انسان سے محبت ٹوٹی نہ وہ اس کی پیدائشی اچھائیوں سے مایوس ہوا، نہ اُس کو کوئی دُکھ دیا۔ محبت اور انسان دوستی اس کا عقیدہ تھا اور وہ کسی حال میں اس سے منحرف نہیں ہوا۔ نیکی کُن بہ دریا افگن، اس کی زندگی کا اصول رہا۔

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

رات کی گھٹا ٹوپ تاریکیوں میں بھی ہمیشہ اُس شخص کو صبحِ اُمید کی کرن نظر آتی رہی۔ اُس کا عقیدہ تھا کہ جلد یا بدیر کبھی نہ کبھی انسان، انسان بن ہی جائے گا۔ آخر کیا کچھ اس کی اپنی ذات پر نہیں گزری؟ یہ قصۂ دل گداز اب چھیڑنے کا نہیں۔ مختصراً سارا عرصہ اس کے ساتھ "مہ نورمی نشاند سگ بانگ می زند" کی کیفیت رہی مگر اُس کے اپنے مزاج میں کوئی فرق نہیں آیا۔ میرا خیال ہے کہ ایک زمانہ آئے گا جب فیض کے ساتھ جو کچھ سلوک ہوا اس کو دیکھ کر اس کے دور کی تاریکیوں، انسان کی بے رحمیوں اور جراحت کاریوں اور مقابلتاً بعض قدسی نفس اشخاص کی سخت جانی اور ان جراحتوں کی برداشت کرنے کی صلاحیتوں کا لوگ اندازہ لگائیں گے۔ خود آج کل ہی ہم کیا کچھ دیکھتے رہے؟ وہی لوگ جنہوں نے اُس پر زیادتیاں کیں وہ اُس کی موت پر رونے والوں میں پیش پیش نظر آتے رہے۔ یہ اور بات تھی کہ:

بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے

اب سمجھ میں آرہا ہے کہ اپنی نجی زندگی میں خود فیض نے کیوں کبھی اُن کی شکایت نہیں کی۔ وہ ان کو معذور اور بے قصور سمجھتے تھے۔ بُوم کی آواز پر سر دُھننے والے بُلبُل کے بول کیا سمجھتے؟ چند ستانیوں کو جو ساری عمر چمند کے سوراخ میں رہ چکے ہوں۔ کیا پتہ کہ سُوراخ کے باہر گلشن کی آزاد اور تازہ ہوائیں کس قدر نشاط انگیز اور پُرکیف ہوتی ہیں۔

پھر حساب لگائیں فیض نے انسان سے کیا مانگا؟
اور اس کو دیا کیا؟

مانگا صرف اتنا کہ کوئی انسان بھوکے پیٹ نہ سوئے۔ دنیا میں امن اور انسان دوستی کا دور چلے۔ انسان بے انصافیوں، تشدد، استبداد کا ہدف نہ بنے اس کا احترام ہو، اس کو اس کے بنیادی حقوق میسّر ہوں۔

اور دیا کیا اِس تلاش اور تگ و دو میں۔

زندگی کی وہ جملہ نعمتیں جن کا حصول اکثر انسان نے اپنا مطمحِ حیات بنایا ہوا ہے اور جن کو حاصل کرنے کے لئے بعض لوگوں کو تو اپنا ضمیر تک بیچ کر خسرالدنیا والآخرۃ خریدنا پڑتا ہے۔

اور فیض کے اس دعوے کی اب کون تصدیق نہیں کرے گا کہ

وہ جو قرض رکھتے تھے جان پر وہ حساب آج چکا دیا

فیض کی ایک اور دلفریب خصوصیت اس کی معصومیت تھی۔ انتہائی کرب میں لبوں پر مسکراہٹ جیل کی بیڑیوں اور زنجیروں کی جھنکار میں چہرے پر اطمینان کے آثار، دوستوں کی بے وفائیوں اور دشمنوں کی کارفرمائیوں کے باوجود

ملامت میکند خلق و من بر دار می رقصم

کا نعرہ قلندری لگاتے رکھنا اور ان صبر آزما صعوبتوں کو جھیلتے ہوئے بھی کسی طرف دل میں تکدر نہ لانا یہ صرف فیض جیسے بڑے انسان کا ہی خاصہ ہو سکتا ہے۔ چھوٹا موٹا آدمی تو ان امتحانوں میں موم کی طرح پگھل ہی جاتا۔

فیض کا یہ کوئی بڑا اعجاز نہیں تھا کہ اس نے اپنے کلام سے غزل کی صنف کو ایک نیا اسلوب عطا کیا۔

غزل تو دنیا میں بہتوں نے لکھی ہیں، لکھ رہے ہیں اور لکھتے رہیں گے۔ اصل بات یا فیض کا حقیقی اعجاز یہ تھا کہ اس نے شعر کو گُل اور بلبل کے جھگڑوں سے چھڑا کر انسانیت کی خدمت، بے زبانوں کو زبان دینے اور پابندیوں کو آزادی سے ہم کنار کرنے کے لئے تیر و سناں کی طرح استعمال کیا۔

جوش کے بعد فیض کا جانا ایک بڑا حادثہ ہے جس کی تلافی ہونا ناممکن ہے۔ بہرحال بے زبانوں کی زبان کو سمجھنے اور انسانی دل کی دھڑکنوں کی شرح کرنے والے جو باقی دو تین رہ گئے ہیں خدا اُن کو ہر بلا سے محفوظ رکھے تاکہ جوش اور فیض کا کام جاری رہے۔ یعنی یہ جناب یہ فراز یہ انعام درانی رہ ہی کتنے گئے ہیں۔

●●

سوم آنند

فیض احمد فیض

لاہور میں

بیس نومبر کی شام کو جب ریڈیو پر سنا کہ "نقشِ فریادی" اور "دستِ صبا" والے فیض انتقال کر گئے تو ایک دھچکا سا لگا اور محسوس ہوا جیسے اندر کچھ ٹوٹ گیا ہو۔ ذاتی طور پر فیض صاحب سے میری بہت زیادہ واقفیت نہیں تھی۔ وہ مجھے اس قدر جانتے تھے کہ ان کے دلی آنے پر اگر کسی محفل میں ملاقات ہو جاتی تو وہ پوچھ لیتے "کہو بھئی کیسے ہو"۔ ان سے زیادہ سوال جواب کرنے کی جرأت مجھے کبھی ہوئی نہیں۔ نہ ہی میں نے انہیں کسی جگہ بہت زیادہ بولتے سنا۔ مگر ذاتی طور پر بہت زیادہ نہ جاننے کے باوجود مجھے اور میرے جیسے بہت سے پنجابیوں کو جو تقسیم کے بعد لاہور سے آتے تھے وہ بالکل گھر کے آدمی معلوم ہوتے — اسی لئے فیض صاحب کے انتقال کی خبر سن کر محسوس ہوا کہ لاہور سے اور پاکستان سے ہمارا یہ رشتہ بھی ٹوٹ گیا۔

یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ فیض صاحب جب بھی پاکستان سے آتے تو کبھی یہ احساس نہ ہوتا کہ کوئی غیر ملکی آیا ہے۔ یہ بات ہم غالباً پاکستان کے کسی اور ادیب یا شاعر کے متعلق نہیں کہہ سکتے۔ یوں تو سرحد پار سے آنے والے بہت سے ادیب بہت محبت جتاتے اور کسی ایک کا تو حلقۂ احباب یہاں اتنا وسیع ہے کہ معلوم ہوتا کہ وہ یہاں کے ہی رہنے والے ہیں۔ مگر فیض صاحب کی بات دوسری تھی۔

وہ کبھی اعلانیہ محبت نہ جتاتے مگر سب ہی اپنے معلوم ہوتے۔ ان کے مزاج کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ کبھی ڈھول نہیں پیٹتے تھے چاہے وہ عشق کا معاملہ ہو، سیاسی نظریات کا عمل ہو یا ادب کا کوئی مسئلہ ہو وہ اپنی بات ہمیشہ دھیمے سُروں ہی میں کہتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بات دل میں اترتی تھی اور اس کا اثر ہوتا تھا۔

فیض صاحب نے جب لاہور کے مشاعروں میں اپنا کلام سنانا شروع کیا تو شہر میں بڑے بڑے جغادری ادیب اور شاعر موجود تھے۔ ان کے سامنے کسی نو آموز کے لئے اپنی شاعری کی دھاک جمانا کچھ آسان نہ تھا۔ مگر یہ ڈگر گوہر شناس بھی تھے اور یہی وجہ ہے کہ فیض صاحب نے جب لاہور گورنمنٹ کالج کے مشاعرے میں پہلی بار اپنا کلام سنایا تو پطرس بخاری مرحوم ہونہار بروا کو فوراً پہچان گئے۔ لاہور میں ان دنوں پنجابی ادیبوں اور شاعروں کا غیر رسمی سا حلقہ تھا جو نیاز مندان لاہور کے نام سے مشہور ہوا۔ اس حلقے کی لیڈری تو بخاری صاحب

کے ہاتھ میں تھی مگر اس کے دوسرے ارکان بھی اپنے اپنے میدان میں کسی سے کم نہیں تھے —— پنڈت ہری چند اختر، حفیظ جالندھری، صوفی تبسم، امتیاز علی تاج وغیرہ - ان حضرات کا کام پنجابی ادیبوں پر اہلِ زبان کے اعتراضات کا جواب دینا تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ فیض صاحب اس حلقے کی سرگرمیوں میں شریک ہوتے تھے یا نہیں مگر اس کے بیشتر ارکان سے ان کے اچھے مراسم تھے

دلچسپ بات یہ کہ اہلِ زبان کے اعتراضات سے تو فیض بھی نہ بچ پائے اور یہاں تک کہا گیا کہ یہ تو شاعری نہیں ہے - خیر فیض کی وابستگی نیاز مندانِ لاہور سے کیسی بھی رہی ہو وہ ان وقتوں کی نشانی تھے جب ایسے قلم آور ادیبوں کی وجہ سے لاہور کا نام سارے ہندوستان میں مشہور تھا اور یہ شہر ایک ایسے کلچر کی نمائندگی کرتا تھا جس کی دل فریبی اور رنگا رنگی ۱۹۴۷ کے طوفان کی نذر ہو گئی -

میں ابھی نویں دسویں جماعت میں ہی تھا کہ فیض صاحب کے پہلے مجموعۂ کلام "نقشِ فریادی" کا شہرہ سُنا. خاص طور پر ان کی نظم "مجھ سے پہلی سی محبت میری محبوب نہ مانگ" زبانِ زد تھی - یہ وہی زمانہ تھا جب ساحر لدھیانوی کی کتاب "تلخیاں" کا پہلا ایڈیشن چھپا اور یونیورسٹی کے لڑکے لڑکیاں ان کی نظم "تاج محل" کے تراشے جیبوں میں لئے پھرتے تھے —— پنجاب والوں کا مزاج کچھ ایسا ہے کہ وہاں نئے خیالات کی پذیرائی زیادہ گرم جوشی سے ہوتی رہی ہے، چاہے وہ سر سیّد کی تحریک ہو، محمد حسین آزاد کا غیر طرحی مشاعرہ ہو یا ہمارے زمانے کی ترقی پسندی ہو - لاہور کے ادبی حلقوں میں ساحر جس تیزی سے مقبول ہوتے اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اَدبی ذوق رکھنے والے گل و بلبل کی داستان کے بعد کچھ اور سُننے کے لیے کتنے بے تاب تھے -

اِس سے پہلے فیض صاحب "نقشِ فریادی" کی نظموں سے اپنی دھاک بٹھا چکے تھے، مگر وہ بہت کم گو تھے اور یہی وجہ ہے کہ ان کا پہلا مجموعہ چھپنے کے بعد لوگ انہیں کچھ بھول سے گئے تھے - ترقی پسند مصنفین کے جلسوں میں بھی وہ کبھی کبھار ہی آتے، اور نہ ہی میں نے انہیں اس زمانے کے کسی مشاعرے میں دیکھا یہ وہ زمانہ تھا جب مجھ جیسے افراد اَدب اور سیاست میں ترقی پسند نظریات سے ایسے متاثر ہوئے جیسے دیسی شراب کا نشہ اثر کرتا ہے اس ماحول میں اَدب اور نعرے بازی کا فرق کچھ مِٹ سا گیا تھا - یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں کچھ ایسا محسوس ہوتا جیسے فیض "بورژوا" قسم کے شاعر ہیں جو نیچے کی سطح پر آنا پسند نہیں کرتے -

اس وقت تک میں نے بہت قریب سے اُردو کے صرف ایک ہی شاعر کو دیکھا تھا، یہ تھے حفیظ جالندھری —— میرے ایک ہم جماعت کے گھر حفیظ صاحب سے ہفتے میں تقریباً ایک دو بار ملاقات ہو جاتی: وہاں میں ان کی باتیں سنتا اور شعر بھی - اب جن لوگوں نے "شاہنامۂ اسلام" کے شاعر کو دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ ان کا اندازِ گفتگو کیا تھا. بات چیت کے دوران وہ اس طرح مونہہ بناتے، ہاتھ چلاتے اور آواز میں زیر و بم پیدا کرتے کہ معلوم ہوتا کہ ڈرامہ کر رہے ہیں - اس میں شک نہیں کہ حفیظ صاحب

بہت بڑے ایکٹر تھے اور مشاعروں میں ان کی مقبولیت کا ترنم کے علاوہ ' ایک راز یہ بھی تھا ــــ حفیظ صاحب کو نجی محفلوں میں اس انداز میں باتیں کرتے دیکھ کر میرے ذہن میں یہ تاثر قائم ہوا کہ اردو کے شاعر ایسے ہی ہوتے ہیں۔ یہ تاثر اس وقت تک قائم رہا جب تک میں نے فیض صاحب کو نہ دیکھا ــــ دلچسپ بات یہ ہے کہ فیض صاحب کو جب میں نے پہلی بار دیکھا تو وہ حفیظ جالندھری کے پاس بیٹھے تھے، اور دونوں شخصیتوں کا فرق ایک دلچسپ تفاوت پیدا کر رہا تھا۔

خیر یہ تو بہت بعد کی بات ہے اس سے پہلے فیض صاحب راولپنڈی سازش کیس اور "دستِ صبا" کی اشاعت کے باعث سارے برِصغیر میں مشہور ہو چکے تھے ملک کی تقسیم کے وقت وہ "پاکستان ٹائمز" کے ایڈیٹر تھے۔ یہ بات آج بھی کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہے کہ اردو کا شاعر انگریزی اخبار کا ایڈیٹر ہو۔ مگر انہوں نے اپنے کیریر کی ابتدا ہی انگریزی کے استاد کی حیثیت میں کی تھی۔ اس طرح انگریزی ادب پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ یہ بات بھی یاد رکھنے والی ہے کہ فراق کے بعد فیض ہی اردو کے ایک ایسے شاعر تھے جن کی نظر انگریزی ادب پر اتنی گہری تھی، اس کے باوجود ان کا لہجہ کلاسیکل شاعروں جیسا تھا۔ ان کی سب تشبیہیں، استعارے اور علامات کلاسیکل شاعری سے لی گئی تھیں۔ یہ ہی بات ترقی پسندوں میں بھی فیض صاحب کو ممتاز کرتی ہے۔

میں بات کر رہا تھا تقسیم کے وقت کی۔ پاکستان کے ابتدائی دنوں میں فیض صاحب "پاکستان ٹائمز" کے ایڈیٹر تھے اور ٹریڈ یونین فیڈریشن کی لیڈری بھی کرتے تھے۔ یہ بات بھی کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہے کیونکہ لیڈروں والی بات تو ان میں کبھی تھی ہی نہیں جنہیں شاعر ہونے کے علاوہ انگریزی اخبار کے ایڈیٹر کے طور پر بھی انہوں نے اپنی حیثیت منوائی ــــ ان کی انگریزی نثر کتنی پُر تاثیر تھی، اس کا اندازہ مجھے اس اداریہ سے ہوا جو فیض صاحب نے پاکستان ٹائمز کے لئے مہاتما گاندھی کی شہادت پر لکھا ــــ تقریباً سال بھر بعد ہی راولپنڈی سازش کیس میں وہ پکڑے گئے اور اس دوران جیل میں انہوں نے جو شعر کہے ان سے بطور شاعر کے ان کی شہرت کا دوسرا دور شروع ہوا ــــ اس زمانے کے کلام کا پہلا مجموعہ (دستِ صبا) سب سے پہلے ۱۹۵۲ء میں میرے دوست عبدالرؤف نے شائع کیا۔ عبدالرؤف کے فیض صاحب سے بڑے قریبی تعلقات تھے، اور اس نے انہیں بطور کامریڈ کے، دوست کے اور پبلشر کے دیکھا "دستِ صبا" جب چھپی تو اس وقت فیض صاحب تو جیل میں تھے ہی، عبدالرؤف اور اس کے ساتھیوں کے لئے بھی وہ بڑی مصیبت کا زمانہ تھا۔ خفیہ پولیس والے سائے کی طرح پیچھے لگے رہتے اور سرکاری مشینری اس بات کی پوری کوشش کرتی کہ نہ تو ان لوگوں کا کاروبار جمے اور نہ ہی انہیں چین کا کوئی لمحہ نصیب ہو۔ ایسے وقت میں عبدالرؤف کے لئے فیض صاحب کی بیگم ایلس فیض سے رابطہ قائم رکھنا اور مجموعے کی اشاعت کے لئے فیض صاحب سے خط و کتابت کرنی جان جوکھوں کا کام تھا۔ ان مصیبتوں کے باوجود اس نے

بڑی ہمت سے کتاب کی اشاعت کا کام جاری رکھا۔ مگر "دستِ صبا" بڑا ہی چھوٹا سا مجموعہ تھا، اور ایک ناشر کی حیثیت میں عبدالروف بار بار سوچتا کہ کتاب کچھ تو بڑی ہونی چاہیئے۔ یہ بات وہ فیض صاحب کو لکھتا تو وہ کہتے کہ بھائی ادب اور شاعری کو تول کر نہیں دیکھا کرتے۔

کتاب کی ضخامت کچھ بھی تھی اس نے فیض صاحب کی شہرت کو ہندوستان اور پاکستان میں اس بلندی پر پہنچا دیا کہ اردو کے بہت کم شاعروں کو یہ مقام حاصل ہو سکا ہے۔ "دستِ صبا" کی بہت سی نظمیں اور غزلیں تو اب بھی لوگوں کو زبانی یاد ہیں۔

اسی زمانے میں جب کہ فیض صاحب ابھی جیل میں ہی تھے، میں نے روزنامہ "امروز" کے لئے (جو کہ پاکستان ٹائمز کے ہی ادارے کا اخبار ہے) ایک کالم لکھنا شروع کیا۔ ان دنوں میں سال میں ایک دو بار لاہور کا چکر ضرور لگتا تا ــــ ایک بار وہاں جا کر معلوم ہوا کہ فیض صاحب رہا ہو چکے ہیں میں "امروز" کے دفتر گیا تو دیکھا کہ ایڈیٹر کے کمرے میں ادیبوں شاعروں کی محفل جمی ہے، اس میں فیض بھی تھے اور حفیظ بھی۔ فیض صاحب کو تو میں نے وہاں پہلی بار دیکھا مگر حفیظ صاحب کو اچھی طرح سے جانتا تھا۔ وہ خود لہک لہک کر اپنے مخصوص انداز میں باتیں کر رہے تھے اور لطیفوں و چٹکلوں کے درمیان کبھی اصحاب کو پنجابی طرز کی موٹی موٹی گالیوں سے بھی نواز رہے تھے۔ فیض صاحب بالکل خاموش تھے اور حفیظ صاحب کے لطیفوں و چٹکلوں کے جواب میں صرف مسکرا دیتے۔ اس وقت مجھے اچھی طرح سے احساس ہوا کہ اُردو کے دو شاعر اس قدر مختلف بھی ہو سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ فیض صاحب شاعر تو لگ ہی نہیں رہے تھے، وہ سوٹ اور ٹائی میں ملبوس تھے اور نوک پلک سے ایسے درست تھے کہ مجھے ان پر بینک کے منیجر ہونے کا بھی دھوکہ ہو سکتا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس جگہ وہ "پاکستان ٹائمز" اور "امروز" کے ایڈیٹر کی حیثیت سے تھے اور اسی لئے اپنے مرتبے اور جگہ کا لحاظ کرتے ہوئے انہوں نے بڑا معقول لباس زیبِ تن کر رکھا تھا اس نشست کے بعد میں فیض صاحب سے ان کے کمرے میں بھی ملا۔ میرے کالم کا معاوضہ ہندوستانی کرنسی میں ادا کرنے کا معاملہ کچھ پیچیدہ ہو گیا تھا۔ اور وہ چونکہ اب چیف ایڈیٹر کے طور پر واپس آ گئے تھے اس لئے ان سے بات کرنا ضروری تھا ــــ یہ ملاقات میرے لئے بڑی مایوس کن تھی میری باتوں کا سوائے "ہوں ہاں" کے انہوں نے کوئی جواب نہ دیا اور آدھ گھنٹے کی ملاقات میں چار جملے بھی پوری طور سے نہ کہے۔ باہر نکل کر میں نے سوچا کہ ان میں بڑی رعونت ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ ان کا غرور نہیں بلکہ مزاج کا دھیما پن تھا جس کی وجہ سے نہ ہی وہ زیادہ بولتے اور نہ ہی دوسروں کی طرح جذبات کی شدّت کا اظہار کرتے۔ ان کے کلام میں بھی یہ ہی خصوصیت ہے اور اُردو کے ایک ادیب کے الفاظ میں فیض "اندر ہی اندر سُلگنے کے عادی" تھے ــــ

اس کے بعد فیض صاحب سے کبھی کبھی لاہور یا دلّی میں ملاقات ہو جاتی، مگر بہت ہی مختصر ــــ

پاکستان ٹائمز" کی دوبارہ ایڈیٹری کرنے کے کچھ ہی عرصہ بعد ایوب خاں کا مارشل لا شروع ہو گیا اور کچھ ہی عرصہ بعد فوجی حکومت نے پاکستان ٹائمز کے ادارے کو اپنے قبضے میں کر لیا اور میاں افتخار الدین، جو کہ اس اخبار کے بانی تھے انہیں نکال باہر کیا گیا —— فیض صاحب تو اخبار سے پہلے ہی علیحدہ ہو چکے تھے مگر اس "انقلاب" کے بعد دوسرے ایڈیٹروں کو بھی علیحدہ ہونا پڑا۔ اس طرح سے پاکستان میں بائیں بازو کے عناصر پر عتاب کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ ایوب خاں کی حکومت پاکستان میں دس سال تک رہی۔ اس کے بعد بھٹو سرکار حالانکہ انتخاب سے برسر اقتدار آئی تھی مگر پاکستان کے لوگوں کو جمہوری حقوق پورے طور سے پھر بھی نہ ملے۔ یہ کہنا غلط ہوگا کہ اس سارے زمانے میں فیض صاحب معتوب ہی رہے پاکستان کے سرکاری حلقوں میں ان کی اہمیت بڑھتی تھی اور وہ ایک نیم سرکاری ادارے کے ڈائریکٹر بھی رہے۔ انہیں لینن انعام بھی ملا اور بین الاقوامی سطح پر ان کی جو حیثیت بنی اس سے پاکستان کے مقتدر اصحاب بھی فیض کی اہمیت تسلیم کرنے لگے۔ "دستِ صبا" چھپنے کے بعد کافی عرصے تک فیض صاحب بطور شاعر خاموش رہے۔ اُن کا تیسرا مجموعہ "زنداں نامہ" بھی جیل میں کہے گئے کلام پر مشتمل تھا۔ ان دنوں عام طور سے یہ کہا جاتا کہ فیض صاحب سے اگر اچھے شعر کہلوانے ہیں تو انہیں جیل بھیج دو، مگر ایسی بات نہیں۔ انہوں نے بعد میں بھی بہت کچھ کہا ہے اور اس سارے کلام میں ان کا مخصوص اسلوب نمایاں ہے۔ فیض صاحب کو اس بات کا بڑی شدت سے احساس تھا کہ پنجابی ان کی مادری زبان ہے مگر ان کا کلام اردو میں ہے — ایک دو بار نجی محفلوں میں انہوں نے کہا بھی تھا کہ اردو شاعری تو اوپر کے طبقے کے لئے ڈرائنگ روم میں پڑھنے کی چیز ہے اور گلی کوچوں میں تو لوگ پنجابی سمجھتے ہیں۔ اسی خیال کے زیرِ اثر انہوں نے پنجابی میں بھی شعر کہنے کی کوشش کی۔ یہ اشعار اچھے ہیں مگر انہیں پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی بوڑھا کسی دوشیزہ سے عشق کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ کچھ بھی ہو پنجابی حلقوں میں ان کی اس کوشش کو بہت سراہا گیا۔

صدر ضیا کا مارشل لا لگنے کے بعد فیض صاحب کچھ جلاوطنی کی زندگی گزارنے لگے، کبھی لندن، کبھی بیروت اور کبھی کہیں اور۔ لبنان کے المیے پر بھی ان کے بہت سے اشعار ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان میں گو ترقی پسند ادیبوں کی تحریک کو زوال آگیا مگر فیض صاحب کی شہرت اور مقبولیت میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ اپنے دور کے نمائندہ شاعر تھے اور فیض صاحب کا بڑے سے بڑا مخالف بھی ان کی اس حیثیت سے انکار نہیں کر سکا۔ سیاسی اعتبار سے انہوں نے دنیا کے مجبور، محکوم اور مظلوم لوگوں کے حق میں آواز اٹھائی۔ اچھا ہوتا اگر وہ سوویت یونین کے ان ادیبوں کے حق میں بھی کچھ کہتے جو کمیونسٹ حکومت کے عتاب کا شکار بنتے رہے ہیں۔ درحقیقت ترقی پسند تحریک کا سب سے بڑا المیہ یہی رہا ہے کہ سیاسی اور نظریاتی طور پر یہ ایک تنگ دائرے میں تبدیل ہو کر رہ گئی — میں سمجھتا ہوں کہ فیض صاحب اگر سوویت یونین میں ادیبوں کے لئے آزادیِ تحریر کے حق میں کچھ لکھتے تو ان کے وقار اور مرتبے میں اور اضافہ ہوتا۔

فیض صاحب سے میری آخری ملاقات جنوری ۱۹۸۳ء میں ہوئی۔ میں لاہور گیا اور فیض بھی لبنان سے نئے نئے واپس آئے تھے۔ اس وقت یہ خبر مشہور تھی کہ وہ کلکتہ یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر کے طور پر آئیں گے۔ عبدالرؤف کے ساتھ میں ماڈل ٹاؤن میں ان کی رہائش گاہ پر گیا، مگر وہاں ان کے ایک ملاقاتی بیٹھے تھے جو اس قدر بول رہے تھے کہ نہ تو مجھے کچھ کہنے کا موقعہ ملا اور نہ ہی فیض صاحب کی کوئی بات تفصیل سے سُنی جا سکی۔ بعد میں کسی نے بتایا کہ یہ صاحب فیض کے مستقل مصاحب ہیں۔ مجھے تعجب ہوا کہ فیض جیسا آدمی اس ڈھول کو کس طرح برداشت کرتا ہے۔ اسی ملاقات میں انہوں نے کہا کہ اگلے ماہ وہ دِلّی جا رہے ہیں اور وعدہ کیا کہ مجھ سے ضرور ملیں گے۔ مگر مجھے واپس آئے ابھی پندرہ بیس روز ہوئے تھے کہ فیض صاحب کو دل کا دورہ پڑنے کی خبر ملی اور ساتھ ہی کسی اخبار میں ان کے دو شعر بھی تھے، جو انہوں نے ہسپتال کے بستر پر لیٹے لیٹے ہی کہے تھے۔ ان اشعار میں الفاظ تو فیض کے ہی تھے مگر لہجہ بالکل دوسرا تھا۔ موت اور مایوسی کا ذکر کرنا فیض صاحب کے کلام کی خصوصیت کبھی نہیں رہی۔

پھر کچھ ماہ پہلے سُنا کہ فیض صاحب نے اعلان کیا ہے کہ وہ شاعری سے ریٹائر ہو گئے ہیں سُن کر کچھ ہنسی آئی اور سوچا کہ کہیں شاعر بھی شاعری سے ریٹائر ہوا کرتے ہیں۔ مگر ۲۰ر نومبر کو وہ واقعی ریٹائر ہو گئے ـــــ شاعری سے بھی اور دُنیا سے بھی۔ سوچتا ہوں لاہور تو اب خالی خالی سا لگتا ہوگا۔

●●

صوفی غلام مصطفےٰ تبسم

فیض سے میری پہلی ملاقات

۱۹۲۱ تھا اور اکتوبر کا مہینہ۔ مجھے سنٹرل ٹریننگ کالج سے گورنمنٹ کالج میں آئے ہوئے کوئی تین ہفتے گزرے تھے۔ سابقہ درس گاہ کی خشک تدریسی فضا اور ضبط و نظم سے طبیعت گھٹی گھٹی سی تھی۔ نئے کالج میں آتے ہی طبیعت میں انبساط کی لہر دوڑ گئی۔ ادب و شعر کا شوق پھر سے ابھرا۔ چنانچہ "بزم سخن" کی وساطت سے ایک بڑے مشاعرے کی صدارت پروفیسر پطرس بخاری کے سپرد ہوئی۔ شام ہوتے ہی کالج کا ہال طلبا سے بھر گیا۔ اسٹیج کے ایک طرف نیاز مندانِ لاہور اپنی پوری شان سے براجمان تھے۔ مقابل میں لاہور کی تمام ادبی انجمنوں کے نمائندے صف آرا تھے۔ دونوں جانب سے خوش ذوقی اور حریفانہ شگفتگی ایک دوسرے کا خیر مقدم کر رہی تھی۔

روایتی دستور کے مطابق صدر نے اپنے کالج کے طلبا سے شعر پڑھانے کا اعلان کیا۔ دو ایک برخوردار آئے اور بڑے ادب و انکسار سے کلام پڑھ کر چلے گئے۔ اچانک ایک دبلا پتلا، منحنی سا لڑکا اسٹیج پر نمودار ہوا۔ سیاہ رنگ، سادہ لباس، انداز میں متانت بلکہ خشونت، چہرے پر اجنبی ہونے کا شدید احساس۔ اِدھر اُدھر کچھ چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ اتنے میں اس نے کہا: عرض کیا ہے۔ کلام میں ابتدائے مشق کے باوجود پختگی اور اسلوب میں برجستگی تھی۔ سب نے داد دی۔ یہ حفیظ ہوشیار پوری تھے۔

پھر ایک نوجوان آئے۔ گورے چٹے، کشادہ جبیں، حرکات میں خیرہ روانی، آنکھیں اور لب بیک وقت ایک نیم تبسم میں ڈوبے ہوئے۔ شعر بڑے ڈھنگ اور تمکنت سے پڑھے۔ اشارے ہوئے۔ پطرس نے کچھ معنی خیز نظروں میں لاہور کے نیاز مندوں سے باتیں

گئیں اور ان کی نیم خاموشی کو رضا سمجھ کر دونوں نوجوانوں کو دوبارہ اسٹیج پر بلایا گیا کلام سُنا۔ فیض صاحب نے غزل کے علاوہ ایک نظم بھی سُنائی۔ غزل اور نظم دونوں میں سوچ کا انداز اور بیان کا اچھوتا اسلوب تھا۔

مشاعرہ ختم ہوا۔ قرار پایا کہ احباب ان دونوں کو ہمراہ لے کر غریب خانے پر جمع ہوں۔ رات کافی گزر چکی تھی، انہیں بورڈنگ میں پہنچنا تھا بخاری صاحب نے ان کی غیر حاضری کا ذمہ لیا اور پھر گھنٹہ بھر کے لئے شعر و سخن کی صحبت قائم رہی۔ یہ ان کی طبع آزمائی کا امتحان نہیں اساتذہ کی حوصلہ افزائی کا امتحان تھا۔ دونوں کامیاب رہے

ابھی پورا مہینہ نہیں گزرا تھا کہ کالج کے امتحانات کا آغاز ہوا جس دن کی میں بات کر رہا ہوں اس دن پطرسؔ کالج ہال میں مہتمم امتحانات تھے اور ہم جیسے نوجوان لیکچرر کو چھوٹے کمرے سپرد کئے گئے تھے مجھے کالج کی دوسری منزل میں متعین کیا گیا۔ یہاں ایم۔ اے انگلش کے طلبا تھے اور ان میں فیض احمد فیض بھی تھے

امتحان کا کمرہ مقامِ احترام ہوتا ہے۔ اُمیدواروں کے ذہنی امتحان کے ساتھ ساتھ ضبط و نظم کا امتحان بھی ہوتا ہے سگریٹ نوشی ممنوع تھی۔ میں نے اپنی عادت کو دبانے کے لئے پان کا انتظام کر لیا تھا مگر فیض صاحب کبھی سوالات کے پرچے پر نظر ڈالتے اور کبھی میری طرف نیم متبسم نظروں سے دیکھتے اور پھر قلم کو اُٹھا کر سر کو کھجلاتے اور کبھی خاموشی سے اپنے پرچے پر دیکھ دیں کی مزاج پرسی کرتے، کبھی کبھی ان کا بایاں ہاتھ ایسے حرکت کرتا جیسے وہ کسی نامعلوم تختے کو ٹٹول رہے ہیں۔ میں سوچ رہا تھا۔ وہ اُٹھے اور کہا کہ "یہاں سگریٹ پینے کی اجازت ہے؟" میں نے کہا میں ابھی بتاتا ہوں۔

اتنے میں پطرس مختلف کمروں کا معائنہ کرتے کرتے میرے کمرے کے باہر آکر کھڑے ہو گئے۔ میں تعظیماً پلیٹ فارم سے اُتر کر دروازے پر پہنچا، پوچھا:

"سب کچھ ٹھیک ہے؟"

میں نے کہا "جی!"

میں نے عرض کیا: "پروفیسر صاحب ڈیلی نہیں پروفیسر صاحب کہا کرتا تھا) بعض طلبا سگریٹ پینا چاہتے ہیں۔ اجازت ہے؟"

پطرس نے میرے کان میں دبی آواز میں کہا: "جب تک پروفیسر جودھ سنگھ اس کالج کے پرنسپل نہیں بنتے۔ اس وقت تک پی سکتے ہیں۔" اور پھر مُسکرا کر چلے گئے۔

میں نے اندر آتے ہی فیض صاحب کی طرف دیکھا اور اشاروں سے سگریٹ نوشی کا اعلان کیا۔ فیض صاحب کے ہاتھ میں فی الفور ایک سگریٹ نمودار ہوا جیسے قلم ہی سے اُبھر آیا ہو۔

پھر قلم کے رشش اور سگریٹ کے کش میں مقابلہ شروع ہوا اور اس کشمکش میں معطر دھوئیں کے غبارے پورے کمرے میں پھیل گئے۔ میں متکلم تھا، ضبط و نظم کی زنجیروں میں جکڑا ہوا بیٹھا رہا اور قوام دار پان کو چھوڑ کر اس خوشبو سے اپنے ذوقِ سگریٹ نوشی کی تسکین میں محو ہو گیا۔

کیا معلوم تھا کہ دھوئیں کے یہ غبارے کالج کی چار دیواری سے دُور دُور تک فضا میں پھیل جائیں گے۔ اور ان میں سگریٹ پینے والے کے معطر انفاس کی خوشبوئیں بھی لہرائیں گی اور ہنر و فن اور ادب کی دنیا کو اپنے آغوش میں لے لیں گے۔ ●

خود فراموش صحافی

عبدالقدیر رشک

بیاہ کے پہلے روز کوٹ گم ہوا، پھر زیورات چوری ہوئے اور جب کراچی جاتے ہوئے کپڑوں سے بھرا سوٹ کیس گم ہو گیا تو بیگم فیض کی قوت برداشت جواب دے گئی بیوی کے چہرے پر احساس محرومی دیکھ کر فیض صاحب مسکرائے، اور پرسکون لہجے میں کہا "بیوی تم نے شاعر کا وہ مصرع تو ضرور سنا ہوگا۔" "رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو"

بے چاری بیوی دل پر صبر کا پتھر رکھ کر خاوند کی شاعرانہ مسکراہٹوں میں شریک تو ہو گئی، لیکن اسے زندگی بھر کھٹکا لگا رہا کہ اگر فیض صاحب اسی رفتار سے باتیں بھولتے اور چیزیں گم کرتے رہے تو بیاہ کے سوٹ کی طرح کسی روز اپنے آپ کو گم کر بیٹھیں گے۔ فیض صاحب کی بیوی کا اندازہ درست نکلا بالآخر فیض صاحب بیاہ کے کوٹ کی طرح اپنے آپ کو گم کر بیٹھے اور بیگم فیض ہاتھ ملتی رہ گئیں۔

فیض صاحب سے پہلی ملاقات سے زیادہ دلچسپ میرا اپنا حلیہ تھا، بدن پر کھلی آستین کا کرتہ، پاؤں میں پشاوری چپل اور جلو میں آرڈننس کلوذنگ فیکٹری کے مزدوروں کا نعرے لگاتا ہوا جلوس۔ ہاتھ میں پاکستانی جھنڈا اور کندھے پر ہوا میں پھڑپھڑاتا ہوا رومال: یہ دلچسپ واقعہ اس تاریخی دور کی یادگار ہے جب اخباروں کے مدیران مولانا کہلاتے تھے اور اخبار کا مدیر اعلیٰ سیاسی راہنما سمجھا جاتا تھا جلسے جلوس صحافت کا موسمی میوہ شمار ہوتے تھے

آرڈننس کلوذنگ فیکٹری کے مزدوروں کا یہ جلوس اپنے مطالبات منوانے مسلم لیگ کے صدر دفتر واقع لکشمی چوک

جا رہا تھا۔ اس جلوس کی قیادت میرے سپرد تھی۔ لاہور کے دو موقر جرائد پاکستان ٹائمز اور امروز کے ایڈیٹر غالباً ظہیر بابر اور حمید جہلمی چھت پر آ کر کھڑے ہوئے۔ روزنامہ امروز کے ایک سینئر ایڈیٹر شکور احسن نیچے اترے اور مزدوروں کا ایک وفد مولانا چراغ حسن حسرت مرحوم کے پاس لے گئے۔ مزدور وفد پلٹ کر آیا تو فیض احمد فیض اپنے کمرے کے سامنے کھڑے تھے بدن پر کھدر کا کرتہ، ہاتھ میں سگریٹ اور ہونٹوں پر میٹھی مسکراہٹ۔

فیض صاحب ہمیں اپنے کمرے میں لے گئے۔ مزدوروں نے گفتگو کا آغاز کیا تو فیض صاحب ماہنامہ ادب لطیف کے مطالعے میں مشغول نظر آئے۔ فیض صاحب بھول چکے تھے کہ مزدوروں کا جلوس دفتر سے باہر موجود ہے اور نمائندہ وفد ان سے ملاقات کرنے آیا ہے۔ وہ مزے سے مسکرا رہے تھے، سگریٹ پی رہے تھے رسالے کے اوراق الٹ رہے تھے۔ بہت مزدور فیض صاحب کی شاعرانہ خود فراموشی سے ناواقف تھے، چنانچہ انھیں فیض صاحب کی مزدور دوستی مشکوک نظر آئی۔ فیض صاحب نے مطالعہ کے دوران دو ایک بار مسکرا کر میری طرف دیکھا اور مجھ سے نظر ہٹا کر مطالعہ میں جت گئے۔

وفد کے لیڈر نے گلا پھاڑ کر احتجاج کیا "فیض صاحب" وہ جواب میں مسکرائے اور گنگنانے کے انداز میں آواز آئی "اچھا مزدور ـــ ہوں فرمائیے۔" فیض صاحب کے انداز گفتگو سے مزدور دوستی کے محل زمیں بوس ہوتے نظر آئے۔ ہمیں خیال آیا کہ فیض صاحب دانستہ طور پر مزدوروں کو نظر انداز کر رہے ہیں میں ایک لمبی چوڑی تقریر جھاڑنے کے موڈ میں تھا لیکن میں نے تقریر جھاڑنے سے پہلے ادب لطیف کے اوراق پر ایک نگاہ ڈالنا ضروری سمجھا۔ فیض صاحب ادب لطیف کی جس تحریر کا مطالعہ کر رہے تھے خیال تھا کہ وہ تڑپتی پھڑکتی کوئی غزل ہوگی یا کوئی نشتر پنہاں قسم کا شعر ہوگا لیکن وہ اپنی شاعرانہ روایت کے برعکس نثر پڑھنے میں مشغول تھے۔

میں نے سیٹ سے اٹھ کر رسالے پر دوبارہ نگاہ ڈالی تو سارا غصہ ہرن ہو گیا۔ ادب لطیف نے میری ایک کہانی "سمجھوتہ" شائع کی تھی۔ فیض صاحب بڑے انہماک کے ساتھ اس کہانی کا مطالعہ فرما رہے تھے اس کہانی کا بنیادی نقطۂ نظر بھی مزدور تھا۔ کہانی کا پلاٹ فیض صاحب کے کمرے میں بیٹھے مزدوروں کے حالات اور واقعات سے ملتا جلتا تھا۔

میں نے تقریر کا ارادہ ترک کر دیا اور ادب کے موضوع پر گفتگو کا آغاز کیا۔ انھوں نے رسالہ ٹھپ کر ایک طرف رکھ دیا۔ دراز سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔ اور ایک ابدی دلآویز سکون کے ساتھ مسکراتے ہوئے خاموش رہے۔ وہ گوتم بدھ کی طرح شانت تھے مگر مجھے ان کی شکتی اور شانتی گراں گزری انھیں خاموش پا کر میں اٹھا اور لپک کر دروازے تک پہنچ گیا فیض صاحب کو میرے خفا ہونے کا احساس اور علم ہوا تو پیچھے سے آواز آئی "رشک صاحب! کبھی پھر ملئے گا آپ سے علمی باتیں کرنی ہیں۔"

وفد کا خیال تھا کہ فیض صاحب مزدوروں کے مظاہرے کے متعلق کچھ نہیں لکھیں گے۔ اور میری کہانی غالباً اس لئے پڑھیں گے کہ معاشرہ اور صحافت میں میری تھوڑی بہت عزت آبرو ہے، یہاں چلتی کا نام گاڑی ہے۔ دل کے چور کبھی پکڑے نہیں جاتے۔ فیض صاحب بھی چلتی گاڑی پکڑتے ہیں خدا جانے وہ کتنی گاڑیاں پکڑ اور چھوڑ چکے ہیں لیکن دوسرے دن پاکستان ٹائمز چھپا تو صورت حال قطعاً مختلف تھی مظاہرین کی تصویر کے ساتھ دو کالم کی خبر بھی موجود تھی۔ اگلے روز پاکستان ٹائمز میں فیض صاحب کا ایک ادارتی نوٹ چھپا جوان کی نظموں کی طرح خوب صورت اور جاندار تھا۔ تیسرے روز

پاکستان کے پہلے وزیراعظم خان لیاقت علی خان نے مزدوروں کا وفد بلایا اور مزدوروں کے کئی مطالبات منظور کر لئے۔

تحریکیں، احتجاجی مظاہرے اور موچی دروازہ کے باغ دبہار جلسے اہل لاہور کی زندہ دل سیاست کا حصہ رہے ہیں۔ داتا کی اس نگری میں بوٹا سنگھ جیسے عاشق زار کی دفات پر جلوس تک نکلتے رہے ہیں۔ پاکستان ٹائمز کی سیڑھیوں چھتوں اور دفتروں میں بیٹھے مزدور بھی لاہور کی زندہ دل سیاست کا حصہ تھے۔ فیض صاحب سے جس جلوس کے دوران ملاقات ہوئی اس کا مختصر معاشرتی اور سیاسی پس منظر اس طرح تھا۔

پنجاب میں پہلے صوبائی الیکشن کی آمد آمد تھی لوگ ایک مدت سے الیکشن کے میوے کو ترس رہے تھے ہجرت اور متروکہ جائیدادوں کی لوٹ کھسوٹ نے اہل لاہور اور بالخصوص مہاجرین میں مایوسی پھیلادی تھی، مجید لاہوری اور حاجی لق لق کی مزاحیہ شاعری، سماجی بے انصافیوں کے خلاف زوروں پر تھی۔ لاہور کے نامی گرامی صحافی مثلاً مولانا چراغ حسن حسرت اور مولانا عبدالمجید سالک بے انصافیوں کے خلاف زوردار مزاحیہ اور سنجیدہ کالم لکھ رہے تھے۔ فیض احمد فیض اور میرے سمیت کئی اخبار نویس مزدوروں، کسانوں اور معاشی طور پر مظلوم طبقوں کے جلوس کی قیادت کرتے تھے۔

مسلم لیگ کا سیاسی زوال شروع ہو چکا تھا اس کے اقتدار کی کرسی سرکتی نظر آتی تھی، مسلم لیگی لیڈر اقتدار کی بحالی کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے لیکن حالات انھیں سنبھلنے کا موقع نہیں دیتے تھے، ایک معروف مسلم لیگی لیڈر احمد سعید کرمانی لاہور کے ایک انتخابی حلقے سے الیکشن کے امیدوار تھے پاکستان کے بزرگ سیاست داں میاں ممتاز احمد خاں دولتانہ ان کی سیاسی پشت پناہی کر رہے تھے۔

دولتانہ کے علاوہ بیگم جہاں آرا شاہنواز اور ملک فیروز خاں نون جیسے مسلم لیگی لیڈر بھی لاہور میں موجود تھے، یہ خواتین و حضرات اپنے امیدوار کو کامیاب کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے احمد سعید کرمانی کے مدمقابل لاہور کے معروف مزدور لیڈر میرزا ابراہیم کو کامیاب کریں گے پاکستان کے پہلے وزیراعظم خان لیاقت علی خان الیکشن کا ابرآلود مطلع صاف کرنے لاہور آئے ہوئے تھے ان کا قیام کالج روڈ پر تھا ان دنوں مسلم لیگ کا صدر دفتر لکشمی چوک میں واقع تھا۔ یوسف خٹک آفس سکریٹری، بیگم سلمیٰ تصدق حسین اور شیخ صادق حسن ان کے مددگار تھے۔

لاہور کی آرڈیننس کلودنگ فیکٹری احمد سعید کرمانی کے حلقہ انتخاب میں واقع تھی۔ اس فیکٹری کے مزدوروں کے کئی مسائل تھے لیکن مزدور جب بھی اپنے حقوق کا مطالبہ کرتے پولیس انھیں گرفتار کر لیتی۔ مزدور لیڈر میرزا ابراہیم بھی قید و بند اور جیل کی سختیاں جھیل چکے تھے لیکن یہ قربانیاں ابھی تک رنگ نہ لائی تھیں۔ الیکشن مزدوروں کے مطالبات کے لئے ایک سنہری موقع تھا۔ اور مزدور اس گولڈن چانس سے فائدہ اٹھانے کا تہیہ کر چکے تھے۔ لاہور کے بیک وقت چار اخبار روزنامہ زمیندار احسان، پاکستان ٹائمز اور امروز نے مزدوروں کے حق میں قلم اٹھایا جس سے مزدوروں کے حق حقوق کی جنگ تیز تر ہوگئی میری غریبانہ صحافتی قیادت اور فیض صاحب کے زور قلم نے ایسا رنگ باندھا کہ مزدوروں کے خلاف پولیس الیکشن کا طلسم ٹوٹ گیا۔

اس دور میں بیگم فیض کا کہنا تھا کہ فیض صاحب ہجوم کی معیت پسند کرتے ہیں بیگم فیض کہتی تھیں کہ ان کے خاوند عید اور دوسرے مذہبی تہواروں پر ہجوم کو دیکھ کر پھولے نہیں سماتے، فیض صاحب کو انسانی زندگی اور انسان کے انقلاب انگیز کارناموں سے جتنی دلچسپی تھی وہ ان کی زندگی آمیز شاعری

سے ظاہر ہے۔ وہ ارتقا پر ایمان رکھتے تھے انھیں اس روایت سے محبت تھی جو انسان کو آگے بڑھنا سکھاتی ہے یہ باتیں اپنی جگہ پتھر کی لکیر کے مترادف تھیں اور بیگم فیض نے اپنی جگہ ٹھیک ہی سوچا ہوگا۔ لیکن میں نے فیض صاحب سے پہلی ہی ملاقات میں ان کی خلوت نشینی اور غائب دماغی کی ایک عجب انگیز اُمنگ کو پرورش پاتے دیکھا وہ اپنی عوام دوست شاعری کے باوجود ایک ایسی دنیا میں پہنچنا چاہتے تھے جہاں مکمل آزادی ہو عقیدت مندوں کا ہجوم نہ ہو ان کے جی میں جو آئے کریں بچوں کی سی معصومیت کے ساتھ ہر چیز کو دیکھ کر پلکیں جھپکیں ایسے مواقع پر ان کی شخصیت میں بڑی معصومیت جھلکتی تھی غالباً وہ ایسا موقع موقع ہوتا تھا جس کے متعلق ایلس فیض نے ایک بار کہا تھا۔ جب آسمان پر بادل چھا جاتے ہیں۔ تیز ہوا چلنے لگتی ہے تو شاعر کا احساس شعر جاگ اٹھتا ہے۔"

میں پہلی ہی ملاقات میں فیض صاحب کی خود فراموشی کے مشاہدہ سے حیران رہ گیا۔ ایک بار انھوں نے جیل سے ہسپتال جاتے ہوئے حد کر دی۔ ہوا یہ کہ ان کی بیٹی سلیمہ تانگے پر گھر جا رہی تھی۔ فیض صاحب سپاہیوں کی معیت میں ہسپتال سے نکلے۔ جب بیٹی نے باپ کو پا بہ زنجیر دیکھا تو بیٹی کی بے لوث محبت تڑپ اٹھی۔ وہ چاہتی تھی کہ ایک لمحہ کے اپنے قیدی باپ سے ملے اور کچھ دیر کے لئے باپ کے سایہ کا لطف اٹھائے۔ سلیمہ نے آوازیں دیں۔ ہاتھ ہلا ہلا کر پکارا۔ لیکن باپ اپنے خیالوں میں گم بیٹی کی پیار بھری آواز سے دور ہوتا چلا گیا ایک ایسے چپ چاپ ماحول کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ جہاں انتہائی سکون بھی عزیزوں کے لئے سوہان روح بن جاتا ہے۔

قید و بند اور جیل کی کال کوٹھڑیاں پرانے حریت پسند اخبار نویسوں اور ادیبوں کا صحافتی مقدر رہی ہیں اخبار نویس گھر سے خالی ہاتھ جیل جاتے تھے۔ اب تو سیاسی اسیروں کو جیل جاکر جیبیں خالی کرنا پڑتی ہیں۔ ۱۹۵۰ء تک سیاسی اسیر کی جیب گرفتاری کے وقت خالی کرالی جاتی تھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد راپکی جیل گئے تو ان کے دونوں ہاتھ خالی تھے جب پلٹ کر دلی آئے تو ایک بلند پایہ ادبی کتاب "غبار خاطر" کے مصنف بن گئے۔ برصغیر کے دوسرے نامور صحافی مولانا حسرت موہانی کی زندگی کا بیشتر سیاست لڑاتے اور جیل میں چکی چلاتے گزرا۔ ان کی طویل ترین جیل یاترا ان کی معروف کتاب سفیر محسن کی تخلیق کا موجب بنی۔ چوہدری افضل حق جیل گئے تو مجلس احرار کے سیاسی لیڈر تھے مگر جیل کی زندگی نے ان کا دامن زندگی اور آزادی ہند جیسی کتابوں اور فکار شات سے بھر دیا۔ اور وہ برصغیر کے نامور مصنف بن گئے روزنامہ "زمین دار" کے بانی مولانا ظفر علی خاں کی شعری کتابوں کا بیشتر حصہ جیل خانوں میں مکمل ہوا۔

لیکن صحافت کی تاریخ میں ایسا کم ہوا کہ کسی صحافی کے سر پر حکومت کے خلاف بغاوت کے الزامات کی تلوار لٹک رہی ہو۔ صحافی کو سزائے موت یا عمر قید دینے کے لئے عدالت کا سپیشل ٹریبونل بنایا گیا ہو اور حسین شہید سہروردی جیسے وکلاء اس مقدمے میں پیش ہوئے ہوں۔ اس کے باوجود ملزم صحافی نے شگفتہ بیانی کا ثبوت دیا ہو۔

جب راولپنڈی سازش کیس کی سماعت ہوئی تو فیض احمد فیض، میجر جنرل اکبر خاں اور سجاد ظہیر کے علاوہ بھی کئی ملزم عدالت میں پیش ہوئے۔ قانون کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں جنہیں بدل سکنا ممکن نہیں۔ راولپنڈی کیس کے موقع پر عام مفروضہ یہ تھا کہ دو بڑے ملزموں، فیض احمد فیض اور میجر جنرل اکبر خان کو سزائے موت دی جائے گی۔ ایسے امکانات کی موجودگی میں بڑے سے بڑا آدمی دہل جاتا ہے شاعرانہ خود فراموشی ختم

ہو جاتی ہے۔ شگفتگی کے چشمے سوکھ جاتے ہیں، لیکن فیض احمد فیض کی بہت سی خوب صورت نظمیں اس وقت کی یادگار ہیں۔

راولپنڈی سازش کیس کی ملزم بیگم نسیم جہاں نے رہائی پانے کے بعد مجھے بتایا کہ راولپنڈی سازش کیس کے اسیروں کی زندگی میں ایک رات انتہائی بھیانک اور لرزہ خیز تھی ایسی ایسی کالی رات جس کا سامنا کرنے کے لئے شیر کا دل گردہ چاہیے۔ شاید روحی درازی نے ایسی پرپیچ راتیں نہ دیکھی ہوں راولپنڈی سازش کیس کی سماعت کا آخری دن ختم ہونے پر حسین شہید سہروردی، فیض اور اکبر کو ایک طرف لے گئے اور انھیں نہایت افسوس کے ساتھ یہ اندوہناک خبر سنائی کہ انھیں فیصلہ کے روز سزائے موت ہو سکتی۔ لیکن اس خبر کے باوجود فیض صاحب نے سگریٹوں کا پورا کوٹا پیا اور اپنی زندگی کی بہترین نظمیں لکھیں۔

کہہ دے اپنی لیلاؤں سے روشنیوں کے شہر

آج کی شب جب دیا جلائیں اونچی رکھیں لَو

فیض احمد فیض کی صحافت اور شاعری کی طرح سہروردی کی قانون دانی کے بعض اوقات بڑے تعجب انگیز ہیں مثلاً اکبر خان کی گرفتاری کے وقت ایک ایسا کاغذ برآمد ہوا جس پر انگریزی زبان میں لکھا تھا G.G. SHOULD BE REMOVED استغاثہ کا موقف یہ تھا کہ یہ ایک خفیہ حکم نامہ تھا۔ جو پاکستان کے گورنر جنرل 'جی جی' کو ہٹانے کے لئے لکھا گیا تھا۔

سماعت کے آخری روز سہروردی صاحب کا ایک ایسا عقلی اور منطقی تیا پھینکا کہ جج صاحبان حیران رہ گئے سماعت کے آخری لمحات میں سہروردی صاحب کمال سنجیدگی کے ساتھ اٹھے اور فرمایا "مائی لارڈز" میرا موکل اکبر خاں ایک آرمی آفیسر ہے ممکن ہے انھوں نے گلگت گریزن کو ہٹانے کا حکم صادر کیا ہو۔ یہ فراست سہروردی کی قانونی زندگی کا حصہ تھی، ورنہ ایسے نکات کہاں سوجھتے ہیں۔

فیض صاحب کی خوب صورت نظمیں مقابلہ حسن میں پیش کی جائیں تو یقیناً حسینۂ عالم منتخب ہوں گی۔ لیکن بدصورتیوں کا بھی اپنا ایک حسن ہوتا ہے۔ فیض احمد فیض نے خوبصورت نظموں کے ساتھ ساتھ پنجاب کے جیل خانوں کی بدصورت روایت کا تذکرہ بھی کیا ہے، فیض صاحب نے پاکستان ٹائمز کی ادارت کے دوران حیدرآباد سندھ کا بدصورت ترین سینٹرل جیل دیکھا لیکن وہ ساہیوال سینٹرل جیل کی بدصورتی کے زیادہ مداح تھے۔ فیض صاحب کے کسی شعر یا مصرعے میں جب بھی زمانے کی تلخی بولتی ہے تو وہ ساہیوال جیل کا کوئی تلخ ترش تجربہ ہوتا۔

جیل کی سختیوں اور کوفتوں کا ازالہ ممکن نہیں ہوتا البتہ بسا اوقات ان شہروں کے شہری جہاں جیل خانے واقع ہوتے ہیں ان تلخیوں کے ازالہ کی ضرور کوشش کرتے ہیں ساہیوال کے عوام کو فیض صاحب کی جیل یاترا اور ان مصائب کا علم تھا جو انھوں نے اس شہر کے رسوائے زمانہ جیل خانے میں اٹھائے اور یہ واقعات ان کی زندگی کا ایک تلخ تجربہ بن گئے۔

میں ایک ہفت روزہ کا مدیر تھا کہ ساہیوال والوں نے جیل یاترا کی غلطی کا ازالہ کرنے کے لئے فیض صاحب کے ساتھ رنگا رنگ ادبی شام منانے کا اہتمام کیا۔ ساہیوال کے ڈپٹی کمشنر مصطفٰے زیدی جو کسی زمانے میں تیغ الٰہ آبادی کہلاتے تھے خود بھی ایک جانے پہچانے شاعر تھے انھوں نے ساہیوال کے بلدیاتی ادارے کے تعاون سے فیض صاحب کے شایان شان شام منانے کا پروگرام بنایا۔ ساہیوال کے عوام کا پُرخلوص جذبہ یہ تھا کہ فیض صاحب کے ساتھ ایسی زوردار شام منائی جائے کہ اُن کے ذہن سے ساہیوال جیل کی تمام بدصورت روایات محو ہو جائیں۔

دنیا میں ہر فن کا فنکار موجود ہے لیکن لاہور کے دو فنکاروں، فریدہ خانم اور مہدی حسن نے کلام فیض سنانے میں جو مقام حاصل کیا اس کا جواب نہیں، یہ دونوں فنکار اپنے فن میں اتنے منفرد ہیں کہ آل انڈیا ریڈیو اور امرتسر ٹیلی ویژن نے تین فنکاروں، ملکہ ترنم نورجہاں، مہدی حسن اور فریدہ خانم کی آواز میں فیض صاحب کی بہت سی غزلیں اور نظمیں محفوظ کرلی ہیں، ساہیوال میں منائی جانے والی شام فیض کے روح رواں سب یہی فنکار تھے۔ جب لاہور کے دیگر فنکاروں شلاً عبدالشکور بیدل، ثریا بیگم اور شاہجہاں بیگم نے ساہیوال میں شام فیض کی خبر سنی تو انھوں نے بھی رخت سفر باندھا اور یوں ساہیوال کلام فیض گانے والے خوش الحان پرندوں کا آشیانہ بن گیا۔

لاہور میں فیض شناس ادیبوں اور شاعروں کی کمی نہیں۔ ان دانشوروں نے فیض صاحب کی وفات پر بہت کچھ لکھا ہے لیکن فیض صاحب کی شاعرانہ شام کے موقع پر جن لوگوں کو مدعو کیا گیا ان میں اردو کے بزرگ شاعر صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، حمید اختر، عبداللہ ملک اور راقم الحروف شامل تھے، ساہیوال میں مجید امجد ادب سے لو لگائے بیٹھے تھے وہ اپنے احباب کے ساتھ شریک ہوئے۔ جب فیض صاحب سمیت ادیب اور شاعر ساہیوال میں اکٹھے ہوئے تو ایک وسیع ادبی جشن کا سا سماں پیدا ہوگیا۔

کلام فیض کی گائیکی کے علاوہ پروگرام یہ تھا کہ ساہیوال کے عوام سے فیض صاحب کا تعارف بزرگ شاعر صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کرائیں۔ عبدالشکور بیدل سازوں کے بغیر کلام فیض پڑھیں اور میں اپنے مخصوص شگفتہ انداز میں فیض صاحب کی شخصیت پر روشنی ڈالوں۔ میں شام فیض سے بہت پہلے اپنی کتاب "شخصیتیں" میں ان کا تذکرہ کرچکا تھا۔

لیکن ساہیوال جیل کی طرح ساہیوال کے ادب نواز حلقے کی اپنی مخصوص روایات ہیں۔ ان کا موقف یہ تھا کہ فیض صاحب نے ساہیوال جیل میں اتنی سختیاں کہ اب کوئی تیسرا آدمی ان کے اور فیض صاحب کے درمیان حائل نہیں ہوسکتا ترمیم شدہ پروگرام کے مطابق صوفی صاحب نے فیض صاحب کا مختصر تعارف کرایا اور اس کے ساتھ ہی فنکاروں کی آوازیں ساہیوال کی فضا میں گونجنے لگیں اور وہ تمام کدورتیں دور ہوگئیں جو ایک دور میں ساہیوال جیل نے پیدا کی تھیں۔

ساہیوال ایک دور افتادہ علاقہ ہے فیض صاحب دوران اسیری ساہیوال میں محض اجنبی تھے لیکن ہوتا یہ ہے کہ جو شخص والے یا نجنے عوام کا ساتھ دیتا ہے بہت سی آنکھیں چھپ چھپ کر اس کا تحفظ اور نگرانی کرتی ہیں۔ ساہیوال کے ادبی پلیٹ فارم پر ایک ایسے بزرگ ہم سے ہمکلام ہوئے جو چٹے ان پڑھ تھے۔ انھوں نے زندگی میں نہ کبھی فیض صاحب کی کتاب دست صبا پڑھی اور نہ پاکستان ٹائمز کا کوئی ایسا شمارہ جس کا اداریہ فیض صاحب نے انگریزی زبان میں لکھا ہو لیکن جب تک فیض احمد فیض ساہیوال جیل میں نظر بند رہے یہ آدمی بڑی باقاعدگی سے ان کے نیاز حاصل کرتا رہا۔ مینہ آئے یا آندھی چلے یہ شخص شب و روز فیض سے ملنے آتا تھا۔ فیض صاحب حیران تھے کہ یہ شخص کون ہے۔ پُر لطف بات یہ ہے کہ جب شام فیض کے موقع پر اس شخص کو اپنا تعارف کرانے کے لئے کہا گیا تو اس نے اپنا تعارف کرانے سے انکار کردیا۔ وہ اپنا نام پتہ بتا کر اپنی نیکی دریا بُرد نہیں کرنا چاہتا تھا جب لوگوں نے اُسے زیادہ مجبور کیا تو وہ آنکھوں میں آنسو اور ماضی کا رنگ بھرے مجلس سے اٹھ کر چلا گیا۔

ساہیوال میں شام فیض کا ایک خوب صورت پہلو یہ تھا کہ اس موقع پر گائی ہوئی غزلوں اور نظموں نے شہرت

دوام کا درجہ حاصل کیا۔ یہ غزلیں اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ مہدی حسن نے ہماری موجودگی میں فیض صاحب کی یہ مشہور غزل پہلی بار گائی۔

گلوں میں رنگ بھرے باد نو بہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

اس موقع پر ملکہ ترنم نورجہاں اور فریدہ خانم کی گائی غزلیں بھی ملک کے ادبی ریکارڈز کا حصہ بن گئیں۔

لاہور اور کراچی کے ادبی دانشوروں نے فیض احمد فیض کی باغ و بہار زندگی اور شاعری پر خیال آفریں تحریریں لکھی ہیں۔ ان رنگا رنگ تحریروں سے ثابت ہوتا ہے کہ فیض احمد فیض اپنے دور کے بلند پایہ شاعر تھے۔ اقبال اور جوش کے بعد ان کی شاعری کا تیسرا نمبر تھا۔ لیکن فیض صاحب کے سوانح نگار انھیں اخبار نویسی میں نمبر دینا بھول گئے حالانکہ اخبار نویسی میں نمبر دینا بھول گئے حالانکہ اخبار نویسی میں بھی الطاف حسین ایڈیٹر ڈان اور حمید نظامی کے بعد ان کا تیسرا نمبر تھا۔ اگر وہ پاکستان ٹائمز سے رضاکارانہ طور پر علیحدگی اختیار نہ کرتے تو الطاف حسین کی موت کی صورت میں حمید نظامی کے بعد ان کا دوسرا نمبر ہوتا۔

فیض احمد فیض نظم اور غزل کی طرح انگریزی اداریہ نگاری میں بھی آمد اور آورد کا پورا خیال رکھتے تھے۔ جب تک موڈ نہ بنتا اداریہ نہ لکھتے۔ وہ صبح اٹھ کر اخباروں کے مطالعہ کے بعد اپنے ذہن میں اداریہ کے لئے کوئی ایک موضوع چن لیتے۔ فیض صاحب کی اداریہ نگاری کا طریقہ اُن کے معاصرین مثلاً الطاف حسین اور حمید نظامی سے مختلف تھا۔ یہ اخبار نویس صبح سویرے تازہ دم ہوتے کا فائدہ اٹھا کر کسی تر و تازہ موضوع پر اداریہ لکھتے تھے لیکن فیض صاحب اداریہ کا موضوع پوری طرح پک جاتا تو وہ شعر گوئی کے انداز قلم سنبھالتے اور بلند پایہ اداریہ نگاری کا حق ادا کر دیتے۔

فیض صاحب دوستوں کی مجلس جاتے تو ان پر بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" کی کیفیت طاری ہوتی۔ کوئی اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ یہ صاحب شہرۂ آفاق انقلابی شاعر ہیں اور روس کی قریباً ہر زبان میں ان کی کتابوں کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ ایک بار میں، حمید اختر اور عبداللہ ملک فیض صاحب کے کمرے میں بیٹھے تھے کراچی کے کچھ دانشور لاہور آئے ہوئے تھے۔ ادبی گپ شپ کا سلسلہ دراز ہوا تو شام کے سائے لاہور کے در و بام پر لرزنے لگے۔ اس دوران فیض صاحب کے دو آدمی تھوڑا سا دروازہ کھول کر اندر جھانکتے اور فیض صاحب کو ادبی باتوں میں مشغول پا کر منہ لٹکائے پلٹ جاتے۔ کراچی کے دانشوروں کا خیال تھا کہ یہ لوگ فیض صاحب کے دوست یا مداح ہیں کیونکہ فیض صاحب عملے کے کسی بھی فرد کو ماتحت ہونے کا احساس نہیں ہونے دیتے تھے لیکن اُن میں سے ایک ٹائپسٹ تھا اور دوسرا کمپوزیٹر، جو رات سے پہلے فیض صاحب کے اداریہ سے نمٹنا چاہتے تھے لیکن فیض صاحب کے ادبی مشاغل چٹھے پر ہاتھ رکھنے نہیں دیتے تھے۔

بالآخر شام ڈھلے بیگم ایلس فیض نے محبت آمیز غصے سے فیض صاحب کو گھور کر دیکھا جس کا صاف سیدھا مطلب تھا کہ بھلے مانس ادیبانہ ختم کرو۔ بندۂ خدا! تم اخبار نویس بھی ہو جس کا پیشہ حاسد بیوی کا درجہ رکھتا ہے اور یہ صحافتی بیوی حسین سے حسین ترین بیویوں کو اپنے اور اپنے خاوند یعنی اخبار نویس کے درمیان حائل ہونے نہیں دیتی فیض صاحب نے اپنی اصل اور "دوڑھی" بیوی سے نظر ہٹا کر جز مرم کی حامل بیوی کی طرف دیکھا جو شام ڈھلے سولہ سنگار کئے فیض صاحب کو قلمکاری کی دعوت دے رہی تھی۔

■■

فیض صاحب کی وفات پر جو لوگ آنسو بہا رہے
تھے تو ہمیں بے اختیار مرزا غالب یاد آئے اس لئے
نہیں کہ غالب اور فیض میں کچھ لفظی مماثلتیں موجود ہیں
بلکہ اس لئے کہ موت غالب کا نقطۂ اختتام نہیں تھا اور
غالب کی وفات میں اس کی فکری موت واقع نہیں ہوئی
تھی غالب کی شاعری میں جو لمحات نشاط ملتے ہیں ان میں
موت کے انتظار کو بھی بس لمحۂ نشاط ہی سمجھئے کہ غالب
کے نزدیک موت جبر مشیت نہیں بلکہ زندگی کی ایک ایسی
قدر ہے جسے قبول کرنا درحقیقت زندگی اثبات کرنا ہے اور
اور غالب نے موت کی شدت سے خواہش بھی کی اسے
لذت حاصل کرنے کا وسیلہ بھی بنایا اور اسے ایک مثبت
قدر سمجھ کر اس کی پرستش بھی کی۔

فیض صاحب کے لئے زیست کبھی آزار نہیں بنی،
اور سانس کبھی تلوار نہیں ہوئی انھوں نے تاجداری کی دلوں
کی تاجداری۔ لیکن اپنے تمام اختیارات اس محبوب کی نذر
کردیئے جس کی کھوئی ہوئی یاد رات کے وقت دل پر اترتی
تھی تو ویرانوں میں بہار آجاتی تھی، صحراؤں میں ہولے
ہولے باد نسیم چلنے لگتی تھی، اور بیمار کو بے وجہ قرار آجاتا تھا
فیض صاحب نے کسی ایسے ہی لمحے دہر کی بے اطمینانی کو یہ
کہہ کر آسودگی عطا کی تھی۔

اگلے روز فیض صاحب نے اپنے گھر میں دوستوں کو
یاد کیا تھا یہ ایسی تقریب تھی۔ جس کے لئے کوئی دعوت نامہ
جاری نہیں کیا گیا تھا۔ لیکن لوگ تھے کہ کھنچے چلے آتے
تھے، ہر ایک فیض سے ملنے کے لئے بے قرار، ہر ایک فیض

فیض

اب ہمیں فیض صاحب بے اختیار یاد آرہے تھے
عجب طرح دار شاعر تھا کہ وہ دونوں جہاں اس کی محبت
میں ہار کر وہ اس دنیا کو کمال اطمینان سے چھوڑ گیا تھا۔
اطمینان تو بڑی معمولی سی بات ہے کہ یہ ہم جیسے نان جویں
کے غلاموں کو روپے کی خوشبو سے ہی حاصل ہوجاتا ہے فیض
صاحب تو زندگی کے آنگن میں موت کا والہانہ استقبال کرنے
والوں میں سے تھے وہ اس کے خیر مقدم کے لئے جشن رقص
بپا کرنے کے عادی تھے۔ اور یہ کج کلاہی محض زبان نہیں
تھی، ان کا طرز حیات تھا اور ان کی آرزو تھی کہ

مستقبل میں کچھ تو رنگ جمے جشن رقص کا
رنگیں لہو سے پنجۂ صیاد کچھ تو ہو!

سے ملنے کا متمنی، ہر ایک کا دل فیض کے اشعار کا دیوان تھا
لیکن سب لب بستہ تھے، سب کی آنکھیں گریاں تھیں ہر ایک
خاموش تھا۔ غزل خوانوں سے غزل خوانی نہیں ہوئی تھی۔
نغمہ نگاروں کے نغمے سوئے ہوئے تھے۔ اور ان سب کے
درمیان فیض ایک لمبے سفر کے لئے آمادہ تھے، وہ عدم آباد
سے آئے تھے، اور زندگی کے مرغزاروں کو آباد کرنے کے
بعد اب واپس عدم آباد کو جارہے تھے۔ ایک صاحب کہنے
لگے "فیض کے سانحۂ ارتحال سے اردو شاعری بے سایہ ہوگئی
ہے۔" دوسرے صاحب کو یہ بات پسند نہ آئی انھوں نے
فی البدیہہ جواب دیا، "فیض زندگی کا ہمسایہ ہوگیا ہے۔" فیض
سفر آخرت پر روانہ ہونے سے پہلے اپنے چاہنے والوں کو

آخری پیغام لکھوا رہے تھے "خوش رہو جیتے رہو، شرارت کرو۔" اس محفل میں انور سدید تو موجود نہ تھے ہاں اداکار محمد علی کے ساتھ ڈاکٹر سلیم اختر تصویر کھینچوا رہے لیکن وہ اپنی نوٹ بک گھر پر بھول آئے تھے اس لئے فیض صاحب کا پیغام نوٹ نہ کر سکے، یہ پیغام عطاء الحق قاسمی نے سُنا اور ان لوگوں تک پہنچایا جو اپنی زنجیر پا کے قیدی ہیں شہرت بے مایہ کے لئے لڑتے ہیں، نہ جیتے ہیں نہ خوش ہوتے ہیں۔

فیض صاحب کے ایک مداح نے لکھا ہے کہ کھلی "تادیب کے برعکس کھوکھلی تعریف کاری ضرب لگاتی ہے۔ فیض صاحب نے زندگی بھر کھوکھلی تعریف کرنے والوں کو فاصلے پر رکھا اور اپنی زندگی صلیب و دار کی ہمسائیگی میں بسر کی یا رمیں نکل جاتے۔ ۱۹۷۶ء میں میرزا ظفرالحسن نے ان کی سالگرہ کا جشن منایا تو انھیں اپنے بارے میں باتیں کرنے کی دعوت دی فیض صاحب کی تقریر مختصری تھی اور اس کا حاصل یہ تھا کہ میں نے گفتگو کرتے ہوئے مجھے بڑی وحشت ہوتی ہے اور وحشت اس لئے بھی ہوتی ہے کہ دنیا کے جتنے بور لوگ ہیں ان کا سب سے محبوب مشغلہ یہی ہے کہ وہ اپنے بارے میں باتیں کرتے ہیں۔

اب ہمیں یہ تو معلوم نہیں کہ فیض صاحب نے اشارہ ہے تاہم جب ہم نے انھیں سفر آخرت پر روانہ ہوتے دیکھا تو ان کے چہرے پر کمال آسودگی تھی۔ ان کی آنکھوں کے متبسم گوشے دبے ہوئے تھے۔ اور ان کے ہونٹوں پر وہ

اور غالب

(کالی داس

بلاشبہ وہ ایک عظیم انسان تھا لیکن اس نے اس کا اعلان کئے بغیر عظمت کا اثبات اپنی ایسی باتوں سے کروایا جو بظاہر چھوٹی اور بے مایہ نظر آتی ہیں لیکن جن میں ایک جہانِ معنی چھپا ہوا تھا علامہ اقبال سے اپنی ملاقات کا ایک واقعہ انھوں نے یوں بیان کیا۔

علامہ اقبال کا اثر ہم پر بہت تھا ان سے دو چار بار ملے ان کے پاس بیٹھے مگر انھوں نے ہم سے کبھی شاعری پر بات نہیں کی۔ اور کیوں کہ ہمارے ابا کے دوست تھے اس لئے ہم بھی ان سے سوال نہیں کرتے تھے۔

ان کا طریق زندگی "فریبا ہمدردی نہواں ہو" کی مثال تھا، خودنمائی ان کو چھو کر بھی نہیں گئی تھی ایسے مواقع ان کی زندگی میں بارہا آئے۔ لیکن وہ پہلو بچا کر گزرے جاوداں مسکراہٹ رقصاں تھی جو فیض صاحب کی شخصیت کا ایک جزو ہے اور یہ زندہ تبسم مونالیزا کی مسکراہٹ کی طرح ان کے کروڑوں مداحوں کے دلوں پر ہمیشہ حکمرانی کرتا رہے گا اور یہ ان کا سفر آخرت ہرگز نہیں تھا ایک صاحب بولے آہ! فیض کی شام حیات آگئی۔" فیض کا ایک دیوانہ اس سے الجھ پڑا آپ غلط کہہ رہے ہیں یہ تو فیض کی صبح دوام زندگی ہے۔ "یہ دیوانہ غالباً ساجد تھا" لیکن اس نے کسی اخبار کو بیان نہیں دیا کسی کیمرہ مین کو تصویر نہیں اتارنے دی وہ تو بس فیض کو یاد کر رہا تھا۔ گریاں دل کے ساتھ، زخمی احساس کے ساتھ۔ اور ہم جیسے دنیا داروں سے پوچھ رہا تھا۔ یارو! فیض کی صبح دوام زندگی سے سیاسی فائدے کیوں اٹھا رہے ہو؟

"اب شہر میں تیرے کوئی
ہم سا بھی کہاں ہے"

فیض کی شاعری سے نہ صرف یہ شرخی لی گئی ہے اگر چاہوں تو یہ سارا مضمون اس کے شعروں سے بھر سکتا ہوں۔ فیض کی شاعری ذاتی شاعری تھی (جیسے سب شاعری کو ہونا چاہیے) کیوں کہ ان کا دل اور دماغ ترقی پسند تحریکات سے ہم آہنگ تھا۔ اس لئے وہ "عالمی" بلکہ "آفاقی" شاعر بھی تھے۔

دو تین برس ہوئے ہم ایک دوسرے سے بھوپال میں ملے — اور باتوں کے علاوہ بیروت میں جو خون بہہ رہا تھا اس کا بھی ذکر آیا۔

چڑھا دیئے ہیں۔

پہلے وہ امرتسر کے ایک کالج میں تقسیم ہند سے پہلے انگریزی کے پروفیسر تھے۔ تقسیم ہند کے بعد لاہور میں رہنا پسند کیا اور گورنمنٹ کالج میں پروفیسر ہوئے۔

ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہوئے اور ان کی شاعری بھی ترقی پسند تحریک کی ترجمان بن گئی۔

پاکستان کے اولین دور میں راولپنڈی سازش کیس میں ملوث ہو کر گرفتار ہوئے اور کئی برس جیل میں رہے۔ جہاں انہوں نے وہ نظم کہی جس کا ایک شعر ہی ترقی پسند شاعری کا انقلابی منشور ہے ؎

فیض احمد فیض

خواجہ احمد عباس

تب فیض نے ایک چھوٹی سی اپنی نظم سنائی جو کہ فلسطین کے مجاہدین اور تارک الوطن مرد اور عورتوں کے بارے میں تھی۔ یہ نظم انہوں نے فلسطینیوں کے کیمپ میں بھی سنائی تھی اور یہ کمال تھا کہ ساتھ میں نہ کوئی سنگیت تھا اور نہ کوئی آہنگ تھا مگر شاعر جوان کی زندگی کا حال بیان کر رہا تھا کوئی آنکھ نہیں تھی جو آنسوؤں سے بھری نہیں تھی۔ وہ فیض کی زبان نہیں سمجھتے تھے۔ یہی نظم انہوں نے بھوپال میں بھی سنائی اور یہاں بھی سننے والوں کی وہی حالت ہوئی جو کہ بیروت والوں کی بیان کی تھی۔ وہی بھوپال والوں کی حالت تھی۔ شاید کوئی آنکھ ہو جو نم نہ ہوئی ہو۔

فیض احمد فیض کی زندگی میں کتنے ہی اتار

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے

یہ شعر انہوں نے اس وقت کہا تھا جب ان پر راولپنڈی سازش کیس چل رہا تھا اور ہر قسم کی پابندی ان پر لگادی گئی تھی۔ کاغذ اور قلم پر بھی پابندیاں تھیں دوسرے غیر سیاسی قیدی بھی فیض سے مرعوب تھے۔ اس لئے جب وہ دو تین سال کے بعد رہائی پاتے تو فیض احمد فیض کے پاس آتے اور ایک پیغام ان کے باہر جو بھی ساتھی تھے ان کے نام لے جاتے۔ یہ پیغام زبانی ہوتا اور شعروں کی شکل میں ہوتا۔ باہر جو ساتھی تھے ان میں کھلبلی پھیل جاتی۔

"کیا ہوا جو اتنے خوش نظر آ رہے ہو؟"

"میرے بھائی فیض احمد فیض کا ایک اچھا پیغام جیل سے آیا ہے!"

"کوئی شعر ہے یا پوری غزل!"

"پوری غزل معلوم ہوتی ہے، سنو گے پھڑک جاؤ گے!"

ایک منشور، ایک چیتاونی

"متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے"

شعر کیا تھا اس شعر میں دنیا کے انقلاب کا ایک مشہور شعر تھا، ایک پیغام تھا، ایک چیلنج تھا۔

فیض نے کوئی نثری ریکارڈ اپنی زندگی کے بارے میں نہیں چھوڑا۔ ویسے ان کی ہر غزل اور ہر نظم اپنے پڑھنے والوں کے نام ایک محبت بھری چٹھی ہے۔ مگر اس کو یہی سمجھ کر پڑھنا چاہئے بعض اوقات تو وہ لمبے لمبے خطوں کا جواب یہی شعر یا اشعار میں دیا کرتے تھے۔

اس طرح اس شاعر کی زندگی کی یادوں کی کہانی — جو ہر طریقے سے بیان کی جا سکتی ہے اس کے شعروں کی شرح اور کس کے نام ہیں اس کی جیونی کے ذریعہ کی جا سکتی ہے کون نوجوان نثر نگار اس کا بیڑہ اٹھائے گا سب فیض کے چاہنے والے، سب تنقید نگار اور اس کے سب دوست اپنی یادوں کو کریدیں گے تو بات بن جائے گی اس میں مسز فیض کا اپنی یادوں کو قلم بند کر دینے سے ہی پورا کام نہیں ہو سکتا ہے کیوں کہ پردہ در پردہ ہزاروں مردوں اور عورتوں سے ان کے روحانی اور سماجی تعلقات تھے۔ جن میں ان کی بیوی کے علاوہ ان کے دوستوں اور ہم عصروں کا کافی حصہ ہے

فیض کی خود لکھی ہوئی کوئی پوری سوانح عمری اگرچہ نہیں ہے مگر (ہندوستان میں کم اور پاکستان میں زیادہ) بہت کچھ دوسروں نے لکھا ہے۔

اس سلسلے میں "متاعِ لوح و قلم" بہت اہم ہے کیوں کہ اس میں فیض کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے فیض کی تقریریں، اہم مضامین جو لکھے گئے اور نشر ہوئے ریڈیو کی تقریریں دیباچے، جو فیض صاحب نے لکھے ہیں، انٹرویو جو اخباروں کو دیا۔ ریڈیو کو دئے گئے ڈرامے اور فلم جو انہوں نے لکھے اور ترتیب دئے اور سب سے اہم حصہ وہ ہے جس میں فیض کے خطوط ہیں سب کے نام (جو پاکستان یا ہندوستان کے علاوہ) دوسرے دوستوں کے نام لکھے گئے ہیں۔

ہندوستان کا دُکھ

فیض کے پاکستان میں انتقال پر بھی پیغامات جو ہندوستان سے بھیجے گئے ان میں راشٹرپتی گیانی ذیل سنگھ اور پرائم منسٹر راجیو گاندھی کے نام بھی ہیں:-

ہر بار جب وہ ہندوستان آئے تو انہوں نے اس کو بھی اپنا وطن یا عزیز ملک سمجھا اور پایا۔ فیض کا یہ شعر بہت معنی خیز ہے جو اس کتاب کا تھیم (THEME) ہے

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

فیض صاحب نے نماز کی امامت کی

اقبال تاجر

ہم ادیب، شاعر اور نہ افسانہ نگار جب ہم نے لکھنے کے لیے قلم اٹھایا سمجھ میں نہ آیا کہ کیسے شروع کریں۔ فیض صاحب کا بھولا بھالا اور معصوم چہرہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے اور سوچ میں گم ہو کر جدھر نظر اٹھتی ہے وہیں دیکھتے رہ جاتے ہیں۔

فیض صاحب کے انتقال سے چند روز پیشتر میں اسلام آباد گیا۔ قدوس اکیڈمی آف آرٹس کی بیگم سرفراز جن کے ہاں فیض صاحب اکثر قیام کیا کرتے تھے۔ ملتے ہی پوچھنے لگیں کیسا چل رہا ہے "گلشن کا کاروبار"۔ میں نے کہا ہمارا حال فیض صاحب کی معرفت پوچھا جا رہا ہے؟ کہنے لگیں چند ہی روز پہلے تو آئے ہوئے تھے۔ آپ کا بہت ذکر رہا۔ میں نے بھی اسی روز اسلام آباد سے فیض صاحب کو لاہور فون کیا جب معمول کہنے لگیں۔ بھئی کہاں ہو کیسے ہو؟ میں نے کہا چودھویں کی راتوں کا سال ہونے کو ہے اور آپ کو پھر رونق بخشنی ہے اس دفعہ میں میڈم نورجہاں سے آپ کی غزلیں سننے کی درخواست کر رہا ہوں۔ فیض صاحب نے جواب دیا بھئی

شالامار ہاؤس ریستوران کراچی میں اقبال تاجر کے زیر اہتمام چودھویں رات کی تقریب منعقد ہوتی ہے ایسی ہی ایک تقریب میں فیض احمد فیض مہمان خصوصی تھے۔

دائیں سے بائیں: اقبال تاجر، ایک دوست اور فیض احمد فیض

وہ غزلیں اب اُس کی ہیں۔ میں نے وہ نورجہاں کو دے دی ہیں۔ میں آجاؤں گا کچھ دن پہلے بتا دینا۔ وقت ہو تو کراچی جاتے ہوئے ملتے جانا۔ ایلس بھی یاد کر رہی ہے۔

یہ میری فیض صاحب سے آخری بات چیت تھی۔ مجھے معلوم ہوتا کہ چند دن بعد فیض صاحب ہمیشہ کے لئے ہم سے بچھڑ جائیں گے تو میں انھیں آخری بار مل تو لیتا۔ میں نے اخبار میں پڑھا کہ فیض صاحب اپنے گاؤں گئے ہیں تو اسلام آباد سے سیدھا کراچی آگیا۔ یہاں مجھے اسلام آباد سے ہی فون آیا۔ میں مزے مزے کی باتیں کر رہا تھا۔ فون کرنے والی نے کہا اقبال تمہیں کیا ہو گیا ہے کیسی باتیں کر رہے ہو۔ تمہیں پتہ نہیں فیض صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔ میں زور سے چیخا نہیں۔ اور میں زار و قطار رونے لگا میں اپنے والد کی وفات کے بعد کبھی بھی کسی عزیز کے اس دنیا سے رخصت ہوتے پر اس طرح نہیں رویا تھا۔ جتنا اس دن میں چلا چلا کر رو رہا تھا۔ کئی گھنٹے کے بعد طبیعت ذرا سنبھلی تو فیض صاحب کے گھر فون کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ پھر اسلام آباد ہی فون کر کے پوچھا یہ کب اور کیسے ہوا۔ وہ تو اچھے بھلے تھے۔ تفصیل جاننے کے بعد میں پھر روتا رہا۔ ان کے ساتھ گذرا ہوا۔ ایک ایک پل، ان ہنسنا، اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا ان کی باتیں سب یاد آرہی تھیں، ابھی چند ماہ پہلے ہی تو جب میں نے انھیں فون کیا تھا کہ مجھے ابھی ایک غزل لکھ کر دیں جس میں چاندنی کا ذکر ہو جسے ابھی مہدی حسن خاں سے گانے کے لئے کہنا ہے۔ فیض صاحب نے فوراً ہی یہ غزل لکھ دی۔

آپ کی یاد آتی رہی رات بھر
چاندنی دل دکھاتی رہی رات بھر
ایک امید سے دل بہلتا رہا
اک تمنا ستاتی رہی رات بھر

بہت لوگ ہیں جنہوں نے فیض صاحب صرف شاعری کے ساتھ عمر گزاری ہے۔ مگر میں فیض صاحب کے اُن عقیدت مندوں میں سے ہوں جسے گزشتہ پندرہ سالوں میں کئی بار فیض صاحب کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا ہم کئی کئی دن اور رات اکٹھے رہے ہیں۔

فیض صاحب سے ملنے سے پہلے یوں تو اُن کے ہر طرف چرچے رہے۔ اُن کی کچھ غزلیں بہت مشہور تھیں میں کوئی بھی رسالہ دیکھتا تو سب سے پہلے فیض احمد فیض کا نام تلاش کیا کرتا تھا، محترمہ سحاب قزلباش شاعرہ سے میری ملاقات تھی اور انھوں نے وعدہ کر رکھا تھا کہ فیض سے ملائیں گی اور انھوں نے ہی ملایا۔ ملاقات سے پہلے سوچا کرتا تھا فیض صاحب کیسے ہوں گے۔ کیسے ملیں گے۔ مگر ان سے ملنے کے چند ہی لمحے بعد یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے مدت سے آشنا ہیں۔ فیض صاحب ایک دلکش شخصیت کے مالک نکلے چمکتی ہنستی روشن آنکھیں، کشادہ پیشانی، معصوم اور شریف چہرہ، متوسط قد اور گدگدا ابھرا ہوا جسم۔

یہ ملاقات محترمہ سحاب قزلباش کے گھر پر ہی ہوئی تھی

ایک خاتون نے شعر کی فرمائش کی، اور اصرار کیا تو فیض صاحب سے پہلا شعر ہم نے یہ سُنا تھا۔

چاند دیکھا تیری آنکھوں میں نہ ہونٹوں پہ شفق
ملتی جلتی ہے شب غم سے تری دید اب کے

فیض صاحب جب پہلی دفعہ لندن میرے گھر آئے تو میرے لئے اس وقت خوشی کی انتہا نہ تھی جب انھوں نے وہاں ٹھہرنا قبول کر لیا تھا سب سے پہلی غزل جو دوستوں کی فرمائش پر فیض صاحب نے میرے ہاں سُنائی وہ یہ تھی۔

مہدی حسن (دائیں) اور فیض صاحب، چودھویں رات کی تقریب میں جہاں مہدی حسن نے فیض کے سامنے ان کی غزلیں گائیں۔

پھر دمِ دید رہے، دیدہ و دل دید طلب
پھر شبِ وصل ملاقات نہ ہونے پائے
فیض جو سر پہ ہر اک روز قیامت گزرا
ایک بھی روز مکافات نہ ہونے پائے

میں نے فیض صاحب کو کبھی بھی غزل یا شعر سنانے کے لئے نہیں کہا تھا وہ تو دوست احباب ہی ان سے کہلوایا کرتے تھے مجھے تو ان سے باتیں کر کے لطف آتا تھا۔ وہ بہت کم گو تھے مگر میرے باتونی ہونے کا برا نہیں مانتے تھے۔ وہ اپنے بارے میں بہت کم باتیں کرتے تھے کوئی سوال پوچھتا تو مختصر جواب دیتے۔ مگر اپنے، سچ سچ ادا کئے ہوئے جملوں میں اپنی وسعت نظر اور اعلیٰ ذوق سے اس قدر جان ڈال دیتے تھے کہ سننے والا دم بخود رہ جاتا۔

گو فیض صاحب بعض مکروہات کے عادی ہو گئے تھے مگر وہ اپنی ان بعض عادات کو واضح طور پر ناپسندیدہ قرار دیتے تھے۔ فیض صاحب کو مذہبی اشعار سے زیادہ لگاؤ نہیں تھا مگر وہ منکرِ اسلام ہرگز نہیں تھے۔ وہ اسلام کی ایک تعبیر اور تفسیر رکھتے تھے۔ ان کی وفات کے بعد مشہور کالم نویس عبدالقادر حسن نے ایک واقعہ لکھ کر بہت سے لوگوں کی غلط فہمی دور کر دی۔ عبدالقادر حسن صاحب نے لکھا کہ انتقال سے چند روز قبل وہ اپنے گاؤں گئے۔ تو وہاں کی مسجد جو اُن کے والد مرحوم نے بنوائی تھی اور یہ اس کی مرمت وغیرہ کے لئے کچھ نہ کچھ بھجواتے رہتے تھے۔ وہ دیکھنے گئے تو مغرب کی نماز ہونے والی تھی۔ فیض صاحب نے امام مسجد سے امامت کرنے کی اجازت چاہی۔ امام مسجد نے بخوشی مگر حیرانگی سے اجازت دے دی۔ اور فیض صاحب نے امامت کے فرائض سرانجام دیئے۔

اس واقعہ سے چند روز پہلے فیض صاحب نے اسلام آباد کی ایک تقریب میں کسی بات پر ہنستے ہوئے کہا تھا، یار لوں کو اب ہمارے اسلام کی خبر ہو گئی ہے۔ فیض صاحب اکثر جیل کے واقعات بتایا کرتے تھے۔ جیل کی سختیاں، الزامات تنقیدیں ان پر جو کچھ بھی بیتی، مگر اس کے باوجود ان کی انسان سے محبت کا حوصلہ نہیں ٹوٹا بلکہ انھوں نے تو کبھی کسی تنقید کا برا نہیں منایا کراچی جب میرے ہاں چودھویں رات کی تقریب میں آنے والے تھے اور جس کا میں نے کئی روز پہلے اشتہار بھی دے دیا تھا۔ اس پر جب تنقیدی کالم چھپے تو فیض صاحب نے اس تنقید کا ہرگز برا نہ منایا بلکہ تقریب شروع ہونے سے پہلے جب ایک رپورٹر نے اس طرف توجہ دلائی تو کہنے لگے کبھی اقبال ہمارا یار رہے۔ جب بھی بلائیں گے ہم آئیں گے۔ فیض صاحب نے اُسی رات کہا تھا شخصیات کا جنم فصل کی طرح نہیں ہوتا کہ بیج ڈالیں تو بڑے لوگ اُگ آئیں گے۔ انھوں نے کہا تھا جوہر اور صلاحیت تو

خداداد ذخیرہ ہے۔ اور جن میں کوئی جوہر ہو تو وہ اس کا کسی نہ کسی طرح اظہار کر دیتے ہیں۔ مگر زیادہ مواقع نہ ملنے سے وہ اپنی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ نہیں کر پاتے۔

لندن میرے ہاں ایک مخصوص سی محفل تھی ریکارڈ پلیئر پر ایک ریکارڈ میں فیض کی غزل گائی جا رہی تھی۔

پھر حریف بہار ہو بیٹھے
جانے کس کس کو آج رو بیٹھے

میں نے اپنے پاس بیٹھی ہوئی مسز خان کو جو میری مونہہ بولی خالہ تھیں۔ بتایا کہ یہ فیض صاحب کی غزل ہے وہ اور غور سے سننے لگیں۔

جب یہ شعر آیا ؎

ساری دنیا سے دور ہو جائے
جو ذرا تیرے پاس ہو بیٹھے

تو خالہ جان فیض صاحب کو دیکھتے ہوئے مجھے آہستہ سے کہنے لگیں "فیض صاحب ایسے لگتے تو نہیں" مجھ سے رہا نہ گیا میں نے فیض صاحب کو بتا دیا کہنے لگے بی بی ہم یہ صرف اپنے لئے ہی نہیں کہتے دُوسروں کے کام بھی آتا ہے اقبال سے پوچھ لیں اسے یہ شعر ضرور یاد ہو گا۔ لندن میں ان دنوں حلال گوشت اور مرغیاں عام ملتی تھیں مگر ایک روز ڈرائیور ایک فارم سے دو زندہ مرغیاں لے آیا میں انھیں ذبح کرنے کے لئے باغیچہ میں لے گیا۔ مرغیوں کا شور سن کر میری پانچ چھ سالہ بھانجی بھی میرے پیچھے آ گئی۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ گھر پر مرغی ذبح کی جانے والی تھی۔ جوں ہی میں نے مرغی کو ذبح کرنے کے لئے زمین پر لٹایا اور چھری ہاتھ میں پکڑی میری بھانجی چیخ مار کر میری ٹانگوں سے لپٹ گئی اور روتے ہوئے شور مچا دیا نہیں مارنا میں عجیب کشمکش و پیچ میں پڑ گیا۔ ادھر سے شور سن کر فیض صاحب بھی آ گئے دیکھتے ہی ساری بات سمجھ گئے مجھے کہا اس کے سامنے ذبح نہ کرو۔ میں نے مرغی چھوڑ دی اور بچی نے آنسو پونچھ لئے۔ اسی لمحے ایک صحافی دوست آ گئے۔ میں نے انھیں باغیچہ ہی میں بلا لیا۔ فیض صاحب نے اسے بتایا کہ کس طرح بچی نے چیخ چلا کر مرغی کی جان بچالی پھر فیض صاحب سنجیدہ ہو گئے کہنے لگے ہم انسان، انسانوں کو انسانوں کا خون کرنے سے روکنے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔ انسان کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے۔ ستاروں پر کمندیں ڈال دی ہیں۔ مگر اپنی دنیا میں اپنی بربادی کے اڈے۔ بم۔ راکٹ توپیں بندوقیں ختم نہیں کر سکتے تھے۔ پھر خود ہی کہنے لگے کیا ہم میں امن پسند دیانت دار لوگوں کی اتنی تعداد بھی موجود نہیں جو سب کو ان ہتھیاروں کو ختم کرنے کے لیے منوا سکے۔ بجائے یہ کہ یہ ایک دوسرے پر قبضہ جمانے کی فکر میں لگے رہیں انھیں چاہیئے سب مل کر تسخیر کائنات کو چلیں جہاں جگہ کی کوئی تنگی نہیں اور نہ کسی کو کسی سے الجھنا پڑے گا۔ لامحدود فضائیں ہیں اور لاگنت دنیائیں ہیں فیض صاحب کی ان باتوں میں کتنی امن پسندی اور دیانت داری تھی۔

میں نے سعادت حسن منٹو کا لکھا ہوا کہیں پڑھا تھا کہ "جب وہ امرتسر کالج میں پڑھتے تھے تو وہ اپنے استاد فیض احمد فیض کے پیغام ان کی محبوبہ (جو غالباً ایک لیڈی ڈاکٹر تھیں) اور جن کا گھر کافی اونچائی (پہاڑی) پر تھا اسے پہنچایا کرتے تھے۔ میں نے ایک روز فیض صاحب سے جب یہ ذکر کیا تو وہی مختصر "بھئی وہ پرانی باتیں ہیں"۔ فیض صاحب نے تو یہ کہہ کر بات ختم کر دی۔ مگر میں سوچتا رہا کہ فیض احمد فیض جیسا شاعر کبھی بھی محبت کے جال سے رہا نہیں ہوا ہو گا۔

فیض صاحب کو پھولوں کا بے انتہا شوق تھا جیسے ہی ملنے والوں سے ذرا فرصت پاتے باغیچے میں چلے جاتے اور پھولوں کے پودوں کو اور کیاریوں کو پانی دینا اور کاٹنا

ایفرو ایشین رائٹرز کانفرنس منعقدہ تاشقند ۱۹۰ء میں رحمٰن بردی، نبی محمد، غلام ربانی تاباں، فیض احمد فیض اور حفیظ جالندھری

پھاڑنا شروع کر دیتے۔ کئی دفعہ میرے اٹھنے سے پہلے ہی باغیچہ میں موجود ہوتے ایک روز باغیچہ میں مجھے بتانے لگے کہ انھیں پھول خود اگانے کا بہت شوق ہے۔ جب وہ منٹگمری جیل میں تھے تو جیل کے احاطے میں ایک پھلواری بنالی تھی پھر یہ پھلواری پوری جیل میں پھیل گئی۔ فیض صاحب بتارہے تھے کہ وہ جیل میں پھولوں کے بیج اپنے گھر والوں سے کہہ کر لندن سے بھی منگوایا کرتے تھے۔ ان پھولوں کی دیکھ بھال میں خوب جی بہلتا تھا اور پھر تو ان پھولوں کی نیری جیل کے باہر بھی مہیا ہونے لگی تھی۔ چند ماہ پہلے جب فیض صاحب میری تقریب میں آئے تو میں نے انھیں سرخ گلاب کے پھولوں سے لاد دیا کہنے لگے اتنے پھولوں کی کیا ضرورت تھی۔ میں نے کہا مجھے معلوم تھا آپ یہی کہیں گے حالانکہ آپ کو سرخ گلاب کے پھول بہت پسند ہیں۔

فیض صاحب کی شاعری میں حسن و عشق کے پھول

گلشن، موسم، بہار اور مہک خوشبو کا تذکرہ زیادہ ملے گا اس پر ان کے چند مشہور شعر ہیں:

دشت تنہائی میں دوری کے خس و خاشاک تلے
کھل رہے ہیں ترے پہلو کے سمن اور گلاب

●

قفس ہے بس میں تمہارے، تمہارے بس میں نہیں
چمن میں آتشِ گل کے نکھار کا موسم

●

ہم اہل قفس تنہا بھی نہیں، ہر روز نسیم صبح وطن
یادوں سے معطر آتی ہے، اشکوں سے منور جاتی ہے

●

مہک رہی ہے فضا زلف یار کی صورت
ہوا ہے گرمیٔ خوشبو سے اس طرح سرمست

●

رات ڈھلنے لگی ہے، سینوں میں
آگ سلگاؤ آبگینوں میں
دل عشاق کی خبر لینا
پھول کھلتے ہیں ان مہینوں میں

●

فیض صاحب اور بیگم ایلس کا ساتھ بھی قابل رشک ہے وہ ان کی بیوی بھی تھیں اور ساتھی بھی فیض صاحب کہیں بھی ہوں، بیگم ایلس کا ذکر کرتے رہتے تھے میں نے بیگم ایلس فیض سے پوچھا تھا فیض صاحب آپ کا ذکر اور تعریف کرتے رہتے تھے۔ آپ فیض صاحب کے کیا کام کرتی ہیں۔ انھوں نے کہا میں فرانسیسی سے ترجمہ کرتی ہوں میں نے کہا تو یہ سچ ہے کہ ہر عظیم مرد کے پیچھے ایک عظیم عورت ہوتی ہے۔

پاکستان کی شاید ہی کسی حکومت کے ساتھ فیض صاحب کا سلسلہ دوستانہ رہا ہو۔ ریڈیو اور ٹی وی پر ان کے کلام کی تشہیر ان کی زندگی کے کئی ادوار میں ممنوع رہی۔ البتہ اب کچھ عرصے سے ان کا کلام نشر ہونا شروع ہو گیا تھا۔ ان کی وفات پر بھی ریڈیو پاکستان اور ٹیلیویژن نے خصوصی پروگرام نشر کئے۔ صدر پاکستان گورنروں اور اطلاعات کے سکریٹری جنرل مجیب نے انھیں اپنے پیغام میں عظیم شاعر اور دانشور تسلیم کیا۔

فیض صاحب نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ شخصیات زیج ڈالنے سے پیدا نہیں ہو جاتیں۔ فیض احمد فیض جیسا عظیم انسان دانشور اور شاعر صدیوں بعد ہی پیدا ہوتا ہے۔ فیض احمد فیض کے انتقال سے ایک عہد کا خاتمہ ہو گیا ہے ان کے جنازے میں ان کی تعریف کرنے والوں کے ساتھ ساتھ ان سے اختلاف کرنے والے اور ان پر تنقید کرنے والے بھی شامل تھے، مولوی، سیاستداں، وکیل، صحافی اور دانشور سب ہی فیض کو یاد کر رہے تھے اور ان کے لئے مغفرت کی دعا کر رہے تھے۔

میں نے ایک دفعہ فیض صاحب کا ایک انٹرویو پڑھا تھا جس میں انھوں نے کہا تھا کہ میں اگر کسی سے ناراض ہو جاؤں تو میں سو جاتا ہوں۔ فیض صاحب تو دشمنوں سے ناراض ہونے کے تو قائل ہی نہیں تھے، پھر کیا وہ دوستوں سے یا دوست نما دشمنوں سے ناراض ہو کر ہمیشہ کے لئے سو گئے۔

میرے چارہ گر کو نوید ہو صف دشمناں کو خبر کرو!
جو وہ قرض رکھتے تھے جان پر وہ حساب آج چکا دیا

■ ■

کچھ دستِ صبا کے بارے میں

سید سجاد ظہیر (مرحوم)
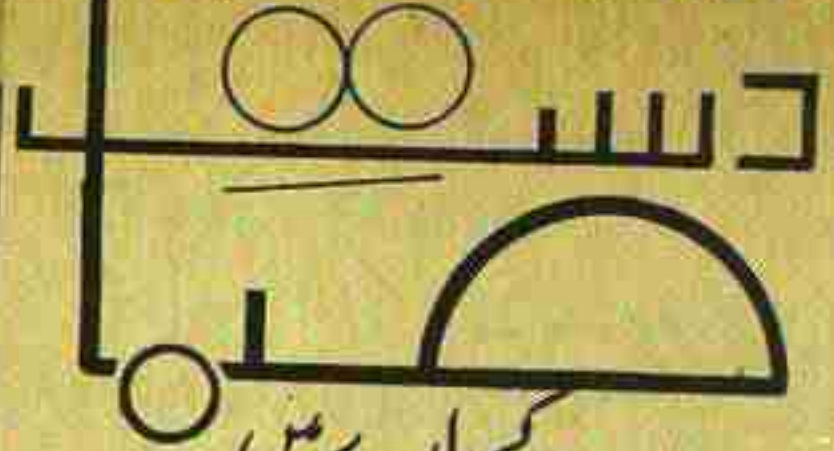
سجاد ظہیر (بائیں طرف) فیض احمد فیض کا ریڈیائی انٹرویو لیتے ہوئے

مقدمہ "سازش راول پنڈی" کے دنوں میں فیض کے ساتھ میں بھی سنٹرل جیل (حیدر آباد، سندھ) میں تھا۔ دسمبر ۱۹۵۲ء تک ہمارے مقدمے کی سماعت ختم ہو چکی تھی۔ ہمیں روز روز اسپیشل ٹریبونل کے اجلاس میں جا کر ملزموں کے کٹہرے میں گھنٹوں بیٹھے رہنے اور اس دوران گواہوں کی شہادتوں وکیلوں کی جرح اور بحث اور معزز ججوں کی فاضلانہ قانونی موشگافیوں سے نجات مل گئی تھی۔ ابھی فیصلہ نہیں سنایا گیا تھا اور ہم امید و بیم کے عالم میں تھے "وچھٹی" وافر تھی۔ انھیں دنوں ایک دن یہ اطلاع ملی کہ "دستِ صبا" شائع ہو گئی۔ گو ہم اس کی تمام چیزیں فیض کے مونہہ سے سن چکے تھے، اور انھیں بار بار پڑھ چکے تھے، لیکن اس خبر سے ہم میں سے تمام اُن قیدیوں کو جو ادب سے مَس رکھتے تھے، ایک غیر معمولی مسرت ہوئی۔ جیل کے حکام سے اجازت لے کر ہم نے ایک پارٹی بھی کر ڈالی جس میں ہم تمام قیدیوں نے مل کر فیض کو "دستِ صبا" کی اشاعت پر مبارکباد دی۔ اس موقع پر منجملہ اور باتوں کے میں نے یہ کہا تھا کہ بہت عرصہ گذر جانے کے بعد، جب لوگ راول پنڈی سازش کے مقدمے کو بھول جائیں گے اور پاکستان کا مورخ ۱۹۵۲ء کے اہم واقعات پر نظر ڈالے گا تو غالباً اس سال کا سب سے اہم تاریخی واقعہ نظموں کی اس چھوٹی سی کتاب کی اشاعت کو ہی قرار دیا جائے گا۔ بہت دنوں سے لوگ جن میں بعض نیک اندیش اور بعض بد اندیش ہیں اردو ادب اور خاص طور پر اُس کی ترقی پسند صنف پر جمود طاری ہونے یا اس کے انحطاط کی باتیں کر رہے ہیں۔ میں اس نقطۂ نظر کو صحیح نہیں سمجھتا بلکہ میرا خیال ہے کہ اردو ادب کا جدید دور اس کے روشن ترین ادوار میں سے ہے۔ یہ دَور تقریباً ۱۹۳۰ء سے شروع ہوتا ہے۔ اور ابھی تک جاری ہے اور اگر ہم گزشتہ چار یا پانچ سال کو ہی لے لیں تو میرے خیال میں فیض کی "دستِ صبا" اور "زنداں نامہ" ندیم قاسمی کی "شعلۂ گل"، سردار جعفری کی "پتھر کی دیوار" احتشام حسین کی "تنقید اور عملی تنقید" اور مجنوں گورکھپوری کی "نقوش و افکار" (منجملہ دیگر کتابوں کے) اس دعوے کی شہادت میں کافی ہیں کہ تخلیق کا سرخ شعلہ، جس میں گرمی بھی ہے، حرکت بھی، توانائی بھی "نامساعد حالات میں نہ دھیما ہوتا ہے اور نہ بجھتا ہے"، بلکہ جہل و رجعت کی کالی آندھیاں اسے اور بھی بھڑکاتی ہیں اور اس طرح مجاہدے اور تصادم کے طوفانوں سے گذر کر اور اس پیکار سے قوت و حرارت حاصل کر کے حق و صداقت کا نور پہلے سے بھی زیادہ درخشاں ہو جاتا ہے اور اس کے حسن اور تاثر میں صد رنگ نئی تابندگیاں جھلملانے لگتی ہیں۔ "زنداں نامہ" کی بیشتر منظومات فیض نے منٹ

گومری سنٹرل جیل اور لاہور سنٹرل جیل میں قیام کے دوران لکھیں۔ یعنی جولائی ۱۹۵۳ء سے مارچ ۱۹۵۵ء تک کی لکھی ہوئی چیزیں اس میں ہیں۔ اس درمیان میں ہم ایک دوسرے سے بچھڑ گئے تھے۔ کیوں کہ ہم دونوں کو چار چار سال قیدِ بامشقت سزا دینے کے بعد اہلِ اقتدار نے یہ فیصلہ کیا کہ ہم ایک ساتھ جیل میں رکھے جائیں۔ فیض کو پنجاب میں مانٹ گمری جیل کو بھیجا گیا اور مجھے حیدر آباد سندھ سے بلوچستان کے سنٹرل جیل مچھ کو۔ ہم ایک دوسرے سے خط و کتابت بھی نہ کر سکتے تھے۔ تاہم دوسرے دوستوں کے خطوط اور بعض اردو رسالوں کے ذریعے مجھے فیض کی چند غزلیں اور نظمیں جو اس زمانے میں لکھی گئیں پڑھنے کا موقع مل جاتا تھا۔

اب کہ حالاتِ زندگی میرے کافی خوشگوار ہیں اور میں آزاد فضا میں سانس لے سکتا ہوں اس کے باوجود جب میں ان ذہنی جذباتی اور روحانی کیفیات کا خیال کرتا ہوں جو مجھ پر اُس وقت طاری ہوتی تھیں جب اپنے اس محبوب ترین دوست اور ہمدم کا کلام پڑھتا تھا۔ تو اس کا اظہار مشکل معلوم ہوتا تھا۔ شاید بے لاگ تنقید کے لئے یہ اچھا بھی نہیں ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ چونکہ ہمارے بہت سے تجربے زندگی اور اپنے وطن کو ثمر بار اور حسین بنانے کے متعلق ہمارے خواب، ہمارا درد، ہماری نفرتیں اور رغبتیں مشترک تھیں اس لئے فیض کے ان اشعار سے میں غیر معمولی طور پر متاثر ہوتا تھا۔ اگر میرا دل کبھی خون کے آنسو روتا تھا کہ قید و بند کے مصائب اور صعوبتیں اس کا حصہ کیوں ہیں جو اپنی حسن کاری سے سب کی زندگی کو اپنی فیاضی سے مرصع کر دیتا ہے اور اپنی نغمگی سے ہم سب کی رگوں میں سرور کی نہریں بہا دیتا ہے تو کبھی میرا ذہن اس کی تخئیل کی شاداں اور فرحاں گل کاریوں سے کسبِ شعور کرتا جہاں جدید علم کی ضیا پاشیاں انسانیت کے شریف ترین جذبات سے اس طرح مل گئی ہیں جیسے شعاعِ مہر سے تمازت۔

فیض کی ان نظموں کو مجموعی حیثیت سے دیکھیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک ان اقدار کا تعلق ہے جن کو شاعر نے ان میں پیش کیا ہے وہ تو وہی ہیں جو اس زمانے میں تمام ترقی پسند انسانیت کی اقدار ہیں لیکن فیض نے ان کو اتنی خوبی سے اپنایا ہے کہ وہ نہ تو ہماری تہذیب و تمدن کی بہترین روایات سے الگ نظر آتی ہیں اور نہ شاعر کی انفرادیت اس کا نرم، شیریں اور مترنم اندازِ کلام کہیں بھی ان سے جدا ہوا ہے اس کے متحرک اور رواں استعاروں سے ہمارے وطن کے پھولوں کی خوشبو ہے اس کے خیالات میں ان سچائیوں اور جمہوری مقاصد کی چمک سے ہماری قوم کی عظیم اکثریت کے دل روشن ہیں۔ اگر تہذیبی ارتقا کا مطلب یہ ہے کہ انسان مادی اور روحانی عسرت سے نجات حاصل کر کے اپنے دلوں میں گداز، اپنی بصیرت میں حق شناسی اور اپنے کردار میں استقامت و رفعت پیدا کریں اور ہماری زندگی مجموعی اور انفرادی حیثیت سے بیرونی اور اندرونی طور پر مصفا بھی ہو اور معطر بھی، تو فیض کا شعر غالباً ان تمام تہذیبی مقاصد کو چھو لینے کی کوشش کرتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ پاکستان اور ہندوستان میں اس کی غیر معمولی مقبولیت کا سبب یہی ہے۔ البتہ فیض کے تمام چاہنے والے 'نقش فریادی' 'دستِ صبا' اور زنداں نامہ کے شیدا ہونے کے باوجود ان سے یہ توقع اور امید رکھتے ہیں کہ کمیت اور کیفیت دونوں لحاظ سے اُن کی وہ تخلیقیں جو ابھی نہیں ہوئیں، ان کے مقابلے میں جو کہ وہ کر چکے ہیں۔ زیادہ گراں قدر ہوں گی۔ ■■

سجّاد ظہیر کے نام

اپنے دوست سجاد ظہیر کی موت پر یہ نظم فیضؔ نے دہلی میں ستمبر ۱۹۷۳ میں لکھی جب وہ ماسکو سے سجاد ظہیر کا جسدِ خاکی لے کر دہلی آئے تھے۔

نہ اب ہم ساتھ سیرِ گل کریں گے
نہ اب مِل کر سرِ مقتل کریں گے

حدیثِ دلبراں باہم کریں گے
نہ خونِ دل سے شرحِ غم کریں گے

نہ لیلائے سخن کی دوست داری
نہ غم ہائے وطن کی اشکباری

سُنیں گے نغمۂ زنجیر مل کر
نہ شب بھر مِل کے چھلکائیں گے ساغر

'بنامِ شاہدِ نازک خیالاں'
بیادِ مستیٔ چشمِ غزالاں

بنامِ انبساطِ بزمِ رنداں
بیادِ کلفتِ ایّامِ زنداں

صبا اور اس کا اندازِ تکلّم
سحر اور اس کا آغازِ تبسّم

فضا میں ایک ہالہ سا جہاں ہے
یہی تو مسندِ پیرِ مغاں ہے

سحرگہ اب اسی کے نام ساقی
کریں اتمامِ دورِ جامِ ساقی

بساطِ بادہ و مینا اُٹھالو
بڑھا دو شمعِ محفل بزم والو

پیو اب ایک جامِ الوداعی
پیو اور پی کے ساغر توڑ ڈالو

فیضؔ اور سجاد ظہیر

فیض کی ایک یادگار تقریر

فیض صاحب کی تقریر جو انہوں نے ماسکو میں بین الاقوامی لینن امن عام کے پُر شکوہ تقریب کے موقع پر اُردو زبان میں کی۔

محترم اراکین مجلسِ صدارت، خواتین اور حضرات!

الفاظ کی تخلیق و ترتیب شاعر اور ادیب کا پیشہ ہے، لیکن زندگی میں بعض مواقع ایسے بھی آتے ہیں جب یہ قدرت کلام جواب دے جاتی ہے۔ آج عجز بیان کا ایسا ہی مرحلہ مجھے بھی درپیش ہے، ایسے کوئی الفاظ میرے ذہن میں نہیں آرہے ہیں جن میں اپنی عزت افزائی کے لئے لینن پرائز کمیٹی سوویت یونین کے مختلف اداروں، دوستوں اور آپ سب خواتین اور حضرات کا شکریہ خاطر خواہ طور سے ادا کرسکوں لینین امن انعام کی عظمت تو اسی ایک بات سے واضح ہے کہ اس سے لینن کا محترم نام اور مقدس لفظ وابستہ ہے لینن جو دورِ حاضر میں انسانی حریت کا سب سے بزرگ علم بردار ہے اور امن جو انسانی زندگی اور اس زندگی کے حسن و خوبی کی شرطِ اول ہے مجھے اپنی تحریر و عمل میں ایسا کوئی کام نظر نہیں آتا جو اس عظیم اعزاز کے شایانِ شان ہو لیکن اس عزت بخشی کی ایک وجہ ضرور ذہن میں آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ جس تمنا اور آدرش کے ساتھ مجھے اور میرے ساتھیوں کو وابستگی رہی ہے یعنی امن اور آزادی کی تمنا وہ بجائے خود اتنی عظیم ہے کہ اس واسطے سے ان کے حقیر اور ادنیٰ کارکن بھی عزت اور اکرام کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔

یوں تو ذہنی طور سے مجنون اور جرائم پیشہ لوگوں کے علاوہ سب ہی مانتے ہیں کہ امن اور آزادی بہت حسین اور تابناک چیزیں ہیں اور یہ سب ہی تصور کرسکتے ہیں کہ امن گندم کے کھیت ہیں اور سفیدے کے درخت، دُلہن کا آنچل ہے اور بچوں کے ہنستے ہوئے ہاتھ، شاعر کا قلم ہے اور مصور کا موئے قلم اور آزادی ان سب صفات کی ضامن اور غلامی ان سب خوبیوں کی قاتل ہے جو انسان اور حیوان میں تمیز کرتی ہے یعنی شعور اور ذہانت انصاف اور صداقت، وقار اور شجاعت، نیکی اور رواداری، اس لئے بظاہر امن اور آزادی کے حصول اور تکمیل کے متعلق ہوش مند انسانوں میں اختلاف کی گنجائش نہ ہونا چاہئے لیکن بدقسمتی سے یوں نہیں ہے، اس لئے نہیں ہے کہ انسانیت کی ابتدا سے اب تک ہر عہد اور ہر دور میں متضاد عوامل اور قوتیں برسرِ عمل اور برسر پیکار ہیں یہ قوتیں ہیں تخریب و تعمیر، ترقی اور زوال، روشنی اور تیرگی، انصاف دوستی اور انصاف دشمنی کی قوتیں، یہی صورت آج بھی ہے اور اسی نوعیت کی کشمکش آج بھی جاری ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ آج کل انسانی مسائل اور گزشتہ دور کی انسانی اُلجھنوں میں کئی نوعیتوں

سے فرق بھی ہے۔ دورِ حاضر میں جنگ سے دو قبیلوں
کا باہمی خون خرابہ مُراد نہیں ہے نہ آج کل امن سے
خون خرابے کا خاتمہ مُراد ہے۔ آج کل جنگ اور امن کے
معنی ہیں ابنِ آدم کی بقا اور فنا۔ بقا اور فنا ان دو لفظوں
پر انسانی تاریخ کے خاتمے یا تسلسل کا دارومدار ہے
انہیں پر انسانی سرزمین کی آبادی اور بربادی کا انحصار
ہے۔ یہ پہلا فرق ہے۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ اب سے پہلے انسانوں کو
فطرت کے ذخائر پر اتنی دسترس اور پیداوار کے ذرائع
پر اتنی قدرت نہ تھی کہ ہر گروہ اور برادری کی ضرورتیں پوری
طرح سے تسکین پا سکتیں، اس لئے آپس میں چھین جھپٹ
اور لوٹ مار کا کچھ نہ کچھ جواز بھی موجود ہے لیکن اب یہ
صورت نہیں ہے۔ اب انسانی عقل، سائنس اور صنعت
کی بدولت اس منزل پر پہنچ چکی ہے کہ جس میں سب تن بخوبی
پل سکتے ہیں اور سب ہی جھولیاں بھر سکتی ہیں، بالشرطیکہ
قدرت کے یہ بے بہا ذخائر پیداوار کے یہ بے اندازہ
خرمن اجارہ داروں اور مخصوص طبقوں کی تسکین ہوس
کے لئے نہیں بلکہ جملہ انسانوں کی بہبود کے لئے کام میں
لائے جائیں۔ اور عقل اور سائنس اور صنعت کی کُل ایجادیں
اور صلاحیتیں تخریب کے بجائے تعمیری منصوبوں میں صرف
ہوں لیکن یہ جب ہی ممکن ہے کہ انسانی معاشرے میں
ان مقاصد سے مطابقت پیدا ہو اور انسانی معاشرے

کے ڈھانچے کی بنائے موسعِ استحصال اور اجارہ داری
کے بجائے انصاف، برابری آزادی اور اجتماعی خوش
حالی میں اٹھائی جائیں۔ اب یہ ذہنی اور خیالی بات نہیں
عملی کام ہے اس عمل میں امن کی جدوجہد اور آزادی کی
جدوجہد کی حدیں آپس میں مل جاتی ہیں۔ اس لئے کہ امن
کے دوست اور دشمن اور آزادی کے دوست اور دشمن
ایک ہی قبیلے کے لوگ، ایک ہی نوع کی قوتیں ہیں۔ ایک
طرف وہ سامراجی قوتیں ہیں جن کے مفاد جن کے اجارے
جبر اور حسد کے بغیر قائم نہیں رہ سکتے اور جنہیں ان اجاروں
کے تحفظ کے لئے پوری انسانیت کی بھینٹ بھی قبول
ہے۔ دوسری طرف وہ طاقتیں ہیں جنہیں بنکوں اور کمپنیوں
کی نسبت انسانوں کی جان عزیز ہے جنہیں دوسروں پر
حکم چلانے کی بجائے آپس میں ہاتھ بٹانے اور ساتھ
مل کر کام کرنے میں زیادہ لطف آتا ہے سیاست و اخلاق
ادب اور فن، روزمرہ زندگی غرض کئی محاذوں پر کئی صورتوں
میں تعمیر اور تخریب انسان دوستی اور انسان دشمنی کی یہ
چپقلش جاری ہے۔ آزادی پسند اور امن پسند لوگوں
کے لئے ان میں سے ہر محاذ اور ہر صورت پر توجہ دینا
ضروری ہے۔ مثال کے طور پر سامراجی اور غیر سامراجی قوتوں
کی لازمی کشمکش کے علاوہ بدقسمتی سے بعض ایسے ممالک
میں بھی شدید اختلافات موجود ہیں جنہیں حال ہی میں
آزادی ملی۔ ایسے اختلافات ہمارے ملک پاکستان
اور ہمارے سب سے قریبی ہمسایہ ہندوستان میں موجود
ہیں۔ بعض عرب ہمسایہ ممالک میں موجود ہیں اور بعض افریقی
حکومتوں میں موجود ہیں جو امنِ عالم اور انسانی برادری کی دوستی
اور یگانگت کو پسند نہیں کرتیں۔ اس لئے صلح پسند اور
امن دوست صفوں میں ان اختلافات کے منصفانہ
حل پر غور و فکر اور اس حل میں امداد دینا بھی لازم ہے۔

اب سے کچھ دن پہلے جب سوویت فضاؤں کا
تازہ کارنامہ ہر طرف دنیا میں گونج رہا تھا تو مجھے بار بار یہ
خیال آتا رہا کہ آج کل جب ہم ستاروں کی دنیا میں بیٹھ کر
اپنی ہی دنیا کا نظارہ کر سکتے ہیں تو چھوٹی چھوٹی کمینگیاں
خود غرضیاں یہ زمین کے چند ٹکڑوں کو بانٹنے کی کوششیں
اور انسانوں کی چند ٹولیوں پر اپنا سکّہ چلانے کی خواہش
کیسی بعید از عقل باتیں ہیں۔ اب جبکہ ساری کائنات
کے راستے ہم پر کشادہ ہو گئے ہیں۔ ساری دنیا کے
خزینے انسانی بس میں آ سکتے ہیں تو کیا انسانوں میں ذی شعور
منصف مزاج اور دیانت دار لوگوں کی اتنی تعداد موجود
نہیں ہے جو سب کو منوا سکے کہ یہ جنگی اڈے سمیت لو،
یہ بم اور راکٹ توپیں بندوقیں سمندر میں غرق کر دو اور
ایک دوسرے پر قبضہ جمانے کے بجائے سب
مل کر تسخیر کائنات کو جاؤ جہاں جگہ کی کوئی تنگی نہیں ہے
جہاں کسی کو کسی سے الجھنے کی ضرورت نہیں ہے جہاں
لامحدود فضائیں ہیں اور ان گنت دنیائیں۔ مجھے یقین
ہے کہ سب رکاوٹوں اور مشکلوں کے باوجود ہم لوگ
اپنی انسانی برادری سے یہ بات منوا کر رہیں گے۔

مجھے یقین ہے کہ انسانیت جس نے اپنے دشمنوں
سے آج تک کبھی ہار نہیں کھائی اب بھی فتح یاب ہو کر رہے
گی اور آخر کار جنگ و نفرت اور ظلم و کدورت کے بجائے
ہماری باہمی زندگی کی بنا دوستی پر ٹھہرے گی جس کی تلقین اب
سے بہت پہلے فارسی شاعر حافظ نے کی تھی سے

خلل پذیر بود ہر بنا کہ می بینی
مگر بنائے محبت کہ خالی از خلل است

فیض کے ساتھ جیل میں

ظفر اللہ پوشنی

میں کچھ عرصہ کراچی میں رہ چکا تھا البتہ سندھ کی بابت میری معلومات بہت کم تھی مثلاً حیدر آباد کے بارے میں میرا خیال تھا کہ نہایت خراب، ریتلی اور گرم جگہ ہے جہاں دن رات لو چلتی رہتی ہے اس لئے جب

میں ٹرین سے پلیٹ فارم پر اُترا اور خنک ہوا کے خوشگوار جھونکوں نے میرا خیر مقدم کیا تو مجھے حیرت ہوئی یہ تو بعد میں معلوم ہوا کہ حیدرآباد موسمی اعتبار سے ایک معتدل مقام ہے جہاں نہ زیادہ گرمی پڑتی ہے، نہ سردی، اس کی وجہ یہ ہے کہ حیدرآباد سمندر سے کچھ زیادہ دُور نہیں حیدرآباد اور کراچی کا فاصلہ موٹر کار سے دو تین گھنٹے میں طے ہو جاتا ہے۔

میں اپنے محافظوں کے ہمراہ جونہی ٹرین سے نیچے اُترا انسپکٹر کی ہدایت پر سپاہیوں نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا پھر انسپکٹر صاحب نے میرا دایاں بازو اپنی گرفت میں لے لیا اور "کوئک مارچ" کا حکم صادر فرمایا ہم تیزی سے قدم اُٹھاتے ہوئے پلیٹ فارم کو طے کر کے پٹڑیوں کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ایک ریلوے کراسنگ پر پہنچ گئے یہاں سڑک پر چند کاریں، بسیں اور ٹرک کھڑے تھے پاس ہی کچھ وردی پوش پولیس افسر ٹہل رہے تھے ہم ایک بڑی سی بس میں داخل ہو گئے۔

سب انسپکٹر اب تک میرا بازو تھامے ہوئے تھے چنانچہ ہم دونوں ایک ہی سیٹ پر پہلو بہ پہلو بیٹھ گئے چند ہی سیکنڈ گزرے تھے کہ ایک ہجوم سا بس میں داخل ہوا یہ کیپٹن خضر حیات اور ان کے محافظوں کا گروہ تھا میری طرح خضر حیات بھی ایک سیٹ پر اپنے نگران انسپکٹر کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا پھر اس نے بڑے اہتمام سے سگریٹ سلگایا اور نتھنوں سے دُھواں نکالتے ہوئے مجھے آنکھ ماری میں ہنس پڑا تو خضر بولا "ویل" "تمہارا سفر ٹھیک موافق کٹ گیا، جوان؟"

میں نے جواب دیا "ویری ویل، تھینک یو" مائی بوائے تم اپنی کہو؟"

"مزے میں ہیں"

اتنے میں کچھ لوگ دندناتے ہوئے بس میں آگھسے ایک انسپکٹر، ایک حوالدار اور چار سپاہی حسبِ معمول ایک ملزم کو گھیرے ہوئے تھے میں نے ذرا غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ ملزم پاک و ہند کا ممتاز شاعر فیض احمد فیض ہے"

فیض صاحب گزشتہ تین ماہ سے قیدِ تنہائی کی کٹھن زندگی گزار رہے تھے اور اس دوران میں کچھ کمزور ہو گئے تھے اس سے پہلے میں نے زندگی میں انہیں صرف ایک بار دیکھا تھا اب کے مجھے ان میں نمایاں تبدیلی نظر آئی چہرے پر وہ شگفتگی نہ تھی جو ایک صحت مند انسان کے چہرے پر ہونی چاہیئے۔ فیض صاحب پاس سے گزرے تو میں نے انہیں کھانس کر اپنی طرف متوجہ کیا اور کہا فیض صاحب سلام علیکم۔" وہ طبعاً کم گو ہیں صرف اتنا کہا "ہیلو مسٹر" اتنے میں انسپکٹر نے جو ان کے ہمراہ تھا کہا "آگے چلیئے جناب" اور فیض آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتے ہوئے آگے بڑھے وہ بس کی اگلی سیٹ پر جا کر بیٹھ گئے سگریٹ جلایا مڑ کر خضر حیات اور میری طرف دیکھا اور مسکرانے لگے۔

خضر نے پوچھا "کیا حال ہیں، فیض صاحب، طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی"

فیض کی مسکراہٹ کچھ اور وسیع ہو گئی اور بولے "او کے" اور مسکراتے رہے میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ اس شخص کو گفتگو کرنے کی عادت ڈالنی پڑے گی جیل میں محض "یس، نو" کرنے والا ساتھی کس کام کا؟

اس دوران میں ہمارے دوسرے ساتھیوں کو دوسری گاڑیوں میں بٹھایا جا رہا تھا جب تمام ملزم کاروں

اور بسوں میں بیٹھ گئے تو یہ قافلہ ویران سڑکوں سے ہوتا ہوا تقریباً پندرہ منٹ بعد سنٹرل جیل حیدرآباد کے بڑے پھاٹک کے سامنے جاکر رک گیا۔ اس قافلے میں تین کے سوا تمام "ملزم" شامل تھے سابق بریگیڈیر لطیف خان پہلے ہی جیل میں تھے بیگم نسیم اکبر کو لاہور سے حیدرآباد ہوائی جہاز میں لایا گیا تھا اور محمد حسین عطا اب تک مفرور تھے حیدرآباد جیل کی ایک خصوصیت مجھے بس میں بیٹھے بیٹھے نظر آگئی وہ یہ کہ دیواریں اس جیل کی، لاہور سنٹرل جیل کی دیواروں کے مقابلے میں بہت نیچی تھیں بلکہ یہ دیواریں تو اتنی اونچی بھی نہ تھیں جتنی ہم بیرک کے اردگرد کی دیواریں، یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی اس لئے نہیں کہ ان دیواروں کو پھاندنا آسان تھا بلکہ اس لئے کہ اونچی دیواروں کے درمیان سے مجھے (اور دوسرے دوستوں کو بھی) نفسیاتی اور روحانی کوفت ہوتی تھی۔

سب سے پہلے فیض اور خضر کو اور مجھے سپرنٹنڈنٹ صاحب کے دفتر میں پہنچایا گیا سپرنٹنڈنٹ صاحب (جن کا خاندانی نام میمن تھا) ایک لق و دق میز کے پیچھے بیٹھے ہوئے تھے قمیض پاجامہ زیب تن تھا پان چبا رہے تھے اور ساتھ ساتھ سگریٹ کے کش لگاتے جاتے تھے ہمارے سلام کے جواب میں موصوف نے کریون اے کا ڈبہ آگے بڑھانا چاہا، لیکن تیزی میں ہاتھ جو مارا تو ڈبہ فرش پر گر گیا اور سگریٹ چاروں طرف بکھر گئے جو ان کے اردلی نے جلدی جلدی چنے، بہرحال ہم تینوں "ملزمین" نے ایک ایک سگریٹ شکریئے کے ساتھ قبول کئے۔

میمن صاحب نے پولیس کے افسروں سے ہمارے کاغذات حاصل کئے، اور ناموں کی ایک طویل فہرست پر صحیح کا نشان لگاکر جیلر کو حکم دیا کہ "ان کو لے جاؤ۔" ان جیلر کا نام صلاح الدین تھا۔ یہ پست قد کے بھاری بھرکم آدمی تھے ان کی مونچھیں سابق گورنر پنجاب سردار عبدالرب نشتر مرحوم کی مونچھوں سے ملتی جلتی تھیں۔ ہم جیلر کے ہمراہ سپرنٹنڈنٹ کے دفتر سے باہر نکلے تو دیکھا کہ گیلری میں جنرل نذیر سے لے کر سجاد ظہیر تک سب ہی ساتھی جمع ہیں اور آپس میں بات چیت کر رہے ہیں ان کے ساتھ مصافحہ اور سرسری گفتگو کے بعد ہم ڈیوڑھی کی بالائی منزل سے نیچے اترے اور پچھلے دروازے سے نکل کر جیل کے اندر داخل ہوگئے۔

ڈیوڑھی سے بیس پچیس گز دور ایک احاطہ تھا اس کی دیوار پر "بی کلاس وارڈ" کی عبارت جلی حروف میں لکھی ہوئی نظر آئی وارڈ میں داخل ہونے کا ایک ہی راستہ تھا یہ ایک بڑا سا چوبی دروازہ تھا جس پر بھاری بھرکم قفل پڑا ہوا تھا جیلر نے جیب سے چابی نکال کر قفل کھولا اور ہم نے اپنی نئی جائے اقامت میں قدم رکھا اس احاطے میں ہمیں اپنی زندگی کے دو سال گزارنے تھے انسانوں کی صحبت میں رہنے کا موقع ملا ہے اس سے بڑی خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ ہم تین آدمی اکٹھے یہاں رہیں گے آج کے دن سے زیادہ خوشگوار لمحہ میری زندگی میں شاید ہی آیا ہو دراصل آپ اندازہ ہی نہیں کر سکتے کہ میں کس قدر خوش ہوں کیوں کہ آپ کو خوش قسمتی سے قیدِ تنہائی کا تجربہ نہیں ہوا۔"

سامان سجا دیا لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ لاہور جیل کی طرح یہاں بھی رات کو بند ہونا پڑے گا تو ہم نے یہ طے کیا کہ باقی سامان تو کوٹھڑیوں میں پڑا رہنے دیا جائے اور چارپائیاں اٹھا کر ہال کمرے میں رکھ دی جائیں تاکہ رات کو سب اکٹھے بیٹھ کر گپ شپ کر سکیں فیض اور

اکبر خاں مختلف جیلوں میں تین مہینے تنہا گزار چکے تھے انہوں نے اجتماعی زندگی کی خوبیوں کو سراہا اور اصرار کیا کہ سب لوگ ہال کمرے میں قیام کریں ان کی یہ تجویز اتفاق رائے سے منظور کرلی گئی اور ہم نے چارپائیاں اور بستر اٹھا کر ہال میں ڈیرے جما دئے۔ ہمارے وارڈ میں کالے رنگ کی ایک نہایت معمر اور خستہ حال بلّی رہتی تھی۔ ہم لوگ اسے بوڑھی کہہ کر پکارتے تھے ہمارے حیدرآباد پہنچنے کے کوئی مہینہ بعد بوڑھی کے دو بچے پیدا ہوئے ان میں سے ایک تو پیدائش کے فوراً بعد اللہ کو پیارا ہوگیا البتہ دوسرا زندہ رہا اور چند دنوں میں ایک خوب صورت اور ہوشیار سا "بلونگڑا" بن گیا بدقسمتی سے ایک دن اس نے کہیں خضر حیات کی چارپائی پر چڑھ کر ذرا سا پیشاب کردیا خضر نے جو یہ منظر دیکھا تو اسے اتنا سخت غصہ آیا کہ اس نے فوراً بوڑھی اور اس کے بچے دونوں کو ایک بوری میں بند کروا کے ایک سپاہی سے کہا کہ اسے جیل سے کہیں باہر دُور پھینک آؤ چنانچہ یہی کیا گیا اور ہمارا وارڈ بوڑھی کی میاؤں میاؤں سے بلونگڑے کی معصوم شرارتوں سے چند دنوں کے لئے محروم ہوگیا پھر ایک روز صبح کے وقت ہم کیا دیکھتے ہیں کہ ایک کالی بلّی برآمدے میں بڑے مزے سے چہل قدمی کر رہی ہے قریب جاکر غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ تو وہی بوڑھی ہے جسے چند روز پہلے بوری میں ڈال کر جیل سے دُور پھنکوا دیا گیا تھا خیر بوڑھی تو آگئی لیکن اس کا بچہ واپس نہ آیا وہ چونکہ چھوٹا اور کمزور تھا اس لئے ہمیں یقین ہوگیا کہ ضرور مر کھپ گیا ہوگا۔

اب ارباب (کرنل نیاز محمد ارباب جو آج کل وفاقی وزیر سیاحت، کھیل اور ثقافت ہیں) اسحاق (میجر اسحاق محمد جو بعد میں مزدور کسان پارٹی کے قائد کی حیثیت سے بہت مشہور ہوئے) اور ضیاء الدین نے خضر کو چھیڑنے کی باقاعدہ مہم شروع کردی یہ لوگ اٹھتے بیٹھتے ٹھنڈی آہیں بھرتے اور تاسف کے لہجے میں کچھ اس طرح کے فقرے چست کرتے:

"افسوس! بے چاری بلّی کے بچے کا نہ جانے کیا حشر ہوا ہوگا؟"

"اجی صاحب! بازاری کتوں نے چیر پھاڑ ڈالا ہوگا؟"

"ہائے ہائے! کیسا معصوم اور پیارا بچہ تھا!"

"خدا ظالموں کو کبھی معاف نہیں کرتا، چودھری جی!"

"ارے میاں!"

پھول تو دو دن بہارِ جانفزا دکھلا گئے
حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

"مجھے تو اس کا چھلانگیں مارنا، کھیلنا کودنا اور اس کی بھولی بھولی ادائیں بہت یاد آتی ہیں۔"

"لیکن کیا کیا جائے بعض لوگوں کے دل پتھر کے ہوتے ہیں!"

"مرزا غالب مرحوم نے کیا خوب کہا ہے ؎
"دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں؟"

"ظلم کا نتیجہ کبھی اچھا نہیں نکلتا، ارباب بھائی۔"

"ہاں جی، خدا کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔"

"شاید اسی لئے حاجی لق لق نے فرمایا تھا" ؎
اُف یہ لاٹھی چارج بھی کیا ساز ہے
بج رہا ہے اور بے آواز ہے!

غرض کہ اس طرح کی فقرے بازی کئی دن تک جاری رہی اور اسحاق بڑے دعوے سے کہتے تھے

کہ کیپٹن خضر حیات کا ضمیر اِن دِنوں اسے ملامت کر رہا ہے
بہرحال چند ماہ کے بعد بوڑھی کے تین بچے اور پیدا ہوئے اب کی بار جب پیدائش کا وقت قریب آیا تو ارباب نے لکڑی کے ایک بڑے سے بکس میں گھاس پھوس بچھا کر بوڑھی کو اس میں بٹھا دیا تاکہ وہ محفوظ اور آرام دہ جگہ میں بچوں کو جنم دے سکے جس وقت بچے پیدا ہو رہے تھے ہم دوست صحن میں کرسیاں بچھا کر بیٹھے شربت پی رہے تھے اور نیاز محمد ارباب کوٹھڑی کے دروازے میں کھڑا عمل پیدائش پر تبصرہ کر رہا تھا:
"رفیقو! اب سفید رنگ کا ایک چھوٹا سا بلو نکڑا باہر آ رہا ہے، جلدی تجویز کرو کہ اس کا نام کیا رکھا جائے؟"
"نیاز" فیض احمد فیض نے تجویز پیش کی۔
"حضور ابھی سے رائے مت دیجئے ممکن ہے کہ نر نہ ہو" عطا نے شدومد سے اختلاف کرتے ہوئے کہا۔
"مادہ ہوئی تو نیازی کی بجائے نیازی کر دیں گے!"
کسی نے رائے دی اس پر ایک زبردست قہقہہ بلند ہوا۔
"خاموش! خاموش!" ارباب نے پکارا۔ "اب دوسرا بچہ برآمد ہو رہا ہے۔ لو وہ آ گیا۔ اس کا رنگ آدھا سیاہ اور آدھا سفید ہے!"
"تو اس کا نام بلیک اینڈ وائٹ رکھ دیجئے۔"
کسی نے کہا۔
"یار، بلیک اینڈ وائٹ کا نام مت لو منہ میں پانی بھر آتا ہے۔" کرنل ضیاء الدین کی آواز آئی۔
"او شٹ اپ چیف!" میں نے کہا۔
بوڑھی کے تین بچوں میں دو بالکل سفید رنگ کے تھے اور ایک بلیک اینڈ وائٹ۔ سفید رنگ کا ایک بچہ نر تھا باقی دو نوں مادہ۔ نر کی آنکھیں بڑی خوب صورت اور نیلے آسمانی رنگ کی تھیں، اس کا نام ارباب نے شینو تجویز کیا۔
میں نے تجویز پیش کی کہ ایک "انجمنِ محافظانِ حقوق بلیاں" قائم کی جائے اور بلیوں کے بنیادی حقوق کے لئے آئینی جدوجہد شروع کرنے کے سوال پر غور کیا جائے لیکن یہ تجویز کثرتِ رائے سے مسترد کر دی گئی کیوں کہ یہ بھی خطرہ تھا کہ فیض احمد فیض اپنے عہدے سے بطورِ احتجاج مستعفی ہو جائیں گے اور اس زمانے میں سکریٹری کا کام سرانجام دینے کے لئے کوئی دوسرا دوست تیار نہ تھا مجبوراً یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ لنچ یا ڈنر کے وقت فیض صاحب کی نظروں سے بچ کر ایک آدھ بوٹی یا روٹی کا ٹکڑا فرش پر پھینک دیا جاتا اور تاک میں بیٹھا ہوا شداد یا اس کا ساتھی اسے فوراً چٹ کر جاتا جب یہ رسم چل نکلی اور مقبول ہو گئی تو پھر ہم نے ازراہِ شرارت ایک دوسرے کی چغلی کھانی شروع کر دی مثلاً حسن کوئی چیز شداد کو کھلاتا تو اسحاق فوراً فیض کو آواز دیتا:
"او چاچا، لے بلیاں نوں پاوندا اے!"
(اے چاچا۔ یہ بلیوں کے آگے ٹکڑا ڈال رہا ہے)
"او نئیں چاچیا، اے ایویں جھوٹ بکدا اے۔"
میں ٹانگ اڑاتا۔
"رب دی سوں چاچا، میں آپ دیکھیا ہے۔
شداد نوں بوٹیاں سٹا سی۔"
فیض بے چارے مسکرا کر مونہہ پھیر لیتے بلیوں کی خوراک میں کوئی کمی نہ آنے پاتی۔
چند مہینوں کے بعد فیض نے سیکریٹری شپ چھوڑ دی اور ان کی جگہ دوستوں نے مجھے سیکریٹری مقرر کر دیا اُس رات جب ہم کھانے کی میز کے گرد اکٹھا

ہوئے تو میں نے کھنکھار کر سب کو اپنی طرف متوجہ کیا
اور بلند آواز میں کہا :

" حضرات ! میں بطور نئے میس سکریٹری کے یہ
اعلان کرتا ہوں کہ بلیوں کے متعلق تمام پرانے احکام
منسوخ کئے جاتے ہیں آج سے آپ لوگ شدّاد، پیاری
شینو اور راگنی کو گوشت اور روٹی وغیرہ خوب دل
کھول کر کھلا سکتے ہیں۔

" بلّی نوازوں " نے " زندہ باد " کے نعروں
سے اس تاریخی اعلان کا خیر مقدم کیا۔

" اینٹی بلّی گروپ " نے " شیم شیم " کہنے پر اکتفا
کی۔

بلیوں کے قرب نے ہمیں اس نسل کے جانوروں
کی عادات کا گہرا مطالعہ کرنے کا موقع بہم پہنچایا اس
مطالعے سے یہ معلوم ہوا کہ ہر بلّی ایک منفرد اور
جداگانہ کردار کی مالک ہوتی ہے، عین اسی طرح
جیسے ہر انسان کا اپنا مخصوص کردار ہوتا ہے۔ مثال کے
طور پر " پیاری " بچپن ہی سے سب سے پھرتیلی چالاک
اور زود حس تھی، شینو ہمیشہ کا غلیظ اور آوارہ گرد رہا،
شدّاد ابتدا میں بڑا خود غرض اور لڑاکو تھا۔

لیکن جب کھانا پیٹ بھر کر ملنے لگا تو وہ نہایت
کاہل اور آرام طلب ہو گیا ان سب کے برعکس راگنی
بڑی ہو کر تنہائی پسند اور شرمیلی نکلی۔

اُدھر بوڑھی بھی آرام سے بیٹھنے والی جنس نہ
تھی چند ہی ماہ بعد اس نے دو عدد بچے اور جن دئے
یہ دونوں بھی سفید رنگ کے تھے لیکن ایک کی آنکھیں
نیلی اور دوسرے کی بھوری تھیں ان کا نام ہم نے بلیو
BLUE اور براؤنی BROWNIE رکھا۔

بلیوں کی بڑھتی ہوئی آبادی فیض صاحب اور ان کے
ہم خیال دوستوں کے لئے کافی پریشان کن تھی اسی
اثنا میں شینو، راگنی اور پیاری تینوں اچانک بیمار پڑ گئے
چند ہی دنوں میں راگنی ہمیں داغ مفارقت دے گئی
شینو اور پیاری کو کیپٹن خضر حیات نے ایک گارڈ کے ذریعے
جیل سے باہر جانوروں کے ہسپتال میں بھجوا دیا وہاں
انہیں ٹیکے لگائے گئے اور کھانے کے لئے کچھ دوائیں بھی
دی گئیں تھوڑے ہی عرصے میں وہ بالکل صحت یاب ہو گئے
چند ماہ بعد بوڑھی صاحبہ انتقال کر گئیں اور ان کی کمی
پوری کرنے کے لئے ان کی پیاری بیٹی نے ایک عدد نر
بچے کو جنم دیا جس کا نام ارباب نے چیکو CHICO
رکھا۔ ۵ جنوری ۱۹۵۳ کو جب مقدمے کا فیصلہ سنایا
گیا تو ہمارے وارڈ میں چھ بلیاں موجود تھیں شینو، شدّاد
بلیو، براؤنی، پیاری اور اس کا بچہ چیکو۔

جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں سید سجاد ظہیر
ائر کموڈور محمد خان جنجوعہ، جنرل نذیر احمد اور بریگیڈیر
لطیف ہم سب دوستوں سے الگ " اے " کلاس میں رہتے
تھے اس وارڈ کے کمرے ہمارے وارڈ کی کوٹھریوں سے
طول و عرض میں تقریباً دگنے اور نسبتاً زیادہ آرام دہ
تھے ہماری کوٹھریاں گرما کی دوپہر کو تنور کی طرح گرم
ہو جاتی تھیں اس لئے ہم نے اپنے وارڈ کا نام " سرائے "
اور " اے " کلاس وارڈ کا نام " خانقاہ " رکھا تھا۔

خصوصی عدالت کی عمارت " خانقاہ " اور
" سرائے " کے عین وسطی علاقوں میں واقع تھی صبح
کے وقت ہم دس ملزم سرائے کے صدر دروازے سے
نکلتے تو سامنے خانقاہ کے مکین، باقی چاروں ملزم،

اپنے وارڈ کے دروازے سے باہر نکلتے ہوئے دکھائی دیتے عدالت کے احاطے کے سامنے پہنچ کر ہم سب ایک دوسرے سے ہاتھ ملاتے اور پھر اکٹھا ہو کر کورٹ روم میں داخل ہو جاتے عدالت کی کارروائی دن کے ساڑھے بارہ بجے ختم ہوتی اس وقت تمام ملزمین سرائے میں آجاتے جہاں ہال کمرے میں کھانے کی میز بچھی ہوتی خانقاہ والوں کے علاوہ بیگم نسیم اکبر خاں بھی اس وقت ہمارے ہی ساتھ کھانا کھاتی تھیں لنچ ختم ہونے کے کچھ دیر بعد سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں واپس چلے جاتے ڈیڑھ دو گھنٹے آرام کرنے کے بعد شام کوئی ساڑھے چار بجے خانقاہ کے دوست اور بیگم نسیم کھیل کے وقت پھر ہمارے وارڈ تشریف لاتے اس لئے کہ والی بال اور بیڈمنٹن کی کورٹ ہمارے علاقے میں تھیں چھ اور ساڑھے چھ کے درمیان کھیل ختم ہو جاتے، اس کے بعد غسل کیا جاتا اور شب خوابی کا لباس زیب تن کر لیا جاتا جنجوعہ اور سجاد ظہیر شام کے وقت خانقاہ میں واپس جانے کی زحمت سے بچنے کے لئے عموماً ہمارے ہی وارڈ کے غسل خانوں میں نہا دھو کر کپڑے تبدیل کر لیا کرتے تھے ساڑھے سات بجے ہال کمرے میں یا صحن میں میزیں بچھا کر مشقتی کھانا چن دیتے اور یار لوگ پیٹ پوجا میں مصروف ہو جاتے کھانے کے دوران میں ریڈیو پاکستان سے خبریں بھی سنی جاتیں اور بد آواز اناؤنسروں کو جی بھر کر کوسا جاتا۔ نہ جانے بات کیا تھی لیکن ان دنوں ریڈیو پاکستان سے خبریں سنانے والے لوگ سب ایک سے ایک بدتر تھے، بالخصوص انگریزی کے اناؤنسر تو نہ جانے کس چڑیا گھر سے پکڑ کر لائے گئے تھے خبریں سناتے وقت بار بار اٹکنا، الفاظ کو غلط پڑھنا اور تلفظ کے معاملے میں شرمناک غلطیاں کرنا یہ ہمارے اناؤنسروں کا "طرۂ امتیاز" تھا بہر حال رات کے کھانے اور خبروں سے فارغ ہو کر بعض دوست شطرنج، تاش اور ڈرافٹ کھیلنے میں محو ہو جاتے اور بعض یونہی چہل قدمی کرتے یا ریڈیو کی موسیقی سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کرتے اس کے لئے بھی ہندوستان کے ریڈیو اسٹیشن تلاش کرنے پڑتے تھے کیونکہ اپنے یہاں کے ٹرانسمیٹر سے اچھی کلاسیکی موسیقی شاذ و نادر ہی سننے میں آتی تھیں (اس صاف گوئی سے ہماری مراد یہ نہیں کہ پاکستان میں موسیقاروں کی کمی ہے ہمارے بندو خاں اور روشن آرا بیگم کے مقابلے میں شاید ہی کوئی فن کار بھارت میں ہو اور یوں بھی ہماری کلاسیکی موسیقی کے ارتقا میں مسلمان موسیقاروں نے نمایاں حصہ لیا) خیر سجاد ظہیر اور میں دو افراد ایسے تھے جنہیں "آؤٹ ڈور" کھیلوں سے مطلق دلچسپی نہ تھی کھانے کے فوراً بعد ہم دونوں سگریٹ سلگا کر ریڈیو کے قریب کرسیاں کھینچ کر بیٹھ جاتے اور استادی گانوں کے زیر و بم پر دیر تک سر دھنتے رہتے ابتدا ہمارے پورے گروپ میں سجاد فیض اور میں صرف تین آدمی ایسے تھے جنہیں پاک و ہند موسیقی سے گہری دلچسپی تھی باقی دوست ہمیں برا بھلا کہتے اور ہم پر پھبتیاں کستے۔ کہ اے احمقو! تم یہ کیا خرافات سنتے رہتے ہو! لیکن رفتہ رفتہ ان پر بھی ہماری صحبت کا اثر پڑنے لگا کوئی سال بھر جیل میں رہنے کے بعد اب صورتِ حال یہ ہو چکی ہے کہ رات کو ریڈیو پر بڑے غلام علی خاں یا گنگو بائی کو۔ سننے کے لئے فیض، سجاد اور میرے علاوہ اکبر خان، ارباب عطاء اسحاق اور جنجوعہ بھی اکثر جمع ہو جاتے تھے البتہ میجر

حسن خان آخر تک کلاسیکی موسیقی کے جانی دشمن بنا رہا جونہی یہ اعلان ہوتا کہ اب اسد علی خان سہاگیشوری کا خیال پیش کریں گے تو میجر حسن بہ آوازِ بلند "لعنت ہے تم پر اے شیطان" کہتا ہوا اٹھتا اور ریڈیو سے کم از کم پچاس گز دور ہٹ جاتا ادھر کرنل ارباب کو پکے راگوں کا شوق تو پیدا ہو گیا تھا لیکن راگ کی شد بد بالکل نہ تھی۔ ایک روز رات کے وقت تقریباً نو بجے ریڈیو کا ڈائل گھما کر کوئی اچھا سا اسٹیشن تلاش کر رہے تھے کہ دفعتاً رک گئے۔ غالباً دہلی سے کوئی اناؤنسر اپنا اعلان ختم کر رہا تھا فیض، اسحاق اور میں ریڈیو سے ذرا دور بیٹھے تھے اس لئے وہ اعلان سن نہ سکے۔

فیض نے ارباب سے پوچھا "کیا اعلان تھا؟"
ارباب نے کہا "ابھی آپ کو مس شنکرا گانا سنائیں گی"۔ ہم لوگ متوجہ ہو گئے جب گانے والی نے الاپ شروع کیا تو پتہ چلا کہ پدماوتی خیال شنکرا پیش کر رہی ہیں اس دن کے بعد سے ہم نے ارباب کا نام مس شنکرا رکھ دیا۔

ہفتے اور اتوار کو عدالت بند رہتی تھی اس روز ہم سرائے کے باشندے صبح نو دس بجے خانقاہ والوں سے ملنے جاتے تھے وہاں سجاد ظہیر کے کمرے میں محفل جمتی خانقاہ میں داخل ہوتے ہی ہماری نظر سب سے پہلے جنرل نذیر احمد پر پڑتی جو سر اور پاؤں کے تلووں میں مہندی لگا کر برآمدے میں آرام کرسی پر دراز اخبار بینی میں مصروف رہتے ایئر کموڈور جنجوعہ جنہیں ہم "مارشل" کے نام سے پکارتے تھے عموماً ڈریسنگ گاؤن پہنے برآمدے میں ادھر ادھر ٹہلتے ہوتے وہ ہمیں دیکھ کر زور سے خیر مقدمی نعرہ لگاتے اور گھتم گتھا ہو کر مہمانوں کا استقبال کرتے بریگیڈیئر لطیف اپنا بیشتر وقت کمرے

میں اندر عبادت وریاضت میں صرف کرتے تھے ان سے بس گاہے گاہے ملاقات ہوا کرتی تھی سید سجاد ظہیر (مولانا) بھی عام طور پر اپنے کمرے ہی میں گھسے رہتے لیکن ان کی مصروفیات قدرے مختلف تھیں یعنی مطالعہ اور تصنیف و تالیف سجاد کے پاس کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ تھا ایسا ہی ایک ذخیرہ فیض کے پاس تھا ان دونوں بزرگوں کے علمی ذخائر سے باقی لوگوں نے بہت فائدہ اٹھایا۔

چھٹی کے روز جب ہم لوگ مولانا کے کمرے میں اکٹھا ہوتے تو سب سے پہلے شربت، چائے یا کافی سے ہماری تواضع کی جاتی سجاد ظہیر اور جنجوعہ ہم "مہمانوں" کے لئے کچھ نہ کچھ سامان خورد و نوش ہمیشہ اپنے سٹور میں رکھتے تھے ان کے برعکس جنرل نذیر اس معاملے میں خاصے بے نیاز واقع ہوئے تھے وہ خاطر داری سے ہمیشہ گریز کرتے رہے جنرل نذیر کی یہ لاتعلقی (جسے بعض گستاخ لوگ ان کے بخل سے تعبیر کرتے تھے) سب نوجوانوں کی طبیعت پر گراں گزرتی تھی اور کیپٹن خضر حیات نے دو ایک مرتبہ ان کے کمرے سے بطور شرارت پھل اور مٹھائی کی چوری بھی کی جس پر جنرل صاحب سخت چیں بجبیں ہوئے۔

بہر حال، میں یہ کہہ رہا تھا کہ سجاد ظہیر کے کمرے میں کھانے پینے سے فارغ ہو کر ہم سب لوگ شعر خوانی قوالی اور گانے بجانے میں کچھ وقت ضرور صرف کرتے تھے۔ ہم میں صرف ایک شخص ایسا تھا جسے خوش الحان کہا جا سکتا ہے یعنی جنرل اکبر خان۔ لیکن یہ حضرت چونکہ ان محفلوں میں کبھی کبھار ہی شرکت کرتے تھے لہٰذا قوالی کا لیڈر عموماً مجھ ہی کو بننا پڑتا تھا ان محفلوں میں یوں تو درجنوں غزلوں اور نظموں پر "حلق آزمائی"

کی جاچکی تھی لیکن سب سے زیادہ مقبول فیضؔ کا وہ ترانہ تھا جسے انہوں نے ہمارے سامنے ہی حیدرآباد جیل میں لکھا تھا یہ ترانہ ہمیں اس قدر پسند تھا کہ ہم اسے محفل میں کم از کم ایک بار ضرور گاتے اور کبھی بار تو آدھ پون گھنٹہ تک لگاتار گاتے چلے جاتے تھے مجھے یقین ہے کہ یہ ترانہ کسی روز ایک عظیم الشان عوامی تحریک کا نعرہ بن کر ہمارے وطن کی سرزمین کے چپے چپے پر پھیل جائے گا یہ ترانہ ظلم، جبر اور فریب کی قوتوں کے خلاف ایک حساس انسان کا پرزور احتجاج ہے ایک ایسا احتجاج جو عزم اور رجائیت سے بھرپور ہونے کے علاوہ حق اور انصاف کی آخری فتح کی پیش گوئی بھی کرتا ہے۔

ترانہ

دربارِ وطن میں جب اک دن سب جانے والے جائیں گے
کچھ اپنی سزا کو پہنچیں گے کچھ اپنی جزا لے جائیں گے
اے خاک نشینو! اٹھ بیٹھو وہ وقت قریب آپہنچا ہے
جب تخت گرائے جائیں گے جب تاج اُچھالے جائیں گے
اب ٹوٹ گریں گی زنجیریں اب زندانوں کی خیر نہیں
جو دریا جھوم کے اُٹھے ہیں تنکوں سے نہ ٹالے جائیں گے
کٹتے بھی چلو بڑھتے بھی چلو، بازو بھی بہت ہیں سر بھی بہت
چلتے بھی چلو کہ اب ڈیرے منزل ہی پہ ڈالے جائیں گے
اے ظلم کے ماتو لب کھولو، چُپ رہنے والو چپ کب تک
کچھ حشر تو ان سے اُٹھے گا کچھ دُور تو نالے جائیں گے

اس ترانے کو ہم سب مل کر گاتے تھے میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ ہم میں مختلف سیاسی خیالات کے لوگ موجود تھے لیکن میری رائے یہ ہے کہ ہر شخص اس گیت کو گاتے وقت اپنے آپ میں ایک نیا ولولہ ایک نیا جوش اور ایک نئی اُمنگ محسوس کرتا تھا۔ ایسی والہانہ اُمنگ جسے زنداں کی اونچی دیواریں اور آہنی سلاخیں بھی دبانے میں کامیاب نہیں ہو سکتی تھیں۔ سجاد ظہیر کے کمرے میں چھٹی کے دن منعقد ہونے والی ان محفلوں نے یقیناً ہمارا حوصلہ بلند رکھنے میں خاصی مدد کی۔ لیاقت علی خاں کی رحلت سے پہلے ان یاس انگیز اور ناسازگار دنوں میں بھی جب سارے ملک میں یہ افواہیں گرم تھیں کہ ان "غداروں" کو یقیناً گولی سے اڑا دیا جائے گا۔ ہم نے کبھی اپنے ماتھے پر شکن نہ آنے دی اور ایک لمحے کے لئے بھی اداسی اور سراسیمگی کو اپنے پاس پھٹکنے نہ دیا۔ وکیلوں نے معاملے کی نزاکت کو سمجھایا، جیلروں نے بہت اونچ نیچ دکھائی پولیس والوں نے ڈرایا حتےٰ کہ رشتے داروں نے بھی کہا کہ یہ کیس بہت سنگین ہے تم لوگوں کو سخت سزائیں دی جائیں گی کوئی بچ نہیں سکے گا۔ وغیرہ وغیرہ لیکن ہم نے ہنس کر ان سب کو ٹال دیا۔ ہم نے کہا ارے جاؤ اس مقدمے میں دھرا ہی کیا ہے! سب بکواس ہے۔ کوئی ہمارا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔ ہم مسکراتے رہے گاتے رہے شعر کہتے رہے ہمیں معلوم تھا کہ۔ ؎

یونہی ہمیشہ اُلجھتی رہی ہے ظلم سے خلق
نہ اُن کی رسم نئی ہے نہ اپنی ریت نئی
یونہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول
نہ ان کی ہار نئی ہے، نہ اپنی جیت نئی
(فیضؔ)

فیض جیل میں وقتاً فوقتاً شعر کہتے رہتے تھے اور جب بھی کوئی غزل، نظم مکمل ہو جاتی وہ چپکے سے کسی سے کہہ دیتے کہ بھئی کچھ سننا ہے تو آجاؤ میرے کمرے

میں۔ اس پر چاروں طرف اِک شور مچ جاتا کہ فیض نے نئی چیز کہہ لی ہے جلدی ان کے کمرے میں پہنچو۔ بس پھر کیا تھا۔ یار لوگ سب کام کاج چھوڑ کر سیدھے ان کی کھولی میں جا پہنچتے جب پوری قوم جمع ہو جاتی تو فیض حسبِ معمول نہایت مدھم آواز میں اپنا کلام سنانے لگتے اور ہم لوگ ہر شعر پر دل کھول کر داد دیتے۔ حقیقت یہ تھی کہ

ہم طرفدار ہیں غالبؔ کے سخن فہم نہیں

۱۹۵۱ کے آخری دنوں کی بات ہے رات کے وقت ہم سب بیٹھے گپیں ہانک رہے تھے کہ فیض نے ایک دلچسپ تجویز پیش کی، انہوں نے کہا اس کے بجائے کہ میں تنہا ہی شعر لکھوں اور سب دوستوں کو اپنا کلام سناتا رہوں کیوں نہ ایک محفلِ مشاعرہ منعقد کی جائے تاکہ میں بھی غزل لکھوں اور دیگر اصحاب بھی طرح کے مصرع پر طبع آزمائی کریں پہلے تو کچھ ساتھیوں نے اس بات کو مذاق میں ٹالنا چاہا لیکن غور کرنے پر تجویز معقول نظر آئی چنانچہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ مصرعۂ طرح چن لیا جائے اور ظفر اللہ پوشنی کو سکریٹری مقرر کیا جائے اور یہ اس کی ذمہ داری ہو کہ بزمِ مشاعرہ کے انعقاد کا موزوں بندوبست کرے چونکہ فیض کے سوا ہم میں سے کسی نے بھی شاعری کے میدان میں اس سے پہلے قدم نہیں رکھا تھا اس لئے یہ بھی طے پایا کہ تین آدمیوں کی ایک "سب کمیٹی" بنائی جائے جو ہر شخص کو اس کی ظاہری اور باطنی خصوصیات کے مطابق ایک عدد تخلص عطا فرمائے۔ یہ بڑا جان جوکھوں کا کام تھا، قدم قدم پر گردن زدنی کا اندیشہ تھا تاہم "سب کمیٹی" نے طویل غور و فکر کے بعد تخلصوں کی ایک فہرست مرتب کر لی جسے کثرتِ رائے سے منظور کر لیا گیا افسوس کہ بعد میں کسی بھی جوانمرد نے اپنے نام الاٹ ہونے والے تخلص کو غزل میں استعمال کرنے کی کوشش نہیں کی تاہم اتنا ضرور ہے کہ مشاعرے کے دوران میں "تمام" شاعر حضرات کو ان ہی تخلصوں سے یاد کیا جاتا تھا اب ذرا تخلص سب کمیٹی کی سفارشات ملاحظہ فرمائیے:

نام:	تخلص:
میجر جنرل اکبر خاں	فتوری
میجر جنرل نذیر احمد	سارس
ایر کموڈور محمد خاں جنجوعہ	پٹاخہ
بریگیڈیئر صدیق خان (کیونکہ سابق ایرانی وزیر اعظم ڈاکٹر مصدق کی طرح یہ صاحب بیشتر وقت بستر میں گزارتے تھے)	مصدق
بریگیڈیئر لطیف خاں	خبطی
لیفٹننٹ کرنل نیاز محمد ارباب	شتر
لیفٹننٹ کرنل ضیاء الدین	گڑبڑ
میجر اسحاق محمد	ڈنگا (یعنی ٹیڑھا)
میجر حسن خان	جاہل
کیپٹن ظفر اللہ پوشنی	خبیث
کیپٹن خضر حیات	بینڈو
فیض احمد فیضؔ	کاہل
سید سجاد ظہیر	لاعزار برعکس نہند نام زنگی را کافور
محمد حسین عطا	گوسفند

اب آپ سمجھ گئے ہوں گے یہ شعرا اپنی غزلوں میں ان تخلصوں کے استعمال سے کیوں کتراتے

تھے۔

حیدرآباد سنٹرل جیل کے دوران قیام میں ہم نے کم از کم دس گیارہ بار مشاعرے کی محفلیں برپا کیں۔ ہر مشاعرے میں تقریباً سات آٹھ شعراء اپنا کلام سناتے تھے۔ بعض حضرات تو باقاعدگی سے ہر محفل میں غزل یا نظم پڑھتے تھے اور بعض ایسے تھے جنہوں نے ایک بار بھی شعر لکھنے یا سنانے کی کوشش نہیں کی تاہم داد دینے اور شور و غل مچانے میں کوئی شخص بھی بخل سے کام نہ لیتا تھا۔ فیض کے علاوہ ارباب، سجاد ظہیر، حسن خان اور میں یہ پانچ افراد ایسے تھے جنہوں نے تقریباً ہر مشاعرے میں عملاً حصہ لیا۔ جنجوعہ، اسحاق، نذیر، خضر، عطا، ضیا اور اکبر کبھی کبھار کوشش کرکے کچھ نہ کچھ لکھ ڈالتے تھے لیکن لطیف اور صدیق نے ہمیں ایک شعر تک نہیں سنایا۔

بیشتر مشاعروں کی رُوداد تو اب مجھے یاد نہیں رہی لیکن دو مشاعروں کی مختصر رپورٹ میں نے بروقت لکھ لی تھی جو اب بھی میرے پاس موجود ہے اس لئے ان کا تذکرہ میں ذرا تفصیل کے ساتھ کر سکتا ہوں۔

جس مشاعرے کا میں پہلے ذکر کروں گا وہ ۱۹ اگست ۱۹۵۲ کو جنرل نذیر احمد کی صدارت میں بی کلاس وارڈ کے صحن میں ہوا۔ نذیر صاحب جب تک ہمارے ساتھ رہے مستقل طور پر مشاعروں کی صدارت کے فرائض انجام دیتے رہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ہم نے ان کو مستقل مشاعرہ پریذیڈنٹ مقرر کر دیا تھا۔ ۵ جنوری ۱۹۵۳ کو ہمارے مقدمے کا فیصلہ ہوا۔ (اس کا مفصل تذکرہ آگے چل کر کروں گا) اور جنرل نذیر تابرخاست عدالت کی سزا کاٹ کر جیل خانے سے رخصت ہوئے (ان کی روانگی کے بعد علاوہ اور مسائل کے) ہمارے لئے ایک نیا مسئلہ پیدا ہوا کہ اب نیا صدر کسے بنایا جائے۔ "ملزمین" کے "مجرمین" میں تبدیل ہو جانے کے بعد ہم نے دو مشاعرے اور کئے اور ان کی صدارت مجبوراً فیض احمد فیض عرف کالا میاں کو کرنی پڑی۔

۱۹ اگست ۱۹۵۲ کے مشاعرے کے لئے طرح دو مصرعے چنے گئے تھے۔ اس مشاعرے میں چھ شاعروں نے اپنا کلام سنایا یا پانچ نے طرحی غزلیں پڑھیں اور ایک بائیں بازو کے کج رو یعنی محمد حسین عطا نے غیر طرحی نظم سنانے پر اصرار کیا پوچھا گیا کہ طرحی پر غزل کیوں نہیں لکھی، مسٹر؟" تو جواب دیا کہ ہماری طبیعت جس طرف چل نکلے اسی کے مطابق شعر کہتے ہیں" واضح ہو کہ جہاں تک شاعری کا تعلق ہے یہ ان کی پہلی اور آخری کوشش تھی! بہرحال طرحی مصرعے مندرجہ ذیل تھے۔ ع

۱ بہت وسعت ہے میری داستاں میں

۲ آج کیوں مشہور ہے ہر ایک دیوانے کا نام

سب لوگ جب اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے تو جنرل نذیر احمد نے جیب سے عینک نکال کر آنکھوں پر سجائی۔ اٹھتی ہوئی ایک نگاہ حاضرین محفل پر ڈالی اور کھانس کر گلا صاف کیا۔ میں نے بطور سکریٹری شعرا کے ناموں کی فہرست ان کے سامنے پیش کر دی اور فہرست پر نشان لگا دئے کہ آج کون کون سے افراد غزل لکھ کر لائے ہیں اور کون سے یونہی خالی ہاتھ چلے آئے ہیں لیکن جنرل صاحب نے پہلے ان تمام حضرات کے نام پکارے جن کے ناموں کے آگے نشان نہ تھے یعنی وہ لوگ جو کچھ لکھ کر نہیں لائے تھے ان دوستوں نے

باری باری صاحبِ صدر سے معذرت کی اور جنرل نذیر نے ایک ایک کو اس لاپرواہی پر ڈانٹا اور ان کے غیر ذمہ دارانہ رویّہ کی سخت مذمت کی بعد میں جب معلوم ہوا کہ صاحب صدر بھی خود کچھ لکھ کر نہیں لائے تو محفل قہقہوں سے گونج اُٹھی۔ خیر یہ طوفان بدتمیزی جب تھم گیا تو جنرل نذیر احمد نے میجر حسن خاں سے درخواست کی کہ وہ اپنا کلام سنائیں۔

حسن خان نے بوسیدہ کاغذ کا ایک پرزہ جیب سے نکالا اور اس پر نظر ڈال کر کہنے لگے حضرات غزل کے چند اشعار پیش کرتا ہوں اُمّید ہے کہ آپ سننے کی زحمت گوارا کرلیں گے۔"

" تو اور یہاں کس لئے آئے ہیں"۔ اسحاق نے چوٹ کی۔

"ارشاد، ارشاد"۔ سجاد ظہیر نے بڑے تکلف سے کہا۔

حسن بولے مطلع عرض ہے۔

ہے شہیدانِ وفا میں پہلے پروانے کا نام
آج کیوں بدنام ہے ہر ایک دیوانے کا نام

"آپ کی طرح کے ہونق جو میدان میں کود پڑے ہیں"۔ اسحاق نے پھر دلیل پیش کی۔

"شٹ اپ مسٹر"، فیض نے کہا "کیا میراثیوں کی طرح فقرے کس رہے ہو۔"

"چپ چاپ شعر سنو۔"

"رائیٹ یو آر سر۔"

حسن خان نے غزل جاری رکھی۔ شعر عرض کرتا ہوں کہ

چند ہیں لمحات شیریں تلخ باقی تجربے

داستانِ عشق کیا ہے ایک افسانے کا نام
سب کے سب اُلجھے مسائل خود بخود ہوتے ہیں حل
دور تک اب جا چکا ہے زلف اور شانے کا نام
چھوڑ دینا ہم سے سیکھو عین مستی میں شراب
بھول کر بھی اب نہیں لیتے ہیں میخانے کا نام"

"واقعی آپ ہی کی ہمّت ہے"، سجاد ظہیر نے داد دی۔"

حسن خان نے آداب بجالاتے ہوئے مقطع پڑھا

لوگ کہتے ہیں حسن خان میں ہیں آثارِ جنون
یہ اکیلے بیٹھ کر ہے دل کو سمجھانے کا نام

"واہ۔ واہ کا شور جب ذرا تھما تو صاحب صدر نے کرنل ضیاء الدین سے درخواست کی کہ وہ اپنے کلام بلاغت نظام سے حاضرین کو محظوظ فرمائیں۔ ان حضرت کو شاعری سے چنداں لگاؤ نہیں۔ جیل میں آنے سے پہلے غالباً اقبال اور غالب کے علاوہ اور کسی بڑے شاعر کا نام تک نہ سنا ہوگا۔ بہرحال آج آپ بھی

غزل لکھ کر لائے تھے جس پر انہیں کافی داد ملی۔ پہلا شعر تھا ؎

نہ ڈالو تم مجھے اب امتحاں میں
کہ کچھ باقی نہیں ہے جسم و جاں میں

"افسوس صد افسوس" خضر نے ہمدردی کا اظہار کیا۔

"واہ گڑ بڑ صاحب خوب شعر کہا ہے۔" میں نے تعریف کی۔

تعریف سے حوصلہ پا کر "گڑ بڑ" نے یکایک بہت زوردار آواز میں غزل سنانی شروع کر دی۔ بولے ؎

"فرشتوں نے بھلا دی طاعتِ رب
تری زلفوں کے خم ہیں آسماں میں

اس پر دوستوں نے حلق پھاڑ کر داد دی میں نے کہا کفر بکتے ہو، کم بخت۔

ضیاء الدین جھک جھک کر "آداب آداب" کہتے رہے اور ساتھ ہی اپنے مخصوص انداز میں "کھی کھی" کر کے ہنستے رہے پھر فرمایا ؎

"گلوؤں نے کی ہے سازش پھانسنے کی"

"ارے سازش کی بات نہ کر، ظالم!" اسحاق نے چیخ کر کہا۔

ضیاء الدین مسکرایا مگر اس نے فوراً دوبارہ مصرع شروع کیا اور ساتھ ہی شعر مکمل کر دیا

"گلوؤں نے کی ہے سازش پھانسنے کی
نہیں آتی ہے بلبل گلستاں میں"

"بلبل کو زنداں راس آ گیا ہے۔" جنجوعہ نے رائے دی
ضیاء الدین نے کہا "شعر عرض کیا ہے کہ ؎

پلا دی شیخ کو بھی آج ہم نے
عجب تاثیر ہے میری زباں میں

"ہاں صاحب، ڈاکٹر گوبلز آپ ہی کے شاگرد تھے۔ کسی نے پکارا۔

ضیاء الدین بولے "بندہ نوازی حضور کی ورنہ خادم تو کسی لائق نہیں۔ بہرکیف مقطع عرض کرتا ہوں ؎

نہ پوچھو حال تم کرنل ضیاء کا!
بہت وسعت ہے اس کی داستاں میں

"کیا خوب کرنل باندھا ہے۔" سجاد ظہیر نے گردن ہلاتے ہوئے کہا "پوری اردو شاعری میں رینک RANK کے استعمال کی ایسی مثال نہیں مل سکتی۔ واہ، واہ نہ پوچھو حال تم کرنل ضیاء کا، جزاک اللہ!"

ضیاء الدین کے بعد ارباب سے کہا گیا کہ اب وہ اپنا کلام پیش کریں۔ انہوں نے خالص پٹھانی لہجے میں شعر پڑھنے شروع کیے فرمایا ؎

کون لیتا ہے جہاں میں آج فرزانے کا نام
اب تو بس مشہور ہے بھینگے کا یا کانے کا نام

(روئے سخن غالباً استغاثہ کے سب سے بڑے وکیل مسٹر بروہی کی طرف تھا جن کی آنکھ میں کچھ نقص ہے۔ کسی شخص پر اس قسم کا ذاتی حملہ کرنا نہایت معیوب بات ہے لیکن جیل میں پھنسے ہوئے دل جلوں سے زیادہ احتیاطِ ضبطِ نفس اور "شرافت" کی توقع کرنا بھی بے کار ہے)

"اللہ اکبر" خضر نے چھاتی پر ہاتھ مار کر ایک فلک شگاف نعرہ لگایا

"بھینگے اور کانے کا نام! سبحان اللہ کیا مصرع کہا ہے!"

"واہ خر صاحب، ماننا پڑتا ہے آپ کو میں نے

تعریف کی۔

اس کے بعد ارباب نے جلدی جلدی اپنی پوری غزل پڑھ ڈالی۔ باقی تمام شعر بہت دلچسپ تھے۔" فرمایا ؎

اہلِ کاروں کی عنائت ہے کہ اب ملتا نہیں
خطۂ زرخیز میں گندم کے اک دانے کا نام
بھوک اور افلاس کا شکوہ نہیں واجب تمہیں
گھیر لیں گے "سیفٹی" میں گر لیا کھانے کا نام
حامیٔ جبر و تشدد ہو گئے ہیں اہلِ حکم
چھا رہا ہے آج سارے دیس پر تھانے کا نام

اس شعر پر بہت داد ملی۔

نیاز محمد ارباب نے آخری دو شعر پڑھ کر اپنی غزل کو ختم کیا۔

ہم تو اٹھ بھاگیں کے ملکِ پاک سے پیارے ندیم
شرع کی رو سے ہوا ممنوع جب گانے کا نام
آبا و اجداد کی باتیں چھوڑ دے اے نیاز
کس کو دلچسپی ہے، کیا تھا آپ کے نانا کا نام

اب محمد حسین عطا سے درخواست کی گئی کہ وہ اپنی غزل سنائیں۔ عطا صاحب نے کاغذ کا ایک پرزہ کھول کر سامنے رکھا اور سر کھجاتے ہوئے فرمایا۔" میں نے طرح کے مصرعوں پر غزل لکھنے کی بہتیری کوشش کی لیکن بات نہ بن سکی اس لئے میں نے ایک مختصر غیر طرحی نظم لکھنے پر اکتفا کی ہے امید ہے کہ آپ لوگ قبول فرمائیں گے۔"

" بکواس کیجئے۔" اسحاق نے بے تکلفی کی لاج رکھتے ہوئے کہا۔

"ارشاد فرمایئے قبلہ"، سجاد ظہیر موزوں لکھنوی لہجے میں بولے۔

عطا نے کہا۔

چمن کے گوشے گوشے میں خزاں کی حکمرانی ہے
گلوں کا رنگ پھیکا ہے فزوں دردِ نہانی ہے!

" کیا کہا؟ کہاں درد ہے۔ ایک صاحب جو اونگھ رہے تھے یکایک چونک کر بولے۔

اس پر اہلِ محفل ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئے اور مجھے کسی مفکر کا یہ قول یاد آیا کہ بیہودگی مزاح کا سب سے اہم عنصر ہے۔

عطا نے اپنی پوزیشن صاف کرنے کے لئے پہلے شعر کو دوبارہ پڑھا اور پھر دو شعر اور پڑھ کر نظم کا پہلا بند ختم کیا۔

چمن کے گوشے گوشے میں خزاں کی حکمرانی ہے
گلوں کا رنگ پھیکا ہے فزوں دردِ نہانی ہے
یہ کیسا درد ہے دل میں یہ کیسی نوحہ خوانی ہے
گلستاں میں ہر اک جانب ہیں ظلمت کے گھنے سائے
عنادل کی صدائیں ہیں، نہ چشموں کی روانی ہے

پہلے بند پر داد حاصل کر چکے تو عطا نے کہا

"صاحبان اب دوسرا بند پیش کرتا ہوں ؎

ادھر دیکھو، جہاں نورِ سحر کی ہے کرن پھوٹی
کہ گلچیں دم بخود ہیں اور عنادل پر جوانی ہے
نہیں ان کے گلستاں میں خزاؤں کا گزر ممکن
کہ غیروں کا تسلط بھولی بسری ایک کہانی ہے
جہاں اب زندگی کے تیز دھارے ہیں رواں ہر دم
بہاروں کے ترانے اور شراب ارغوانی ہے

بریگیڈیئر صدیق نے ذرا مسکراتے ہوئے کہا

"یہ کس جگہ کا ذکر ہے۔ کامریڈ"۔

"خلدِ بریں کا۔" اسحاق نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔

عطا نے اس سوال و جواب کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا "تیسرا اور آخری بند عرض کرتا ہوں۔"

ہیں پوشیدہ وہی چنگاریاں میرے چمن میں بھی
کہ جن کے دامنِ دل میں جہادِ زندگانی ہے
وہی تابندگی آئے گی میری آرزوؤں میں
کہ رنگِ پیرہن میرے گلوں کا غیر فانی ہے
خلش ہے انتظارِ آفتابِ نو کی ساعت کی
کہ شوقِ آشیاں بندی دلوں میں جاودانی ہے

جنرل نذیر نے کہا "ہمیں معلوم نہ تھا کہ مسٹر عطا ایسے اچھے شعر کہہ سکتے ہیں۔"

"بادشاہو، تساں ہالی دیکھیا ای کی ہے؟"

(حضرت ابھی آپ نے دیکھا ہی کیا ہے؟) اسحاق نے اپنے مخصوص انداز میں پوچھا اور صاحب صدر ہنسنے لگے۔ فرمایا "اب آپ کو حضرت خبیث اپنا کلام سنائیں گے؟"

مرحبا خبیث صاحب۔" خضر نے حوصلہ افزائی کی۔

ذرہ نوازی ہے جناب کی۔" میں نے عرض کیا۔ "حضرات آپ کی اجازت سے ایک شوخ سی غزل پیش کرتا ہوں۔"

فیض نے متانت سے کہا "ہاں صاحب، داغ کے بعد ایسی غزلیں کہنا آپ ہی کا حصہ ہے!"

حسن نے کہا "آپ کی خباثت اور شوخی سے کون انکار کر سکتا ہے۔"

میں نے اس تکرار کو ختم کرنے کے لئے فوراً بلند آواز میں ترنم سے غزل سنانی شروع کر دی۔

غزل یہ تھی ٥

آج ہے ہر اک زباں پر تیرے مستانے کا نام
گیسو و رخسار کے شیدا کا، دیوانے کا نام

لالہ رُخ، تیری بدولت ہو گئی وقعت میری
شمع کے دم ہی سے ہے مشہور پروانے کا نام

ذہن پر چھائے ہیں یوں جیتے ہیں صبح و شام ہم
سرخ لب، زلفِ سیہ اور مخملیں شانے کا نام

ہائے اس گورے بدن کے پیارے پیارے پیچ و خم
ساعت دیدار ہے، جو لی مسک جانے کا نام

عالم ناراضگی میں حُسن کی حدت غضب!
اک قیامت ہے تیری چتون پہ بَل آنے کا نام

پھر میں نے کہا "حضور ذرا شعر ملاحظہ ہو۔"

"فرمایئے!" سجاد ظہیر نے تکلف سے کہا۔

"میں نے کہا عرض ہے کہ ؎

سامنے غیروں کے تم ہم سے کرو بیشک حجاب
پر اکیلے میں نہ لیجو دوست شرمانے کا نام

یہ شعر اہلِ محفل کو بہت پسند آیا اور ہر طرف سے "مکرر مکرر" کا شور بلند ہوا۔ مجھے اس وقت ایک قبائلی شاعر کا لطیفہ یاد آ گیا اور میں نے اسے فوراً دہرا دیا۔ میں نے تیوری چڑھا کر مصنوعی غصے سے کہا "او خوچے مکرر مکرر کیا کرتا اے، ایکی دفعے کان کھول کر سونا۔"

قہقہوں کا طوفان ختم ہوا تو میں نے وہ شعر دہرایا اور تین شعر پڑھ کر اپنی غزل ختم کی آخری تین شعر مندرجہ ذیل تھے ؎

خود تو ہیں نا اہلِ لطفِ زیست شیخ و برہمن
دہر میں بدنام کر رکھا ہے، میخانے کا نام

ہم جو انساں دوست ہیں کرتے ہیں سب کا احترام
چاہے لے کعبہ کا کوئی یا صنم خانے کا نام

تم تو واقف ہو رموزِ بزم سے بیٹھے رہو
اے ظفر جب تک نہ لیں اغیار گھر جانے کا نام
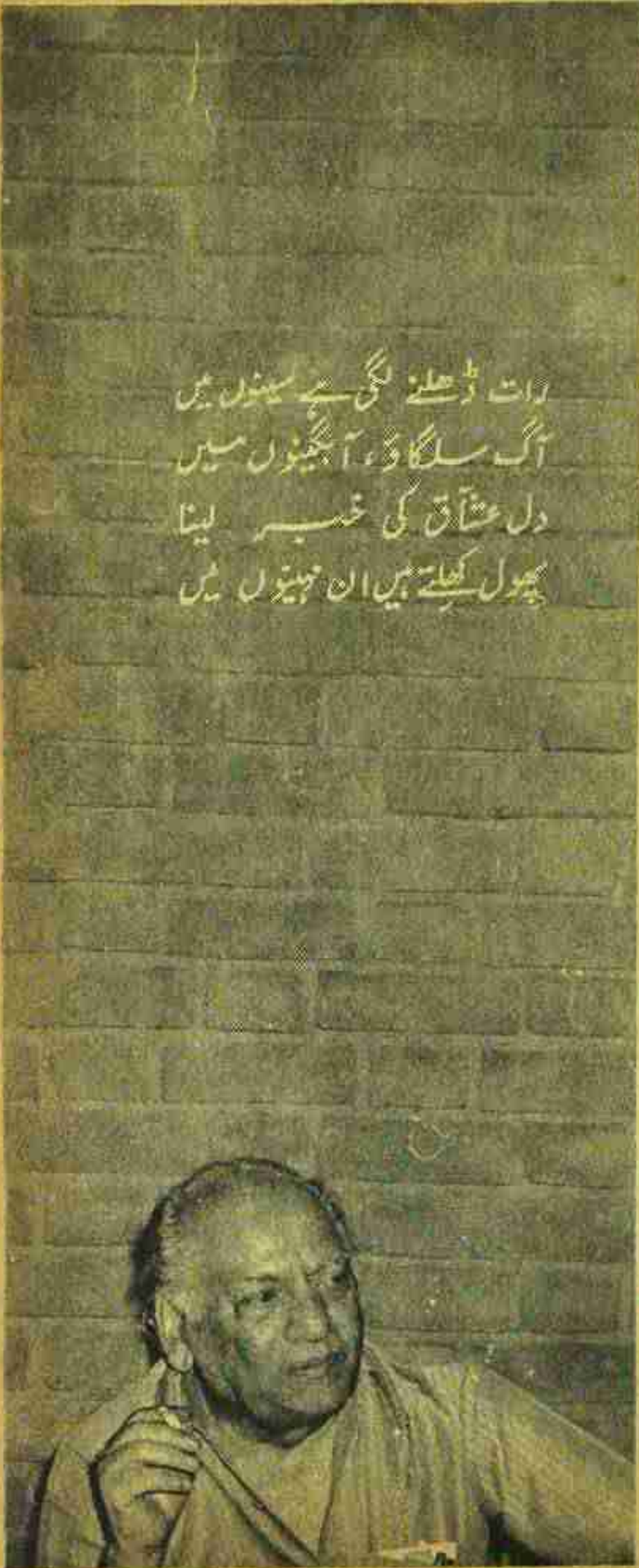
آخر میں فیض احمد فیض کی باری آئی اور سب لوگ مذاق اور فقرے بازی چھوڑ کر ہمہ تن گوش ہو گئے۔ فیض نے حسب معمول بہت نیچی آواز میں غزل سنانی شروع کی۔

میں نے کہا" قبلہ ذرا آواز کا خیال رکھئے۔"

فیض نے چونک کر ایک دم آواز کو کئی گنا بلند کر دیا۔ فرمایا۔ ؎

رنگ پیراہن کا، خوشبو زلف لہرانے کا نام
موسم گل ہے تمہارے بام پر آنے کا نام

فیض کے ایک ایک شعر کو دوستوں نے کئی کئی بار پڑھوایا۔ حالانکہ غزل طویل نہ تھی۔ پھر بھی تکرار کی بدولت اس کو سننے میں کافی وقت لگ گیا۔ غزل کے باقی اشعار درج ذیل ہیں۔

"دوستو، اس چشم و لب کی کچھ کہو جس کے بغیر
گلستاں کی بات رنگیں ہے نہ میخانے کا نام
پھر نظر میں پھول مہکے دل میں پھر شمعیں جلیں
پھر تصور نے لیا اُس بزم میں جانے کا نام
دلبری ٹھیرا زبانِ خلق کھلوانے کا نام
اب نہیں لیتے پری رو زلف بکھرانے کا نام
اب کسی لیلیٰ کو بھی اقرارِ محبوبی نہیں
ان دنوں بدنام ہے ہر ایک دیوانے کا نام
محتسب کی خیر، اونچا ہے اسی کے فیض سے
رند کا، ساقی کا، مے کا، خم کا، پیمانے کا نام
ہم سے کہتے ہیں چمن والے، غریبانِ چمن
تم کوئی اچھا سا رکھ لو اپنے ویرانے کا نام
فیض ان کو ہے تقاضائے وفا ہم سے جنہیں
آشنا کے نام سے پیارا ہے بیگانے کا نام

دوسرا مشاعرہ، جس کی رپورٹ اس وقت میرے سامنے ہے۔ ۳۔ مئی ۱۹۵۲ کو یعنی ہمارے مقدموں کے فیصلے اور ہمیں سزائیں مل جانے کے چار مہینے بعد ہوا۔ یہ ہمارا آخری مشاعرہ تھا۔ ۵۔ جنوری کو مقدمے کا فیصلہ سنایا گیا۔ عدالت نے جنرل نذیر کو ملازمت سے برطرف کرنے کے علاوہ تا برخاست عدالت کی سزائے قید کا حکم سنایا۔ وہ اسی دن رہا کر دئے گئے عدالت نے بیگم نسیم کو بھی رہا کر دیا تھا۔ لیکن وہ تو یوں بھی مشاعروں اور دوسری سرگرمیوں میں حصہ نہیں لیتی تھیں اس لئے ان کے رخصت ہو جانے سے کم از کم ہماری علمی ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ باقی ہم تیرہ مجرمین جنہیں ۴ سال سے لے کر ۱۲ برس تک کی سزائے قید عطا ہوئی تھی فیصلے کا اعلان ہونے کے چھ مہینے بعد تک حیدرآباد سنٹرل جیل میں اکٹھا رہے۔ سزا کا حکم سننے کے بعد کوئی ایک مہینے بھر تک طبیعت پر تھوڑا سا بوجھ ضرور تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ یار لوگوں کی فطری بے نیازی عود کر آئی اور ہم نے پہلے کی طرح ورزشی، ادبی اور تفریحی سرگرمیوں میں وقت گزارنا شروع کر دیا۔

۳۔ مئی کا مشاعرہ "بی" کلاس وارڈ کے باغیچے میں ہوا۔ جنرل نذیر اور بیگم نسیم کے رخصت ہونے کے بعد "اے" کلاس وارڈ میں دو کمرے خالی ہو گئے تھے اور چونکہ اس وارڈ کے کمرے "بی" کلاس وارڈ کے کمروں سے بہتر تھے اس لئے "سرائے" کے مکینوں میں سے دو افراد یعنی بریگیڈیر صدیق اور کرنل ضیا "خانقاہ" کی جانب ہجرت کر گئے۔ نتیجہ یہ کہ "سرائے" میں صرف آٹھ "سازشی" باقی رہ گئے۔

فیض کا سفرِ آخرت —— ہزاروں سوگوار

ماڈل ٹاؤن لاہور کے ایچ بلاک کا مکان نمبر ۱۲۶ اُداس اور خاموش تھا۔ بلند ہوتی ہوئی سسکیوں کی آوازیں سنائی دے جاتی تھیں یا سرگرمیوں کی سرسراہٹ۔ پچھلے لان میں شامیانہ لگا تھا اور اس کے نیچے ایک چارپائی پر اُس گھر کا مکیں بڑے آرام سے لیٹا ہوا تھا۔ وہ کئی بار یہاں آیا، اور یہاں سے رخصت ہوا تھا۔ کبھی ایک سال کے لئے، کبھی چھ ماہ کے لئے، کبھی چند روز کے لئے۔ کبھی اندرونِ ملک جانا ہوتا تھا، کبھی بیرونِ ملک، اب وہ ایک ایسے سفر پر روانہ ہو رہا تھا جس سے واپسی کی کوئی اُمید نہیں اُسے گھر میں پھر قدم نہ رکھنا تھا۔ جس کو اس سے ملنا ہو گا اس کی نئی رہائش گاہ تک جانا پڑے گا۔

سوا گیارہ بجے فضا کلمۂ شہادت سے گونج اٹھی، ہر زبان شہادت دینے میں مصروف ہو گئی کہ اللہ ایک ہے اس کا کوئی شریک نہیں، محمدؐ اُس کے رسول ہیں۔ اس کے ساتھ چارپائی کو مداحوں، عزیزوں اور رشتہ داروں نے آگے بڑھ کر اُٹھا لیا۔ سسکیاں چیخوں میں بدل گئیں، بہن اپنے بھائی کے لئے ماتم کناں تھی۔ بیوی شوہر کے لئے، بیٹیاں والد کے لئے۔ لیکن وہ شخص جو آنسو دیکھ کر بے چین ہو جاتا تھا، کسی کو تسلی نہیں دے سکتا تھا۔ جس نے دشمنوں کے خلاف محاذ قائم نہیں کیا۔ وہ دوستوں کو رُلا رہا تھا۔ انہیں دکھ دے کر جا رہا تھا۔ آج اُسے دیکھئے، اس سے ملنے کے لئے آنے والوں میں وہ سب لوگ شامل تھے وہ جن کے درمیان رہا تھا۔ برسوں وہ اس سے محبت کرتے رہے، اس پر تنقید کرتے رہے، اس کی تعریف کرتے اُسے پسند کرتے رہے۔ اسے پسند کرنے سے انکار کرتے رہے، اس سے اُلجھتے رہے، اس کے حلیف رہے، اس کے حریف رہے، مولوی، دانشور، سیاست داں، وکیل، اخبار نویس، سب اس کے لئے مغفرت کی دعا کر رہے تھے، یاد کر رہے تھے اس کے اور ان کے درمیان بڑا گہرا رشتہ تھا وہ ان کی پاک سرزمین سے اٹھا اور اسی میں سونے والا تھا۔

چارپائی وہ جس پر محوِ آرام تھا۔ کھلے میدان میں لا کر

رکھ دی گئی۔ ۷۲ برس سامنے بے حس و حرکت کھڑے تھے
سیالکوٹ کے ایک چھوٹے سے قصبے کالا قادر سے آغاز کرنے
والا کہاں کہاں نہ پہنچا۔ ابتدائی تعلیم مدرسے میں حاصل کی
پھر مختلف درس گاہوں سے ہوتا ہوا ایم اے انگریزی اور
عربی کی ڈگری تک گیا۔ یہ ڈگریاں اس کی انتہا نہ تھیں ابتدا
تھیں، وہ خاں بہادر سلطان احمد خاں کا فرزند تھا لیکن
خاں بہادروں اور خاں صاحبوں سے راستہ مختلف کرلیا۔
شاعری کے کوچے میں قدم رکھا۔ امرتسر کے ایم اے او کالج
میں جا لیکچرار ہوا۔ یہاں ڈاکٹر رشید جہاں کے مطب کا رخ
کیا اور شفا کے بجائے وہ درد پالیا جس کی دوا نہ مل سکی۔
ڈاکٹر صاحبہ کے ہاتھ پر بیعت کی اور مارکسزم سے ناطہ جوڑ
لیا۔ بقول نصراللہ خاں "وہ بچہ تھے رشیدان کی انا تھیں ان
کو لوریاں دیتیں تھپک تھپک کر مارکسی نغمے سناتیں اور مارکسی
خواب دکھایا کرتیں اس خوابناک ماحول میں فیض بھلا پہلے
سے فیض کہاں رہتے۔؟

وہ بدلے اور بہت کچھ بدلے لیکن عملی سیاستداں
یا کفن بردوش انقلابی نہ بنے خواب ناک ماحول سے باہر
قدم کم ہی رکھا۔ دوسری جنگ عظیم میں برطانوی فوج کے محکمہ
تعلقات عامہ میں کرنل بن کر پہنچے پاکستان بننے کے
بعد پاکستان ٹائمز کے چیف ایڈیٹر رہے حکومت کا تختہ الٹنے
کے سازش میں حوالۂ زنداں کئے گئے بڑے حوصلہ سے جیل
کاٹ لی۔ وطن کی گلیوں پر نثار ہوتے رہے مگر سر نہ جھکایا
لیکن رہے خوابوں ہی کے آدمی ان کی زندگی تو کیا ان کی
شاعری کو بھی مارکسزم کھا نہیں سکا۔

اقبال کی طرح ان کا تعلق سیالکوٹ سے تھا اس شہر سے
لاہور تک وہ ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے معلوم ہوتے
ہیں۔ ان کی شاعری میں اقبال کا رنگ تھا، منفرد لہجہ مختلف
اسلوب نغگی الفاظ جس نقطہ کو چاہا اٹھایا اور کہاں سے
کہاں سے کہاں پہنچا دیا اسے نئے نئے معانی دیئے ان سے
پوچھا گیا کہ اردو کا سب سے بڑا شاعر کون ہے؟ تو بے تکلف
اقبال کا نام لیا۔

فیض اشتراکی تھے لیکن ویسے اشتراکی نہیں جیسے روس
یا کسی اور ملک میں پائے جاتے ہیں نہ ویسے جیسے ان کے
اشتراکی دوست انھیں ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ وہ پاکستان
کی ثقافت اور دینی اقدار سے اپنے آپ الگ نہ کر سکے ان
سے ایک پوچھنے والے نے پوچھا کہ کسی ایسے شخص کا نام لیجئے
کہ بے اختیار زندہ باد کہنے کو دل چاہے۔ فوراً پکار اٹھے
ہمارے پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم چند روز پہلے اسلام آباد
کی ایک تقریب میں انھوں نے ہنستے ہوئے کہا تھا یاروں
کو اب ہمارے اسلام کی خبر ہوئی ہے یہیں انھوں نے اپنی
ایک فارسی نعت بھی سنائی تھی۔

فیض کی شاعری کسی خاص عقیدے یا نظریے کا نہیں
ان کے مزاج کا اظہار ہے وہ شعلہ نہیں شبنم تھے جذبے
کی شدت ان کے ہاں پائی جاتی ہے۔ لیکن اس آگ کی طرح
جسے سردیوں میں تاپ کر لطف آتا ہے۔

فیض کو سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کا بڑا مخالف
سمجھا جاتا ہے لیکن وہ رخصت ہوئے ہیں تو بہت بڑا سرمایہ
اور بہت بڑی جاگیر چھوڑ گئے ہیں دنیائے شعر و ادب ان کی
جاگیر بن چکی ہے اور ان کے اشعار کے سرمایے کے سامنے
تیل کی دولت ہیچ ہے۔ انھوں نے ایک انٹرویو میں
کہا تھا میں کسی سے ناراض ہو جاؤں تو سوچتا ہوں وہ ایسے
سوئے ہیں کہ اٹھنے کا نام نہیں لے سکتے خدا معلوم کس سے
ناراض ہو کر سوئے ہیں کہ دوستوں سے یا دوست نما دشمنوں
سے، دشمنوں سے ناراض ہونے کے تو وہ قائل ہی نہیں تھے

کانوں نے سنا... فیض احمد انتقال کر گئے

زبان سے نکلا... انا للہ و انا الیہ راجعون۔

دل میں آئی... کاش یہ خبر غلط ہو۔

مگر جانے والے یوں تھوڑا ہی رکتے ہیں۔ ہر طرف سے تصدیق ہو گئی تو ان کا شفیق چہرہ آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا، مخصوص لہجے میں ان کی باتیں کانوں میں گونجنے لگیں صرف ایک رات پہلے ان سے ہونے والی ملاقات کی یاد آتے ہی دل ڈوبنے لگا۔

وہ جو ۲۰ نومبر کی دوپہر ہم سے رخصت ہو گیا تھا

صرف ایک انسان نہیں تھا۔

وہ ایک دور تھا، ایک زمانہ تھا، ایک تاریخ تھا

ایک تحریک تھا۔

وہ جو "نقش فریادی" "دست صبا" "زنداں نامہ" "دست تہ سنگ" "سر وادی سینا" اور "شام شہر یاراں" جیسے شعری مجموعوں کا خالق تھا۔

وہ جو "پاکستان ٹائمز" اور "امروز" جیسے اخبار کا ایڈیٹر تھا

وہ جس نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد رکھی تھی

جو پاکستان میں ٹریڈ یونین تحریک کے بانیوں میں سے تھا

وہ جو فوجی نہ ہونے کے باوجود ایک فوجی سازش "راولپنڈی سازش کیس" کا مشہور اور نمایاں ترین ملزم تھا۔

وہ جس نے پاکستان میں آرٹ کونسلوں کے قیام میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ وہ جو سابقہ حکومت میں ثقافت کا وفاقی مشیر رہا تھا۔ وہ جسے لینن امن انعام ملا تھا۔

وہ جو کئی برس تک بیروت میں ایفرو ایشیائی ادب کے مجلے "لوٹس" کا چیف ایڈیٹر رہا تھا

بڑا شاعر، بڑا ادیب، بڑا دانشور اور بڑا آدمی۔

وہ جو چند روز قبل جنگ فورم میں مباحثے کی میز پر احمد ندیم قاسمی کے ساتھ اقبال کی فکر پر بات کر رہا تھا۔

وہ جسے ملنے میں صرف ایک دن قبل ماڈل ٹاؤن میں اس کی رہائش گاہ ایچ بلاک میں پہنچا تھا۔

جس وقت میں اور میری بیوی یاسمین ۱۹ نومبر کی شام سوا چھ بجے وہاں پہنچے تو بیگم ایلس فیض نے دروازہ کھولا تھا برآمدے میں تاریکی تھی۔ نہ جانے کیوں۔

ایسے لگا جیسے فضا کچھ سوگوار سی ہو۔ ڈرائنگ روم میں فیض صاحب ملے۔ پورے سوٹ میں تھے۔ جیسے باہر جا رہے ہوں۔ کہنے لگے تم دیر سے آئے ہو۔ اچھا کہو کیا بات ہے؟

میں نے بتایا کہ یاسر عرفات پر ایک کتاب لکھی ہے
آپ چونکہ بیروت میں رہے ہیں اور ان سے ملاقاتیں بھی کرتے رہے ہیں اس لئے آپ کا انٹرویو اس میں شامل کرنا چاہتا ہوں۔

وہ کچھ دیر اپنے قیام بیروت کی باتیں سناتے رہے
میں نے کہا لکھنا شروع کروں تو کہا نہیں مجھے ذرا تیاری کرنے دو۔ پرسوں مجھے کراچی جانا تھا۔ لیکن ابھی تک نہ تو وہاں سے ٹکٹ آیا ہے اور نہ کوئی اطلاع۔ تم یوں کرو کہ کل چار بجے فون کر کے آجاؤ۔ اگر مجھے کراچی جانا ہوا تو کل ہی بات کریں گے اور اگر نہ جانا ہوا تو پرسوں وقت ہی وقت ہے۔ پھر کہا میں تمہیں یاسر عرفات کے آخری خط کی فوٹو اسٹیٹ بھی دوں گا۔ جو انھوں نے میری سالگرہ پر مبارکباد کا لکھا تھا کچھ تصویریں بھی ہیں۔

اس پر بیگم ایلس فیض حیرت سے بولیں "یہ چیزیں مل جائیں گی؟ میری نظر سے تو شاید نہیں گزریں۔"

فیض اپنے مخصوص تدبّر لہجے میں رک رک کر بولے مل جائیں گی۔ وہ بھی مل جائیں گی۔ پھر یاسمین کی طرف مڑ کر کہا آپ لوگ آئے بھی دیر سے ہیں۔ اور میں انتظار کر کے اب اپنی بیٹی کے ہاں جانے والا تھا ان کے ہاں کھانے کی تقریب ہے۔ بچوں کی فرمائش ہے جلد ہی پہنچنا ہے۔ اور ہاں عبداللہ کیوں نہیں آئے۔

میں نے بتایا کہ عبداللہ ملک کو راستے میں لینا تھا۔ مگر ان کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی تھی۔ شاید بخار ہو گیا ہے انھوں نے کہا تم اکیلے چلے جاؤ۔

وہ مسکرائے پھر بولے ہاں بھئی کچھ نہ کچھ ہوتا ہی رہتا ہے۔ آخر ہمارے لئے کچھ ہونے ہی کے دن ہیں۔ مجھے ان کا جملہ کچھ عجیب سا لگا۔ بظاہر وہ بالکل نارمل تھے پھر ایسی مایوسی کی بات کیوں ؟

ہمیں چھوڑنے وہ باہر تک آئے۔ برآمدے کا دروازہ کھول کر ہم کھلے میں آنے لگے تو میں نے منع کیا کہ آپ تکلیف نہ کریں وہ پھر مسکرائے۔

"کل چار بجے فون کروں گا۔" میں نے کہا میں چلتے چلتے رک گیا۔

"لیکن فیض صاحب آپ کو کل تو کراچی نہیں جانا۔ اگر آپ گئے بھی تو پرسوں جائیں گے۔

"ہاں اگر گیا تو پرسوں ہی جاؤں گا ... ورنہ نہیں۔"

"اور وہ جنگ فورم میں آپ کے ساتھ شام منانے کی تاریخ۔ ؟

"وہ بھی ملے گی۔ جلد ہی ملے گی۔"

۲۰ نومبر کو چار بجے میں فیض صاحب کے گھر فون کرنے کے بجائے یہ سطریں لکھ رہا ہوں اور نگار زریں اور حسن رضوی جو ابھی ابھی ۱۰۲ ای بلاک ماڈل ٹاؤن سے واپس آئے ہیں۔ مجھے بتا رہے ہیں کہ وہاں کون کون پہنچا ہوا ہے۔

اچانک فون کی گھنٹی بجی ہے یاسمین گھر سے بول رہی ہیں آپ کو یاد ہے رات فیض صاحب نے آخری بات کیا کہی تھی انھوں نے کہا تھا کہ کل کون جانے کل میں کہاں ہوں گا۔

"ہاں ہاں مجھے یاد ہے۔ اچھی طرح یاد ہے" میں نے فون بند کر دیا ہے اور سوچ رہا ہوں کیا یہ بات انھوں نے بلا وجہ کہہ دی تھی۔ کیا ان کے گھر میں داخل ہوتے ہی سوگواری کا احساس واقعی بلا وجہ تھا۔

فیض صاحب چلے گئے اور میری کتاب ہمیشہ کے لئے نامکمل چھوڑ گئے۔ جنگ فورم میں ان کے ساتھ تو اب شام بھی نہیں منائی جا سکے گی جس کی میں نے اتنی تیاریاں کی تھیں۔

فیض احمد فیض

کے نام یاسر عرفات کا خط

تنظیم آزادیٔ فلسطین:

کمیٹی صدر

شاعر بزرگ و مجاہد برادر فیض احمد فیض

سلام انقلابی کے بعد عرض گذار ہوں کہ ہمیں آپ کے ستر سال کی عمر حاصل کرنے کی خبر ملی ہے میں اس موقع کو غنیمت سمجھتا ہوں کہ اپنی طرف سے تنظیم آزادیٔ فلسطین کے ایگزیکیٹو ارکان کی طرف سے اور عرب فلسطینی عوام کی طرف سے آپ کے لئے اپنی دلی تمناؤں کا اظہار کروں کہ آپ کو صحت و خوش بختی نصیب ہو۔

ہمارے عرب فلسطینی عوام نے آپ کی ذات میں ایک ترقی پسند بین الاقوامی شاعر، دنیا میں امن کے لئے جدوجہد کرنے والا اور ان عوام کا حامی انسان پایا ہے جو اپنی آزادی، ترقی اور بہبود کے لئے کوشاں ہے ہمارے عرب فلسطینی عوام آپ کی دوستی آپ کے گہرے شعور اور فلسطین کے مسئلہ کے لئے نیز فلسطینی عوام کے جائز حقوق کے حصول کے لئے آپ کی جدوجہد پر فخر کرتے ہیں۔

آپ کے مخلصانہ اور سچائی سے بھرپور اشعار جن میں فلسطینی عوام کا ذکر ہے اور خاص طور پر اس کے بچوں کا اور اس کے انقلابیوں کا تذکرہ ہے ابدالآباد تک ایک ایسا نمونہ پیش کریں گے جن سے برادرانہ صداقت اور مخلصانہ محبت اجاگر ہوتی رہے گی۔

ہم آپ کے لئے خوش بختانہ زندگی اور طویل عمر کے متمنی ہیں۔ آپ کی خدمت میں بہترین تمناؤں اور احترامات کے ساتھ "فتح تک انقلاب" کے نعرے کے ساتھ۔

آپ کا مخلص یاسر عرفات

بیروت ۱۹-۲-۸۱ (صدر ایگزیکیٹو کمیٹی تنظیم آزادیٔ فلسطین، کمانڈر انچیف، فلسطینی انقلابی افواج)

فقیر وحید الدین

یادیں فیض احمد فیض کی

فیض فطرتاً بہت اچھے" دوست بہت اچھے" انسان اور بہت اچھے" دانشور کی حیثیت سے ہر کہیں جانے پہچانے جاتے ہیں ان پر خلوص و دوستی کے متعلق میرے احساسات اور تجربات آج بھی وہی ہیں جو کم و بیش سال پہلے تھے۔ جب ہم لوگ دہلی میں فوجی ملازمت کے سلسلے میں اکٹھے رہے، اس زمانہ کی دل چسپ ملاقاتوں کی یاد ابھی تک ذہن پر نقش ہے۔

فیض اس وقت بھی شعر کہتے تھے۔ لیکن اب تو انہیں بحیثیت ادیب، شاعر، نقاد، اور صحافی آفاقی شہرت حاصل ہے' ان کی شہرت اور کمالِ فن میں ان کے جوہر طبع کو زیادہ دخل ہے یا مشق و جستجو کو، یہ سوال اگرچہ کئی بار ذہن میں ابھرا۔ لیکن اس کا صحیح جواب پروفیسر محمد سلیم چشتی صاحب کی ایک ملاقات میں خود بخود مل گیا سلیم چشتی صاحب علامہ اقبال کے ہم عصر اور محفلِ اقبال کے خوشہ چیں ہونے کے علاوہ ۱۹۲۸ء میں مرے کالج سیالکوٹ میں لیکچرار بھی رہے ہیں۔ ان دنوں وہ ایف اے کلاس کو انگریزی اور بی اے طلباء کو اردو پڑھاتے تھے۔ فیض نامی متین و ذہین لڑکا بھی فرسٹ ایر میں ان کا شاگرد تھا۔ چشتی صاحب کا بیان ہے کہ:

"یہ لڑکا اپنی شرافت، سنجیدگی، بردباری، کم آمیزی اور رکھ رکھاؤ کی وجہ سے میری ساری کلاس میں ممتاز تھا۔

اکتوبر میں جب کالج میں TUTORIAL GROUP) بنے تو حسنِ اتفاق سے یہ لڑکا چشتی صاحب کے گروپ میں شامل ہوگیا۔ چشتی صاحب نے اپنے فلسفیانہ ذوق کی مناسبت سے اس گروپ کا نام "اخوان الصفا" رکھا طے پایا کہ گروپ کے زیرِ اہتمام ہر ماہ کالج میں ایک محفلِ مشاعرہ منعقد کی جائے۔ انہوں نے پہلے مشاعرہ کے لئے یہ مصرعِ طرح تجویز کیا تھا ؎

غمزہ نہیں ہوتا کہ اشارہ نہیں ہوتا

نومبر ۱۹۲۸ء کے پہلے ہفتے میں مرے کالج میں پہلی مرتبہ یہ محفلِ مشاعرہ منعقد ہوئی۔ اس مشاعرہ میں مذکورہ بالا نوجوان نے بھی جس کی عمر ۱۶ سال تھی کچھ زیادہ تھی ایک غزل پڑھی اور جب یہ شعر سنایا ؎

لب بند ہیں ساقی مری آنکھوں کو پلادے
وہ جام جو منت کشِ صہبا نہیں ہوتا

شعر موزوں کرنے کی اِس استعداد سے نہایت متاثر

ہوئے اور ان کے ایک ہم جماعت رحمت اللہ بیدل سے کہا۔

"اگر یہ لڑکا زندہ رہا اور اسی طرح مشق سخن کرتا رہا تو آگے چل کر اس کا شمار ہندوستان کے پہلی صف کے شعرا میں ہوگا۔"

چشتی صاحب کی اِس پیش گوئی کو اب ۳۶ سال گزر چکے ہیں اور آج واقعی فیض کا شمار نہ صرف ہندوپاک کے دانشوروں میں ہے بلکہ اپریل ۱۹۶۲ء میں انہیں روس کا سب سے بڑا اعزاز "لینن پرائز" بھی حاصل ہو چکا ہے۔ یہ پرائز اس سے قبل ہندوستان میں ڈاکٹر سیف الدین کچلو کو ملا تھا، اور امنِ عالم کے قیام کی کوششوں کے سلسلے میں انڈونیشیا کے صدر سوئیکارنو اور گھانا کے صدر نکرومہ کو بھی مل چکا ہے۔ پہلے اس اعزاز کو "اسٹالن پرائز" کہا جاتا تھا۔ لیکن خروشیف کے زمانے میں اِسے لینن پرائز کا نام دیا گیا۔ یورپ میں طویل عرصہ قیام کے بعد فیض گزشتہ سال اپنے وطن واپس آئے ہیں اور ان کا نام ملکی صحافت، قومی صحافت آرٹ، ادب اور شاعری کی زینت بنا ہوا ہے۔ وہ ثقافتی سرگرمیوں، علمی مجلسوں اور شعری محفلوں کے روحِ رواں ہیں۔

ان کی زندگی کے متعلق بہت سی باتیں ایسی ہیں جو خاصی دل چسپ تو ہیں لیکن عام نہیں ہیں۔

فیض صاحب ۱۹۱۱ء میں سیال کوٹ جیسی مردم خیز سرزمین میں پیدا ہوئے جسے شاعرِ مشرق علامہ اقبال جیسی ایک باعزت ہستی کی پیدائش کا فخر حاصل ہے۔ ان کے اکثر بزرگ زراعت پیشہ تھے۔ لیکن فیض کے والد سلطان محمد خاں ذی حیثیت ہونے کے علاوہ اہلِ علم اور صاحب تصنیف بھی تھے۔ کئی سال امیر عبدالرحمن کے ہمراہ وہ افغانستان میں رہے، اردو، انگریزی میں کئی کتابیں تصنیف کیں، افغانستان کے دستوری قوانین اور "تزک امیر" انگریزی میں ایک ناول (THE WAZIR'S DAUGHTER) جس کا اردو ترجمہ "دخترِ وزیر" کے نام سے شائع ہوا۔ فیض کو بچپن میں مسجد شیخ حسام الدین بھیجا گیا جہاں انہوں نے مولوی محمد ابراہیم سیال کوٹی سے قرآن شریف پڑھا اور مکتب میں میر حسن کے شاگرد رہے، ۱۹۲۷ء میں اسکاچ مشن اسکول سے میٹرک ۱۹۲۹ء میں مرے کالج سیال کوٹ سے ایف اے پاس کیا۔ فیض کو ان دنوں پھر مولوی میر حسن سے عربی پڑھنے کا موقع ملا چونکہ عربی ان کے منتخب مضامین میں شامل تھی۔ جب وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہونے لگے تو اس موقع پر انہیں علامہ اقبال کی تائید و معاونت حاصل تھی۔ علامہ کا خط لے کر وہ کالج گئے۔ داخل ہوئے اور ۱۹۳۱ء میں اعزاز کے ساتھ بی اے پاس کیا اور عربی میں آنرز کیا، ۱۹۳۳ء میں انگریزی، اور ۱۹۳۴ء میں عربی میں ایم اے پاس کر کے ایم اے او کالج امرتسر میں لیکچرار بن کر چلے گئے۔ وہاں ۱۹۳۹ء تک انگریزی، اردو، اور عربی پڑھاتے رہے، ۱۹۴۰ء میں ہیلی کالج لاہور آگئے اور انگریزی ۱۹۴۲ء تک انگریزی کے لیکچرار رہے پھر اپنے محسن اور استاد مجید صاحب کی تحریک پر ۱۹۴۲ء میں فوج کے شعبۂ عامہ سے وابستہ ہوگئے۔ جہاں بطور کیپٹن ان کا تقرر عمل میں آیا۔ ۱۹۴۳ء میں لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر ترقی یاب ہوئے اور قیام پاکستان سے ذرا قبل قائداعظم محمد علی جناح کے زیرِ سرپرستی

لاہور سے انگریزی روزنامہ پاکستان ٹائمز جاری کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ نواب افتخار حسین ممدوٹ اور سردار شوکت حیات کی تجویز اور تحریک پر فیض احمد فیض کو اس نئے انگریزی روزنامہ کا چیف ایڈیٹر مقرر کیا گیا۔ فیض دسمبر ۱۹۴۶ء میں فوج سے مستعفی ہو کر لاہور آ چکے تھے چنانچہ ۲ فروری ۱۹۴۷ء سے پاکستان ٹائمز کی باقاعدہ اشاعت شروع ہو گئی۔ پاکستان جیسا انگریزی روزنامہ نکالنا اس زمانے میں مسلمانانِ پنجاب کے لئے بالکل نیا تجربہ تھا لیکن فیض کی خداداد ذہانت اور شب و روز کی جدوجہد نے اسے کامیابی کی ایسی راہ پر ڈال دیا تھا کہ پھر وہ اکثریتی فرقے کے دباؤ، حکمرانوں کی سخت گیری اور ناموافق حالات کے روکے نہ رک سکا۔

شروع میں پاکستان ٹائمز سول ملٹری گزٹ پریس میں چھپتا تھا لیکن قیامِ پاکستان کے فوراً بعد اخبار ٹریبون بند ہو گیا اور بلڈنگ مع پریس پاکستان ٹائمز کے لئے خرید لی گئی جہاں سے وہ اب تک شائع ہوتا ہے، اردو روزنامہ "امروز" بھی انہیں کی ادارت میں جاری ہوا۔ مولانا چراغ حسن حسرت اور ایوب کرمانی ان کے معاون اور رفیقِ ادارت تھے۔ اس اخبار نے اردو صحافت کے لئے جو جدید راہیں اور نئی منزلیں تلاش کیں آج ملک کی پوری اردو صحافت ان پر چل رہی ہے اور کئی اعتبار سے حیرت انگیز ترقی کر چکی ہے۔ خبر نویسی اداریے مقالات و تاریخ نگاری، تدوین کے نئے زاویۂ نگاہ اور کتابت و طباعت سے لے کر تصاویر تک کتنی ہی باتیں ایسی ہیں جن کا تجربہ پہلی بار امروز میں کیا گیا تھا لیکن فیض کی ادارت میں ان اخبارات میں کاروباری منفعت سے زیادہ عوام کی ذہنی نشو و نما اور احساسات کی رہنمائی اور بیداری کا کام کیا۔

میرے علم میں ہے کہ فیض نے کسی سے اصلاح نہیں لی، کبھی محض نمود و نمائش اور داد و ستائش کے لئے شعر کہا۔ انہوں نے شاعرانہ تخلص کی رسم بھی نہیں اپنائی بلکہ ان کا موجودہ نام فیض احمد فیض فوجی ملازمت کے آغاز پر محض اتفاقی طور پر کسی نے کاغذات پر رقم کر دیا جسے بعد میں انہوں نے تبدیل کرنے کی زحمت گوارا نہ کی اور آہستہ آہستہ وہ ملک بھر میں بلکہ ساری دنیا میں فیض احمد فیض مشہور ہو گئے۔ ان کا پہلا مجموعہ ۱۹۴۱ء میں "نقشِ فریادی" کے نام سے شائع ہوا اور دوسرا مجموعہ "دستِ صبا" ۱۹۵۳ء کے دورِ اسیری کی یادگار ہے اور اس کے اب تک پانچ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ تیسرا مجموعہ کلام جس کا نام 'زنداں نامہ' اور 'سرنامہ اُسودا' کا یہ شعر ہے

لے ساکنانِ کنجِ قفس، صبح کو صبا
سنتے ہیں جائے گی سوئے گلزار کچھ کہو

کہاں اور کن حالات میں مرتب ہوا۔ یہ بات بالکل ظاہر ہے۔ بہرحال یہ ۱۹۵۶ء میں شائع ہو کر مقبولِ عام ہوا۔ ایک بار تینوں مجموعوں کے لئے نئے ایڈیشن شائع کرنے کا تذکرہ ہوا۔ فیض نے بتایا کہ وہ ان تینوں کو یکجا کر کے عنقریب شائع کرنا چاہتے ہیں، جس کا نام ہوگا 'دست تہِ سنگ'، نثر میں فیض کی تصنیف 'میزان' کے نام سے ۱۹۶۱ء میں شائع ہو چکی ہے جو دراصل تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔

فیض سے جو لوگ پہلی بار ملتے ہیں ان کی کم آمیزی سے غلط فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ فیض اور کبر و نخوت دو متضاد باتیں ہیں۔ ان کی کسرِ نفسی

اور بے نیازی کا رنگ کچھ قریبی دوستوں ہی سے
پوچھئے۔ وہ خاموش لیکن جہاں دیدہ اور جہاں بین
انسان ہیں۔ جب دیکھتا ہوں کچھ سوچتے ہوئے پاتا
ہوں۔ واقعات زمانہ کی افتاد اور حوادث گردوپیش
کی نامساعدت کا نہ ان کے ذہن پر کوئی منفی اثر ہوتا
ہے نہ سوچ پر۔ بہت سے بڑے بڑے مسائل کا تجربہ
وہ یوں کرتے ہیں جیسے وہ بالکل روایت اور معمول
کے مطابق تھے۔ ان کی اہمیت عارضی اور ان کا حل
یقینی ہے، زندگی میں آزمائشوں اور مصائب و آلام
کو انہوں نے اس سے زائد شاید ہی سمجھا ہو کہ ہوا کا
ایک جھونکا زور سے آیا اور گزر گیا لیکن دوسروں کا
دُکھ درد دیکھنا اور برداشت کرنا ان کے بس کی بات
نہیں۔ گفتگو کے دوران ایک دفعہ میں نے بڑی سنجیدگی
سے پوچھا۔

"فیض! جیل کتنی بار گئے ہو؟"

بڑی بے نیازی سے جواب دیا۔ "بس کوئی تین
بار۔"

مزید تحقیق کی، تو اسی بے پروائی اور مختصر انداز
میں کہا: "پہلی دفعہ ایک دن کے لئے، دوسری دفعہ
چار سال اور تیسری دفعہ چار ماہ۔"

آج کل فیض سر عبداللہ ہارون کالج کے پرنسپل
ہیں، لیکن انہوں نے جتنے دن اپنا تعلق صحافت سے
رکھا اخلاقی جرأت، بے باکی، بے خوفی اور حق گوئی
کی چٹان بن کر رہے۔ مصلحت کوشی، چاپلوسی اور
قصیدہ نویسی کو انہوں نے انسانی فطرت اور افراد
کے اخلاق و کردار کے لئے ہمیشہ گھن سمجھا جو پہلے
فرد کو لگتا ہے، پھر اجتماعی زندگی کی حمیت کو کھا جاتا
ہے۔ فیض نے واقعی نظریاتی اور عملی اعتبار سے
ہوا کے رُخ پر بادبان کھولنے کی رسم نہ کبھی قبول کی
اور نہ اُسے رواج دیا۔ اس موقع پر ایک واقعہ کا
ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

۱۹۴۸ء میں "امروز" کی ایک خبر پر لاہور
کے ایک پولیس افسر کو بہت غصہ آیا۔ بات وارنٹ
اور مقدمے تک پہونچی۔ فیض گرفتار ہو کر ڈپٹی کمشنر
ظفر الاحسن کی عدالت میں پہونچے۔ انہوں نے کہا
"شخصی ضمانت داخل کر کے آپ رہا ہو سکتے۔ فیض
نے کہا۔ "اس کی ضرورت نہیں ہے۔" ملک کے ممتاز
ماہر قانون محمود علی قصوری کو علم ہوا تو فوراً فیض
کی پیروی کے لئے عدالت پہونچے۔ فیض نے اُنہیں
بھی روک دیا کہ صفائی دینا مطلوب ہی نہیں ہے
وکالت اور پیروی کیسی؟ عجب کشمکش تھی، بالآخر
عدالت نے سرکاری وکیل مقرر کرنے کی ہدایت
کی جس نے ان کی صفائی میں دلائل دئے۔ عدالت
نے یہ دلائل قبول کرتے ہوئے انہیں باعزت بری کر دیا۔

فیض واپس آئے۔ "امروز" میں ایک ایسا
مقالہ افتتاحیہ سپردِ قلم کیا جس کے نیچے ان کے دستخط
بھی شائع ہوا۔ پاکستان ٹائمز اور امروز کی تاریخ میں
پہلی مثال تھی کہ ایڈیٹر کے دستخط کے ساتھ ایڈیٹوریل
شائع ہوا ہو۔

فیض کے پاس بیٹھ کر ان کی گفتگو سننا اور مطالعہ
کرنا ایک ہی جیسی بات ہے۔ موڈ میں تو آہستہ آہستہ
کتنے ہی مشکل سے مشکل مسائل و افکار کی گرہیں
کھولتے چلے جاتے ہیں، سبک خرام، سبک کلام لیکن
جو کچھ کہتے ہیں بہت خود اعتمادی اور پختہ یقین کے

ساتھ بچے تلے انداز میں، گویا ذہنی الجھاؤ سے وہ ناآشنا ہیں۔ ان کی یہ سب مفید اور قیمتی باتیں قومی سرمائے ادب کا حصہ ہیں جسے بد قسمتی سے محفوظ نہیں کیا جارہا ہے۔ اشعار کی صورت میں اب تک ان کے جو ادب پارے شائع ہوئے ہیں وہ بہت کم ہیں۔ ان کا زیادہ حصہ فیض کی بے نیازی اور قلندرانہ طبیعت کی بدولت ضائع ہوگیا ہے۔ مشرق اور مغرب کے ادب، نوع انسان کی تاریخ، سماجی و ثقافتی قدروں، قدیم و جدید علم کے گہرے اثرات پر ان کی نظر بہت وسیع ہے اور بحیثیت انسان دوست اور بحیثیت دانشور وہ اس نسل کے لئے ایک نصیحت سے کم نہیں ہیں۔ دیرینہ تعلق خاطر کی بنا پر مجھے ان کی صحبت میں وقت گزارنے کا موقع اکثر ملتا ہے۔ کبھی وہ کرم فرماتے ہیں، کبھی میں جاتا ہوں، بعض ملاقاتوں کی یادداشتیں ذہن میں اِس طرح محفوظ رہ جاتی ہیں جنہیں فراموش کرنا بھی چاہوں تو نہیں کرسکتا۔

ایک ملاقات کے دوران کوئی صاحب ان سے اردو ادب کی ترقی اور جمود پر گفتگو کررہے تھے۔ فیض نے کہا۔ "میں اردو ادب کی ترقی کی رفتار سے مطمئن ہوں...... دراصل ادیبوں کا ایمان کم زور ہوگیا ہے...." پھر کہا۔ شاعری میں جمود نہیں ہے، جب پٹرول کم ہوتا ہے تو گاڑی رُک جاتی ہے، لیکن عارضی طور پر...... پھر چل دیتی ہے۔"

ایک دفعہ سوال کیا گیا کہ نظم آزاد کو لوگ شاعری ہی نہیں سمجھتے۔ ان کا خیال ہے عروض سے باہر شاعری کا تصور خود فریبی ہے۔

فیض نے کہا۔ "کسی بات کو صرف اس لئے شعر نہیں کہا جاسکتا کہ وہ عروض میں ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ شاعر کے پاس کچھ کہنے کے لئے ہے بھی نہیں۔ اسے کہنا آتا ہے یا کہنے کے لئے اس کے پاس الفاظ اور سلیقہ ہے۔ اگر اس کے پاس کہنے کے لئے کچھ نہیں ہے اور اس کے باوجود وہ کہہ رہا ہے تو وہ شعر یقیناً نہیں ہے۔"

بحث کچھ آگے بڑھی تو فیض نے مزید کہا "سمت اور منزل کے بغیر شاعری کا کوئی مستقبل نہیں ہے۔ شاعر، ادیب اور دانشور کو بنیادی طور پر آگاہ ہونا چاہئے کہ سچ کیا ہے؟ جھوٹ کیا ہے، عارضی کیا ہے مستقل کیا ہے؟ حقیقت کیا ہے؟"

فیض کو گفتگو کے موڈ میں دیکھ کر میں نے دریافت کیا۔ "فارسی اور اردو شاعری نے ان کے ذہن اور خیالات کو کس حد تک متاثر کیا ہے؟" جواب میں کہا "فارسی میں ایک شاعر حافظ کو ٹھیک سے پڑھا ہے اور اردو میں میرؔ اور غالبؔ کو غور اور دل چسپی سے پڑھا ہے، اقبالؔ ایسا ہے کہ اسے پڑھتے وقت کوئی اور نظر میں نہیں جچتا۔ محسوس ہوتا ہے جیسے شاعری وہ ہیں۔ فکر اور شعریت دونوں میں ہیں، ہمہ گیر اور آفاقی۔"

فیض نے اردو شاعری پر اثر انداز ہونے والے تاریخی حوادث کا تجزیہ بھی کیا ہے اور اُن محرکات کا ذکر بھی جو کبھی ترقی ادب کا نشان بنے اور کبھی جمود کا پیغام انہوں نے کہا۔ اردو شاعری کا بڑا حصہ اس جمود یا اس کی یادگار ہے جو وکٹورین دور کے برطانوی اخلاق نے پیدا کی۔ دراصل یہ ایک مصلحت آمیز منافقت تھی، جو سنجیدگی کے روپ میں ادب کی قدروں پر مسلط ہوئی اور اس کی ساری شوخی اور ندرت چھین کر لے گئی۔

(یہ مضمون فیض کی زندگی میں لکھا گیا)

■ ■

مسجد تری شیخ حقیقی نہ خرابات میں کوئی

اب کس کی امانت میں غمِ کارِ جہاں دیں

شاید کوئی ان میں سے کفن پھاڑ کے نکلے

اب جائیں شہیدوں کے مزاروں پہ اذاں دیں

فیض

فیض کی تحریر

سلطان محمود احمد شمیم چشتی کے لیے

بجھے بجھ جاتی ہیں شمعیں جو ہوا تیز چلی

لا کے رکھو سرِ محفل کوئی خورشید اب کے

منیر احمد

۷۶

(دائیں سے بائیں)
سوہن راہی ، رحیم اللہ شاد،
جالبی ردولوی
راج کھیتی
اور فیض احمد فیض

(دائیں سے بائیں) ایک صحافی، چمن لال چمن
مجاہد ترمذی، فیض اور دو صحافی

ایک جلسے میں
(دائیں جانب سے) فیض احمد فیض
افتخار عارف اور
پروفیسر این میری شمیل

۳۰-نومبر ۱۹۸۴ کو
غالب اکیڈمی میں منعقد فیض کے
تعزیتی جلسے میں (دائیں سے بائیں)
حیات اللہ انصاری، اندر کمار گجرال (صدر
جلسہ) ہمایوں خاں (سفیر پاکستان)
انور جمال قدوائی
پروفیسر گوپی چند نارنگ،
گلزار دہلوی اور ضامن علی خاں

فیضؔ کے پہلے مجموعے "نقشِ فریادی" کا دیباچہ ان کے شاعرانہ نقطۂ نظر کا عکاس ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت کا آئینہ دار بھی ہے۔ اس سے فیض کے فن اور ان کے شعور کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اس لئے فیض کی نمائندہ تحریر کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔

اس مجموعہ کی اشاعت ایک طرح کا اعتراف شکست ہے، شاید اس میں دو چار نظمیں قابلِ برداشت

ہوں۔ لیکن دو چار نظموں کو کتابی صورت میں طبع کروانا ممکن نہیں، اصولاً مجھے جب تک انتظار کرنا چاہیے تھا کہ ایسی نظمیں کافی تعداد میں جمع ہو جائیں۔ لیکن یہ انتظار کچھ عبث معلوم ہونے لگا ہے۔ شعر لکھنا جرم نہ سہی لیکن بے وجہ شعر لکھتے رہنا ایسی دانشمندی بھی نہیں۔ آج سے کچھ برس پہلے ایک معین جذبے کے زیرِ اثر اشعار خود بخود وارد ہوتے تھے لیکن اب مضامین کے لئے تجسس کرنا پڑتا ہے۔ علاوہ ازیں ان نوجوانی کے تجربات کی جڑیں بہت گہری نہیں ہوتیں، ہر تجربہ زندگی کے بقیہ نظام سے الگ کیا جا سکتا ہے اور ایک کیمیاوی مرکب کی طرح اس کی ہر ہئیت مطالعہ کی جا سکتی ہے۔ اس منفرد اور معین تجربہ کے لئے کوئی موزوں پیرایۂ بیان وضع یا اختیار کر لینا بھی آسان ہے، لیکن اب یہ تمام عمل مشکل بھی دکھائی دیتا ہے اور بیکار بھی، اوّل تو تجربات ایسے خلط ملط ہو گئے ہیں کہ انہیں علیحدہ علیحدہ ٹکڑوں میں تقسیم کرنا مشکل ہے پھر ان کی پیچیدگی کو دیانت داری سے ادا کرنے کے لئے کوئی تسلی بخش پیرایۂ بیان نہیں ملتا۔ میں جانتا ہوں کہ یہ تجربات کا قصور نہیں، شاعر کے ذہن کا عجز ہے، ایک قادر الکلام شاعر کی طبیعت ان مشکلات کو آسانی سے سر کر لیتی ہے۔ اسے یا اظہار کے نئے اسالیب ہاتھ آجاتے ہیں یا وہ پرانے اسالیب کو کھینچ تان کر اپنے مطالب پر موزوں کر لیتی ہے۔ لیکن ایسے شعرا کی تعداد بہت محدود ہے، ہم میں سے بیشتر کی شاعری کسی داخلی یا خارجی محرک کی دست نگر رہتی ہے اور اگر ان محرکات کی شدت میں کمی واقع ہو جائے یا ان کے اظہار کے لئے کوئی سہل راستہ پیشِ نظر نہ ہو تو یا تجربات کو مسخ کرنا پڑتا ہے، یا طریقِ اظہار کو ذوق اور مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ ایسی صورتِ حالات پیدا ہونے سے پہلے شاعر کو جو کچھ کہنا ہو کہہ چکے۔ اہلِ محفل کا شکریہ ادا کرے اور اجازت چاہے۔

اس مجموعہ میں نظموں کی ترتیب کم و بیش وہی ہے جس میں وہ لکھی گئی ہیں۔ پہلے حصہ میں طالب علمی کے زمانے کی نظمیں ہیں، انہیں حذف نہ کرنے کی تجارتی وجہ شروع میں عرض کر چکا ہوں۔ نفسیاتی وجہ یہ ہے کہ ان نظموں میں جس کیفیت کی ترجمانی کی گئی ہے وہ اپنی سطحیت کے باوجود عالم گیر ہے۔ ایک خاص عمر میں ہر کوئی یہی محسوس کرتا ہے اور اسی انداز سے یہ سوچتا ہے، لیکن عام طور سے ان تجربات کا خلوص تمام عمر قائم نہیں رہتا کچھ عرصہ کے بعد انسان اپنی ذات کو مرکزِ دو عالم سمجھنا چھوڑ دیتا ہے۔ اور اسے عالم گیر ظلم اور بے انصافی کے پیشِ نظر اپنی ذرا ذرا سی ناکامیاں بے حقیقت دکھائی دینے لگتی ہیں۔ اب اسے تجربات کی نئی تراکیب اور اظہار کے نئے قرینے تلاش کرنے پڑتے ہیں۔ اور یہی وقت ہے جس کی طرف میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں۔

بہر حال ارتکابِ گناہ کے بعد معذرت بیکار سی چیز ہے اور ہر مصنف کا حق ہے کہ اگر وہ چاہے تو اسے مطلق نظر انداز کر دے — ان نظموں میں میں نے روایتی اسالیب سے غیر ضروری انحراف مناسب نہیں سمجھا۔ بحور میں کہیں کہیں بہت ہلکا سا تصرف ہے اور قوافی میں دو ایک جگہ صوتی مناسبت کو لفظی صحت پر ترجیح دی گئی ہے۔

فیض احمد فیض

اقبال کی شاعری

اقبال اور فیض کی شخصیت اور فن میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ دونوں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ دونوں مغربی زبانوں کے ادب پر دسترس رکھتے تھے۔ دونوں اپنا مخصوص انقلابی ذہن رکھتے تھے مگر دونوں نے روایت اور کلاسیکی ادب کی قدروں اور خصوصیات سے پوری طرح استفادہ کیا لیکن اپنا مخصوص لب ولہجہ، آہنگ اور جہانِ معانی پیدا کیا فیض اقبال کے مداح تھے لیکن مقلد نہیں تھے۔ ادارۂ یادگار غالب کراچی میں فیض احمد فیض کی یہ تقریر اقبال کے بارے میں ان کے ذہن اور شعور کی نمائندگی کرتی ہے۔

علامہ اقبالؔ کی فکر و خیال کا اظہار مختلف ادوار اور مختلف صورتوں میں ہوتا رہا ہے، کہا جاتا ہے کہ پہلے قومیت اور وطنیت کا دور تھا اور پھر پان اسلام ازم کا دور آیا وغیرہ وغیرہ ... میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ان کی فکر و خیال نے جو مختلف منزلیں طے کی ہیں اگر آپ ان پر غور کریں تو محسوس ہوگا ہر دور میں اُن کا شعری لب و لہجہ، ان کی لغت، ان کی شعری علامتیں، استعارے، پیرایۂ اظہار حتیٰ کہ اصناف سخن بھی بدل جاتے ہیں۔ میرے خیال میں ایک دل چسپ مطالعہ ہوگا اور تحقیقی کام کرنے کی ضرورت ہے کہ علامہ کی فکر نے جو ارتقائی منزلیں طے کی ہیں ان میں اور علامہ اقبالؔ کے اظہارِ فکر میں کیا رشتہ ہے اور قرب ہے۔ اور یہ کہ ان میں کیا تبدیلیاں آئیں۔ یہی باتیں میں مختصراً اور اشارات کی صورت میں عرض کروں گا۔ مختلف ادوار کا ذکر کرنے سے پہلے آپ کی توجہ ان دو عناصر کی جانب مبذول کراؤں گا جو ان کی شاعری کے ہر دور میں ملتے ہیں۔ ایک تو وہ ہے جسے قرآن کی زبان میں تفکر و تدبر کہتے ہیں۔ ابتدائی عشقیہ نظموں کو چھوڑ کر ان کے ہر دور کے کلام میں تدبر اور تفکر ملے گا دوسرا عنصر تجسس اور تلاش کا ہے۔ مناظر فطرت کے مطالعہ کے پہلے دن سے ان پر تحیر و تجسس اور تلاش طاری رہا ہے۔ تلاش کبھی اپنی ذات کے اندر کرتے ہیں، کبھی مناظر میں، کبھی معاشرے میں اور ہر دور میں کرتے رہیں، چاہے وہ غنائیہ دور ہو، خطیبانہ ہو، فلسفیانہ ہو یا کچھ اور ہو۔

بہ اعتبار مضامین اگر آپ اقبالؔ کے غنائی دور پر غور کریں تو اس میں تین اجزاء یا عناصر ملیں گے ایک تو عنفوانِ شباب کے عاشقانہ جذبات ہیں۔ جیسے ان کی نظم "۔۔" کی گود میں "۔۔" کو دیکھ کر" دریائے نیکر کے کنارے" مولوی صاحب کی سناتا ہوں کہانی" وغیرہ۔

دوسرا جزو یا عنصر مناظر الفطرت کا ہے۔ اس نقطۂ نگاہ سے دیکھیں تو تین نظمیں چاند پر ملیں گی چھ نظمیں سورج پر، پانچ پھولوں پر اور تین بادلوں پر ہیں چنانچہ بادل، پہاڑ، دریا، چاند سورج ایسے موضوعات ہیں جن پر علامہ کی نظمیں اس دور میں خاص ملتی ہیں اور کافی تعداد میں۔

تیسرا عنصر حبِ وطن اور قومیت کا احساس ہے جیسے قومی ترانہ، نیا شوالہ وغیرہ ہیں۔ یہ تین اجزاء بہ اعتبارِ موضوع پہلے دور کی شاعری میں ملیں گے۔ جہاں تک جذباتی فضا کا تعلق ہے آپ لفظ "محبت" بار بار ملے گا۔ بعد میں لفظ محبت غائب ہو جاتا ہے۔ اور آہستہ آہستہ "عشق" اس کی جگہ لے لیتا ہے۔ مگر مجموعی طور پر یہ دور جذباتیت کا دور ہے۔ عاشقانہ دور نہیں ہے۔ اس دور کی زبان اور لغت کے تعلق سے آپ کو دو چیزیں ملیں گی۔ ایک تو ان پر داغؔ کا اثر ہے۔ ان کی اس دور کی غزل دیکھئے یہ اثر صاف نظر آئے گا۔

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کب تھی
مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی

داغؔ کی زبان علامہ کی اپنی زبان نہیں ہے دوسری چیز وہ تاثر ہے جو انہوں نے غالبؔ سے لیا ہے۔ داغؔ کی زبان سے بالکل مختلف بلکہ متضاد ؎

بس ہجوم نا امیدی خاک میں مل جائے گی
یہ جو اک لذت ہماری سعیٔ بے حاصل میں ہے

ہے دلِ شوریدۂ غالبؔ طلسمِ پیچ و تاب
رحم کر اپنی تمنا پر کہ کس مشکل میں ہے

جس طرح داغؔ کی زبان علامہ کی اپنی نہیں تھی
غالبؔ کی زبان بھی ان کی نہیں تھی۔

انگلستان کے قیام کی نظموں میں اُداسی اور
تنہائی کا ذکر بار بار ملے گا۔ جب کبھی جذبہ جواب دے
جاتا ہے یا شدت سے طاری نہیں ہوتا تو اس کا ایک
ثبوت ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ ہائے وائے، آہ، واہ قسم
کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں ایسی مثالیں مضامین
یا رزمیہ خیال پہنچانا ہو تو داخلی طور سے اور اس کی ہیئت
ترکیبی کی بنا پر مسدس ہی مناسب صنف ہے۔ مسدس
میں چار مصرعوں کے بعد جو آخری دو مصرعے آتے ہیں
ان کا وہی مقام ہے۔ جو موسیقی کی اصطلاح استعمال
کر دوں تو سُر اور لَے کے لحاظ سے راگ کا سم ہے۔ اسی طرح
آخری دو مصرعے چاہے وہ کسی قسم کے ہوں تیر کی طرح
بالکل ٹھکانے پر بیٹھتے ہیں سم پر سامعین کے سر ہل جاتے
ہیں اور متذکرہ دو مصرعوں پر زبان سے داد۔

اس دَور میں علامہ نے سب سے زیادہ توجہ
مسدس پر دی ہے۔ شکوہ، جواب شکوہ، شمع و شاعر
خضرِ راہ اور دوسرے مسدس ہیں۔ ان ہی کی وجہ سے
انہیں بہت بڑا مرتبہ ملا۔ اور اس میں تا حیات اضافہ
ہوتا رہا۔ جذباتی اعتبار سے دیکھیں تو دوسرے دَور
میں پہلے سے حزن، اداسی اور افسردگی کی بجائے
جوش و خروش، ولولہ، رزمیہ لہجہ ملتا ہے۔ پہلے دَور کی
نرم رو اور مدھم نغمگی کی بجائے علامہ اونچے سُروں کی
طرف مائل نظر آتے ہیں

اب تیسرا دَور آتا ہے جو کہ ان کے پختہ کلام کا
یعنی بالِ جبریل اور ضربِ کلیم کا دَور ہے۔ اس میں پہلے
دو ادوار کے مقابلے میں۔

زبان بدل جاتی ہے۔
لہجہ تبدیل ہو جاتا ہے۔
فکر کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے۔
موضوعات کا دائرہ سمٹتا جاتا ہے۔

ہماری شاعری میں جو رسمی اور ظاہری آرائشیں
استعمال کی جاتی ہیں ان کو علامہ نے قریب قریب ترک
کر دیا، تشبیہات اور استعارات کا استعمال کم کر دیا۔
زبان میں شان و شکوہ پیدا کرنے، مبہم یا معلق باتیں
کرنے کی بجائے سیدھی زبان استعمال کرتے ہیں —
تفصیل کی بجائے اختصار سے کام لیتے ہیں۔ شاعر کو تو
بہر صورت اپنا سُر اونچا رکھنا اور سننے والے پر صحیح تاثر
پیدا کرنا ہے۔ اگر وہ پُر شکوہ زبان آرائش و زیبائش
خطیبانہ الفاظ اور تشبیہوں اور استعاروں کے سہارے
چھوڑ دے تو ان کا کوئی نہ کوئی بدل ہونا چاہئے۔ اس دَور
میں علامہ نے جو بدل پیدا کیا وہ کافی دلچسپ موضوع
ہے۔ شعر میں سُر اونچا رکھنے۔ اس میں رنگ پیدا کرنے
اور سامع پر صحیح تاثر پیدا کرنے کے لئے علامہ نے
بہت سے نسخے استعمال کئے اُن میں صرف دو تین کی
طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔

ایک تو اردو شاعری میں اسمائے معارفہ کا استعمال
بہت کم ہوا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ علامہ اقبال نے
سب سے پہلے اس پر توجہ دلائی ہے انہوں نے جتنے
اسمائے معارفہ استعمال کئے جیسے دلی، سمرقند، دجلہ،
فرات، عراق، اصفہان ان سے ایک اپنی فضا وابستہ
ہے۔ ہمارے ذہن میں زمان و مکان کی وجہ سے ایک

خاص قسم کا رومانی نقشہ پیدا ہوتا ہے۔

اس دَور کی لغت پہلے سے بالکل مختلف ہے۔ اب ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں جو پوری طرح متروک تو نہیں کئے جا سکتے۔ مگر ان کا استعمال میں آنا بند ہو گیا تھا۔ جیسے برگِ نخیل رحیلِ کارواں، رنگ برنگ، طیلساں یہ الفاظ نہ مشکل ہیں اور نہ اجنبی لیکن غیر مستعمل تھے۔ علامہ نے انہیں دوبارہ رائج کیا۔ کوئی پرانا لفظ دوبارہ استعمال میں آنے لگے تو نیا لفظ ہو جاتا ہے۔ اور اس میں ایک طرح کی اپنی تازگی اور اچھوتا پن پیدا ہو جاتا ہے۔

تیسری چیز غزل میں ان کا آہنگ اور ترنم کا انداز ہے۔ بالِ جبریل کے زمانے میں ان کا زیادہ زور غزل ہی پر ہے اور سب سے اچھی غزلیں اسی عہد کی ہیں۔ ان میں انہوں نے ردیف ترک کر دی۔ بہت سی اچھی غزلوں میں ردیف نہیں ہے۔ غزل میں آدھی بات مضمون کی ہوتی ہے باقی آدھی بات قافئے اور بحر کی ہوتی ہے۔ چنانچہ اردو سے فارسی میں اقبالؔ کے پاس بھی ملتی ہیں اس دَور میں کچھ غزلیات ہیں، کچھ مختصر قطعہ بند نظمیں ہیں۔ ایک دو مخمس ہیں۔ یہ سب بکھری ہوئی اصناف ہیں۔ کوئی ایک صنف ایسی نہیں ہے جس کے متعلق آپ کہہ سکیں کہ علامہ نے اس پر سب سے زیادہ توجہ مرکوز کی ہے پہلے دَور کی بنیادی خصوصیت انتشار اور پراگندگی ہے چھوٹے چھوٹے داخلی جذبات، مناظرِ فطرت پر کچھ تحیر جن کا آپس میں کوئی ربط نہیں۔ سوائے اس کے کہ تجسس کا اظہار ہو اسلوب اور پیرائے کے لحاظ سے مختلف رنگ، مختلف زبان اور اصناف میں تنوع۔

دوسرا دَور خود علامہ کے مطابق ۱۹۰۵ء سے شروع ہو کر پہلی جنگِ عظیم کے ختم بلکہ ۱۹۳۰ء تک چلتا ہے۔ یہ میں عرض کر دوں کہ یہ باتیں ان کے اردو کلام کی بابت ہیں۔ فارسی کلام کا قصہ بالکل مختلف ہے ان پر جو مختلف کیفیات طاری ہوئیں جو الگ الگ ادوار بتلائے گئے اور جو اسالیب انہوں نے اختیار کئے ان کا فارسی زبان سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ فارسی تو انہوں نے اسرار و رموز ہی سے شروع کی۔ کوئی پچیس تیس برس تک اردو میں مشق کرنے کے بعد انہوں نے اپنی شاعری کے لئے جو مقام پیدا کیا وہاں سے فارسی شاعری کا آغاز کرتے ہیں۔

جس طرح پہلے دَور کو ایک طرح سے غنائیہ دور کہا جا سکتا ہے دوسرے دَور کو خطیبانہ دَور کہہ لیجئے یا واعظانہ دَور، اس میں پہلے دَور کے مقابلے میں کئی باتیں مختلف ہو جاتی ہیں۔

موضوعات کو لیجئے۔ اب ذات اور قوم کی بجائے خیال کے دائرے میں ملت اور اقوامِ مشرق داخل ہو جاتی ہیں۔ مناظر فطرت کی جگہ معاشرتی مسائل اور سیاسی معاملات لے لیتے ہیں۔ اسی دور میں آقا و مزدور خواجہ اور غلام، حاکم اور اقوام، آزادی اور غلامی کا ذکر کرتے ہیں۔ مناظرِ فطرت پر توجہ کرنے اور ان کی تہہ تک پہنچنے کی بجائے ان کی نظر سیاسی معاشرتی اور لسانی معاملات پر جم جاتی ہے۔ ان کی فکر اب ذات اور وطن کی بجائے ملتِ اسلامیہ اور مختلف محکوم ملل پر مرکوز ہو جاتی ہے۔

زبان بھی بدل جاتی ہے۔ دوسرے دَور کی سب سے نمائندہ نظم شکوہ ہے۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ شکوہ کی زبان نہ تو داغؔ کی زبان ہے، نہ غالبؔ کی۔
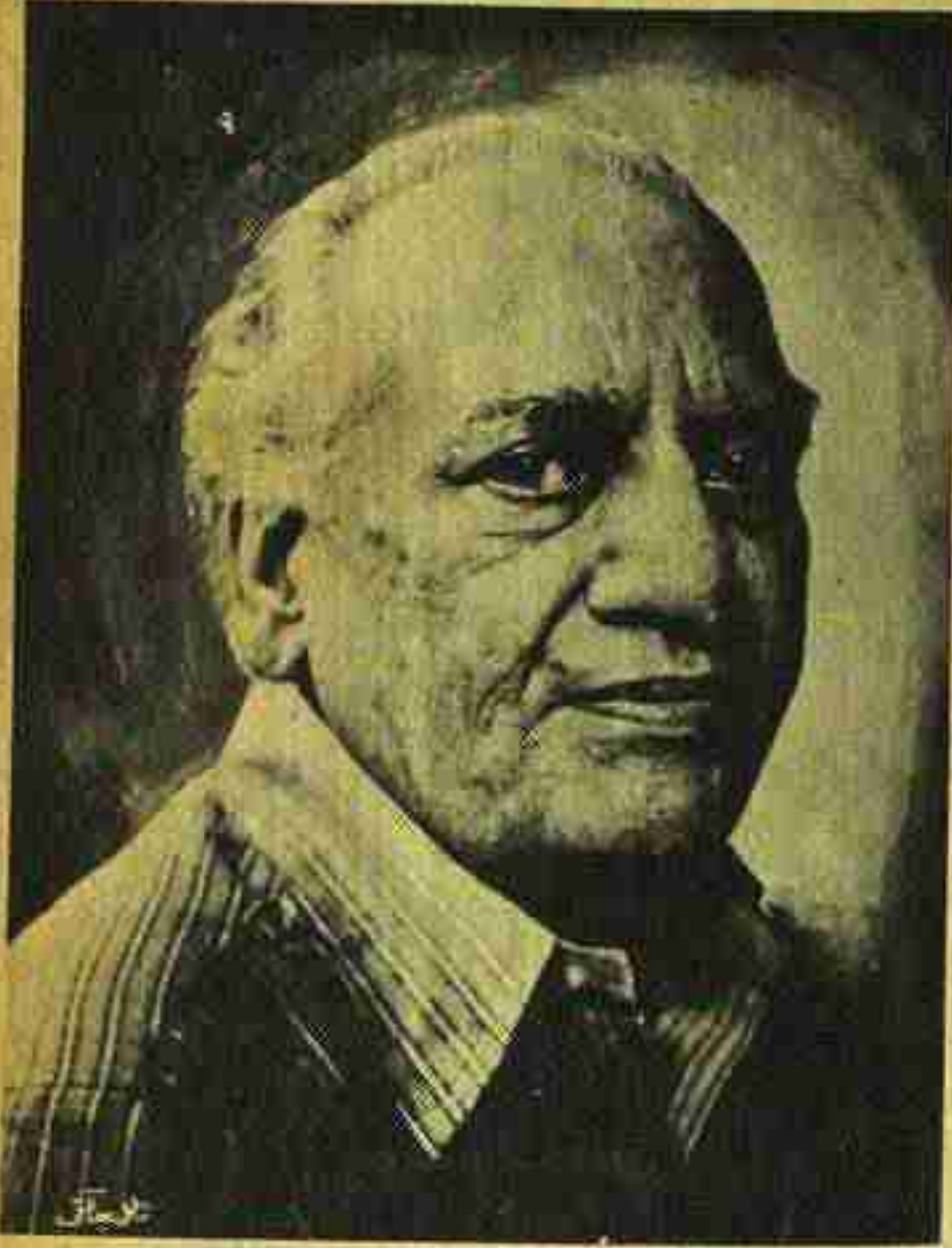
بلکہ خود اپنی زبان جوان کے ہاتھ آگئی، اقبال کی اپنی زبان میں ایک حد تک غالب کا شکوہ اور داغ کی زبان کی روانی اور سلاست ضرور ہے مگر نہ غالب کی سی معلق زبان ہے اور نہ داغ کی بالکل روزمرہ کی زبان۔ انہوں نے دونوں کے ملاپ سے اپنی زبان بنائی جس میں شکوہ غالب کا یا فارسی زبان کا ہے کیوں کہ اس وقت تک انہوں نے فارسی زبان پر غور و فکر شروع کر دیا تھا اور سوز اور دوسروں تک پہنچانے کی سہولت یہ دونوں داغ کے ہیں۔

اصنافِ سخن میں انہوں نے غزل کو ثانوی حیثیت دے دی۔ مختصر نظمیں اس دور میں بھی کہی ہیں۔ مگر انہیں کوئی اولیت اور ترجیح نہیں دی ہے۔ اس دور میں ان کا زور مسدس پر ہے۔ صرف مسدس ہی ایسی صنف ہے جو خطیبانہ اور واعظانہ کام کے لئے سب سے موثر اور مناسب پیرایۂ اظہار ہے۔ ہماری زبان پر میر انیس کا بہت بڑا احسان ہے۔ مرثیہ لکھنے والے اور بھی گزرے ہیں۔ مگر خاص نوعیت کے مضامین کے اظہار کے لئے میر انیس ہی کو داد دینا چاہئے کیوں کہ ان ہی کے بعد مسدس کا رواج ہوا اور وہی اس قافلے کے سالار ہیں۔ انیس سے پہلے بھی مسدس ملتی ہے مگر ان معنی میں نہیں جن میں کہ بعد میں مسدس استعمال ہوئی۔ ہمارے ہاں جب شاعر کو کوئی مسلسل مضمون بیان کرنا ہوتا تھا تو یا تو مثنوی کے ذریعہ بیان کرتے تھے یا ترجیع بند یا ترکیب بند کے سہارے اردو شاعری میں مسدس کو بہت کم استعمال کیا گیا ہے۔ انیس کے کلام سے ظاہر ہو گیا کہ دوسروں تک واعظانہ، ناصحانہ اور خطیبانہ یا اردو سے انگریزی میں ترجمہ کرتے وقت اگر بحر یا زمین بدل دیں تو کیفیت کچھ اور ہو جاتی ہے۔ اصل زور قافیہ پر ہوتا ہے۔ اگر ردیف ساتھ لگا دی جائے تو قافیہ کا امپیکٹ تھوڑا سا کم ہو جاتا ہے۔

بہت سی بحور جو اردو میں رائج نہیں تھیں یا کم از کم مانوس نہیں تھیں۔ علامہ نے استعمال کیں۔ جس طرح کم مستعمل اور اچھوتے الفاظ استعمال کر کے علامہ نے ایک خاص فرحت اور شاعری کے ایک اچنبھے کی سی صورت پیدا کی بالکل اسی طرح نسبتاً کم مانوس بحور استعمال کر کے انہوں نے فرحت میں اضافہ کیا۔ مسجدِ قرطبہ کی بحر اردو میں بہت کم استعمال ہوئی ہے۔ اور بھی چند نظمیں ایسی ہیں جن میں ایسی غیر مستعمل بحریں استعمال کی ہیں۔

■■

جوش ملیح آبادی ◄

فیض احمد فیض

جوش و فراق کی یاد میں

گزشتہ برس جو قافلۂ دنیائے ادب سے ملکِ عدم کو سلسلہ وار روانہ ہوا اس میں کیا کیا صورتیں تھیں جو لب نظر سے نہاں ہوگئیں۔ جوش، فراق، احسان دانش، خدیجہ مستور، غلام عباس، حفیظ جالندھری۔ ان سبھی اہلِ کمال سے برسوں صحبت رہی اور انہیں خلوت اور جلوت میں بارہا دیکھنے کا لطف حاصل ہوا اور ماسوا حفیظ صاحب کے

جو آخری عمر میں نہ جانے کس وجہ سے مردم بےزاری اور دوست آزاری پر تُل گئے تھے، یہ سلسلہ کبھی منقطع نہ ہونے پایا۔ جوشؔ صاحب سے پہلی ملاقات ۱۹۳۶ء میں ہوئی جب لکھنؤ میں ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس کے دوران اس انجمن کی داغ بیل ڈالی جا رہی تھی۔ جب تک لکھنؤ والوں کے کان میں ہماری شاعری کی بھنک نہیں پڑی تھی اور انجمن کے ان دو چار اراکین کے علاوہ جو

امرتسر سے ہمیں جانتے تھے کسی کو ہمارے بارے میں کچھ بھی علم نہیں تھا۔ چنانچہ جب کانفرنس کے اختتام پر محفل مشاعرہ برپا ہوئی تو ہمیں غالباً آخری بار سامعین کی صف میں بیٹھ کر مشاعرہ سننے کا اتفاق ہوا۔ اس کے بعد چائے کی ایک دعوت پہ جوشؔ صاحب سے رسمی سا تعارف ہوا لیکن بات کچھ آگے نہیں بڑھی۔ دو چار برس بعد دہلی میں ایک سرکاری قسم کا مشاعرہ تھا جس کا اہتمام ہر سال وزارتِ خزانہ کی جانب سے ہمارے سابق گورنر جنرل غلام محمد مرحوم کیا کرتے تھے۔ یہیں وہ واقعہ پیش آیا تھا جب ہمارے ایک بزرگ دوست اے ڈی اظہر مرحوم نے بھولے سے کہہ دیا کہ جوشؔ صاحب مشاعرے میں خواتین بھی ہوں گی اس لئے ذرا احتیاط کیجئے گا جوشؔ صاحب فوراً بگڑ گئے اور مشاعرے میں جانے سے انکار کر دیا۔ بعد میں بہت منت سماجت کے بعد راضی ہوئے۔ ہم ایک ہی ہوٹل میں مقیم تھے۔ جوشؔ صاحب مجھے دیکھتے ہی برس پڑے۔ یہ لکھنؤ میں آپ نے کیا حرکت فرمائی تھی۔ میاں تم کوئی ناکتخدا لڑکی ہو کر تمہیں مردانے میں آنے سے ڈر لگتا ہے یا شعر کہنا کوئی ایسا معیوب فعل ہے کہ آپ اس سے شرمندہ ہیں۔ آخر وہاں ہمیں کیوں محروم رکھا۔ ان کی ادا ہی یہ تھی کہ کم عمر لکھنے والوں پہ شفقت بھی فرماتے ہیں۔ ڈانٹ بھی دیتے تھے شعر کی داد دینے میں جتنے فراخدل تھے۔ زبان پہ گرفت کرنے میں اتنے ہی سخت گیر۔ جب وہ اسلام آباد وارد ہوئے تو ہم کہیں پوچھ بیٹھے جوشؔ صاحب آپ کی رہائش کہاں ہے؟ فوراً تنک کر کہا ہائیں کیا فرمایا' یہ رہائش کون زبان کا لفظ ہے۔ اب آپ کہیں گے کہ آپ کی لتائش کہاں ہے؟"

مشاعروں میں کچھ یوں تھا کہ اگر کسی سخن ناشناس مجمع سے پالا پڑا جیسے اکثر اوقات ہوتا رہتا تھا اور جوشؔ صاحب نے اپنی مرصع اور پُرشکوہ زبان میں کوئی سنجیدہ نظم شروع کی اور اُدھر سے صدائے برنخاست تو کسی عقیدت مند نے لقمہ دیا جوشؔ صاحب کوئی موٹا مال لائیے اور جوشؔ صاحب منغض ہونے کے بجائے فوراً اپنی مزاحیہ رباعیوں پر اتر آئے اور ہمارا نام پکارا گیا تو بولے لے بیٹا اب تو چڑھ جا سولی پہ۔

جوشؔ صاحب اپنے بارے میں فرماتے ہیں کہ بقول شاعر میرا مزاج لڑکپن سے عاشقانہ تھا، اگر اس پر وہ یہ اضافہ

فراق گورکھپوری

کرتے کہ میرا مزاج لڑکپن سے جارحانہ تھا تو تصویر مکمل ہو جاتی اس لئے کہ ان کا کلام اور ان کا مزاج انہی دو صفات سے مرکب ہے۔ اس لئے کہ ان کی عاشقی بھی عاجزانہ نہیں جارحانہ ہے اور ان کی "انقلابیت" بھی انقلابانہ کم اور رومانوی یا عاشقانہ زیادہ ہے۔ عشق کے مقاماتِ آہ و فغاں کا مضمون تو خیر آپ نے سِرے سے اپنایا ہی نہیں لیکن عقل و خرد کے بارے میں بھی جوش کا مرغوب موضوع ہے فلسفہ اور سائنس کی باریکیوں میں جانے کے بجائے چند حکیمانہ کلیئے بیان کرنے پر اکتفا کی اور انقلاب کی تلقین میں بھی جوان کا مرغوب موضوع ہے سیاسی اور معاشرتی اسباب و عوامل پر نظر ڈالنے کے بجائے دعوتِ جدال و قتال پر فصاحت و بلاغت کے جوہر دکھلائے اور ہونا بھی یوں ہی چاہیئے تھا اس لئے کہ علامہ اقبال کی زبان میں "نغارہ ترکانہ" کی روایت یہی تھی۔

فراق صاحب سے ۴۰ء میں پہلی بار ملاقات تو نہیں کہہ سکتے صرف سامنا ہوا۔ منٹو پارک میں جو اب اقبال پارک کہلاتا ہے غالباً یوم اقبال کی تقریب پر ایک بہت بڑے پنڈال میں کل ہندوستانی مشاعرہ منعقد ہوا جس میں جمنا پار کے چند اساتذہ کی پہلے پہل زیارت ہوئی جن

میں فراق صاحب کے علاوہ یاس یگانہ، سیماب اکبرآبادی اور مولانا سہا وغیرہ شامل تھے۔ میں نے اپنی نظم (رقیب سے) پڑھ کر سنائی جو ایک آدھ دن پہلے ختم کی تھی۔ مشاعرے کے خاتمے پر واپس جاتے ہوئے فراق صاحب نے اپنی گول گول آنکھیں گھماتے ہوئے کہا واہ میاں کیا نظم کہی ہے۔ کچھ دن بعد غالباً ادبی دنیا میں ان کا بہت مبالغہ آمیز تبصرہ شائع ہوا جس میں لکھا تھا کہ کیٹس اور شیلے بھی اس سے بہتر کیا کہہ سکتے تھے، ہمیں جب تک اس سے بڑا سرٹیفکیٹ کہیں سے نہیں ملا تھا۔ اگلے پانچ سات برس میں دہلی، لکھنؤ اور الٰہ آباد کے مشاعروں میں ملنا ہوتا رہا اور وہ اسی طور شفقت فرماتے رہے۔ اس مرحمت کا آخری دلپذیر اظہار ان کی آخری ملاقات سے وابستہ ہے جس کے نقوش ابھی تک یاد ہیں۔ کوئی دو برس پہلے ہندوستان میں بعض دوستوں نے ہماری سترہویں سالگرہ کا مختلف شہروں میں اہتمام کیا تھا۔ الٰہ آباد میں مقامی یونیورسٹی کی جانب سے تقریب کی دعوت تھی، ہم چند دوستوں کے ہمراہ جلسے کے مقررہ وقت سے ایک آدھ گھنٹہ پہلے فراق صاحب کی قیام گاہ پر سلام کرنے پہنچے۔ جب وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو چکے تھے لیکن ذہن ویسے ہی شگفتہ اور تر و تازہ تھا اور زبان ویسے ہی قینچی کی طرح چلتی تھی۔ بہت مزے کی باتیں ہوئیں۔ ہم نے رخصت چاہی تو کہنے لگے میں بھی چلوں گا۔ ایمبولینس گاڑی اور پہیوں والی کرسی کا انتظام کرو۔ چنانچہ اسی سواری پر وہ پہنچے۔ اپنی کھنک دار آواز میں تقریر بھی فرمائی۔ شعر بھی سنائے اور جب مقطع پر پہنچے ؎ پہلے فراق کو دیکھا ہوتا اب تو بہت کم بولے ہے۔ تو کہیں سے آواز آئی، یہ ہوائی کسی دشمن نے اڑائی ہو گی۔ فراق صاحب نے اسی پر بس نہیں کی اگلے دن مسلم ہوسٹل کی تقریب میں جلتی دوپہر کے دوران پھر اسی گاڑی میں تشریف لائے

ظاہر ہے کہ یہ روایتی وضع داری کی بات نہیں تھی ان کے اپنے مزاج اور شخصیت کا عکس تھا۔

اگرچہ جوش اور فراق ایک ہی خطے کے رہنے والے ایک ہی زبان کے رسیا اور ایک ہی معاشرے کے افراد تھے لیکن ان کے ذاتی اور تخلیقی اوصاف میں اشتراک کم تھا اور اختلاف زیادہ حق گوئی اور بے باکی، ذہانت اور لسانی دونوں کی گھٹی میں پڑی تھی۔ اُن کے سیاسی اور معاشرتی نظریات بھی بہت حد تک مشترک تھے۔ لیکن جوش صاحب کی تربیت ایک قصباتی رئیسانہ ماحول میں ہوئی تھی۔ فراق صاحب کی ایک شہری متوسط گھرانے میں۔ جوش صاحب کا ذہنی اور ادبی رشتہ ترکی اور فارسی خطیبانہ اور بلند بانگ روایت سے تھا۔ فراق صاحب کا ہندوستانی مطربانہ اور مدھر روایت سے، چنانچہ ان کے موضوعات، کیفیات، شاعرانہ لغت و تکنیک میں بھی یہی فرق ہے۔ جوش صاحب کو حدیثِ دل کی نزاکتوں اور داخلی احساسات کی لطافتوں سے بہت کم واسطہ تھا۔ اسی طرح اُن کی شاعرانہ لغت اور لہجے میں بھی لوچ اور رس کے بجائے گھن گرج اور طنطنے کو زیادہ دخل تھا۔ وہ بیش تر بڑے کینوس پر موٹے برش سے آئل پینٹ کرتے تھے اسی سبب سے تنگنائے غزل کے بجائے قصیدہ نما نظم سے رجوع کیا۔ اور اس کے برعکس فراق صاحب جذبات و احساسات کے ادراک میں باریک بینی میں اور پیرایہ و اظہار کے بارے میں کندہ کاری کے مشاق تھے، اس لحاظ سے کلی طور سے نہ سہی بہت حد تک ان کا سودا اور میر سے تقابل کر سکتے ہیں۔

احسان دانش، غلام عباس اور حفیظ صاحب سے اپنی طالب علمی کے دنوں سے صحبت رہی، خدیجہ مستور سے قیام پاکستان کے بعد رابطہ ہوا، ان کا ذکر آئندہ سہی۔

◻◻

آئی جو اُن کی یاد

فیض احمد فیض

ایک صبح لندن کی برفانی فضا اور برفانی موسم سے یکایک ایسی وحشت ہوئی کہ ہم نے رختِ سفر باندھا اور اسحاق جاگوداک آؤٹ کر گئے۔ یورپ میں رختِ سفر باندھنا محض محاورے کی رعایت ہے ورنہ یہاں بستر بوریے کی حاجت کہاں سفر خوش ہے اور شجر سایہ دار راہ میں نہ سہی مسافر نواز بہتیرے۔ شاید پرانے وقتوں میں ہمارے ہاں بھی یہی صورت ہوگی۔ ورنہ شیخ سعدی اور ابن بطوطہ جیسے آشفتہ سر لوگ ہفت اقلیم کی سیر کیوں فرماتے — سرائے، مہمان خانے، مساجد، دھرم شالے، مجذوبوں کے گھر، ابن السبیل کے لئے ہزار بسیرے تھے، ہمارے ہاں یہ مسافر نوازی خیرات تھی۔ یورپ میں تجارت ہے لیکن یہ تجارت بہت انتظام اور ٹھکانے کی ہے، ہم جیسی صورت نہیں کہ خیرات سے ہاتھ کھینچ لیا اور تجارت کا سلیقہ نہ آیا۔ دو چار بڑے شہروں میں خیر، گرہ میں مال ہو تو کچھ ایسی گھبراہٹ کی بات نہیں لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ یکایک جدھر کو جی چاہا مونہہ اٹھا کر چل دئے، شجر سایہ دار کے بھروسے پر رہے تو یا تو پولیس والے ایک سو میں چالان کر دیں گے یا کسی چور ڈاکو کے ہاتھوں جان پر بن آئے گی، اور پھر وہی شکایت ہے کہ ہمارے ہاں سیاحت ترقی کیوں نہیں کرتی۔

خیر یہ تو معترضہ جملہ تھا اس وقت میں لائیڈن یونی ورسٹی کے کیرن انسٹی ٹیوٹ کے بالمقابل ایک چھوٹے سے ریستوران میں بیٹھا ہوں۔ یہ ادارہ مشرقی زبانوں کی تحقیق و تدریس کے سلسلے میں ایک زمانے سے شہرۂ آفاق ہے، میرے مہربان شعبۂ عربی کے استاد پروفیسر بروخمین ابھی ابھی رخصت ہو کر گئے ہیں۔ باہر پرانے سہ پہلو چھتوں والے مکانوں کے نیچے اور دو پتلی پتلی سی سڑک کے درمیان شہر کی آب جو کا سبزی مائل پانی چپ چاپ بہہ رہا ہے دھوپ چھٹکی ہوئی ہے اور دریچوں میں بہت سے پھول کھل رہے ہیں۔ یہ سب اہتزاز ہونا چاہئے تھا لیکن آج گھر سے اخبار پہنچا تو راجہ غضنفر علی خاں مرحوم کی رحلت کی خبر پڑھی۔ اس سے پہلے یہاں کے کتب خانے میں ایک کارکن کی زبانی معلوم ہوا کہ چند دن پہلے اردو انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے مولف پروفیسر مولوی محمد شفیع مرحوم وفات پا گئے ہیں۔ ان دونوں بزرگوں سے میری بچپن سے نیاز مندی تھی، ایک میرے استاد تھے ایک دوست اور کرم فرما۔ ایک علم و فضل میں بے مثال، ایک سیاسی تدبر اور محفل آرائی میں لاجواب۔ اب جو انہیں یاد کرنے بیٹھا تو دو قطعی متضاد مگر یکساں ممتاز شخصیتیں آنکھوں کے سامنے ہیں، مولوی صاحب کم گو، کم آمیز، تنک مزاج اور سخت گیر۔ کتب اور مخطوطات کے علاوہ کوئی رفیق تھا نہ مصاحب تحقیق و تدریس کے

علاوہ نہ کوئی تفریح نہ مشغلہ، جملہ تکلّفات سے بے نیاز
لباس و آرائش سے بے پروا، دفتر نشینی اور خانہ نشینی کے
علاوہ کسی محفل سے سروکار نہ تھا۔ عمر بھر درویشوں کی
طرح گوشہ گیر رہے، اس کے خلاف راجہ صاحب خوش باش
ہنسوڑ، چھبیلے، پل بھر میں ہر کسی سے شیر و شکر، دہلی کے
خالصہ سے لے کر خوبانِ عجم تک ہر کسی کے منظورِ نظر، جس
محفل میں دیکھو، دولھا بنے بیٹھے ہیں۔ خوش لباس خوش گفتار
میں سمجھتا ہوں کہ ایک زمانے میں بے گانے لوگ پاکستان
کو قومی نشان سے کم پہچانتے تھے۔ راجہ صاحب کے شملہ
رو دستار سے زیادہ۔

اب سے قریب تیس برس پہلے میں اور
میرے ایک دوست ڈاکٹر حمید الدین جو اب گورنمنٹ
کالج لاہور میں فلسفے کے اُستاد ہیں۔ اورینٹیل کالج لاہور
میں ایم۔ اے عربی کا داخلہ لینے پہنچے۔ ہم دونوں دوسرے
مضامین میں گورنمنٹ کالج سے ایم اے کی سند حاصل
کر چکے تھے۔ حمید الدین فلسفہ اور نفسیات میں۔ اور میں
انگریزی میں۔ اس لئے ہمیں دو سال کے بجائے ایک
سال میں نصاب مکمل کرنے کی رعایت تھی بشرطیکہ متعلقہ
شعبے کے استاد کی منظوری حاصل ہو۔ مولوی شفیع مرحوم
ان دنوں اورینٹیل کالج کے پرنسپل بھی تھے، اور شعبہ عربی
کے صدر معلّم بھی تھے۔ چنانچہ ہم دونوں کی پیشی ہوئی۔ حمید صاحب
کے والد ڈاکٹر صدر الدین مرحوم گورنمنٹ کالج میں عربی
کے اُستاد اور مولوی صاحب کے رفیق کار تھے، اس لئے
ان سے تو کچھ تعارض نہ ہوا البتہ مجھ سے کافی دیر جرح کرتے
رہے۔ مولوی صاحب کو شکایت تھی کہ نوجوان زبان عربی
کو بحر ذخار کے بجائے گھر کی مولی سمجھنے لگے ہیں اور کافی
ریاضت اور سمجھ بوجھ کے بغیر اعلیٰ استاد کے درپے
ہونے لگتے ہیں۔ میں نے شمس العلما سید میر حسن مرحوم اور
مولوی محمد ابراہیم میر سیالکوٹی سے شرف تلمذ اور بی اے
عربی میں بی۔ اے آنرز کا حوالہ دیا تو مولوی صاحب بمشکل
راضی ہوگئے۔ اگلے دن ہم مولوی صاحب کی کلاس میں
پہنچے تو پتہ چلا کہ داخلہ کا مرحلہ تو محض ابتدائے عشق کی منزل
تھی آگے آگے کئی سخت مقام آنے والے ہیں۔ ان دنوں
گورنمنٹ کالج میں ہم ایم۔ اے کے طلباء کا مرتبہ اساتذہ
سے کچھ ہی کم ہوا کرتا تھا۔ کسی پروفیسر سے شغف ہے
تو ان کی کلاس میں باقاعدگی سے گئے۔ کسی اور صاحب کی
صورت یا آواز پسند نہیں تو نہ گئے۔ پابندی اوقات پہ
کسی کو کچھ اصرار نہ تھا۔ بہت سے اساتذہ سے دوستانہ
اور بے تکلف مراسم تھے۔ یہاں اورینٹیل کالج میں جو پہنچے
تو مولوی صاحب کی کلاس میں پرانے روایتی مکاتب کا ماحول
پایا۔ کسی کو دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ مولوی صاحب کے
دبدبے سے اچھے خاصے بقراط لوگوں کے اوسان خطا
رہتے تھے، اور وقت، قاعدے قانون کی وہ پابندی کہ اللہ
کی پناہ، ہم دونوں گورنمنٹ کالج کے نک چڑھے پہلے ہی دن
حسبِ معمول دیر سے پہنچے، مولوی صاحب نے واسکٹ
کی جیب سے طلائی گھڑی نکالی اور دیر تک کبھی ہم کو اور
کبھی گھڑی کو دیکھا اور پھر بغیر کچھ کہے گھڑی جیب میں ڈال لی
پڑھائی کا دستور یہ تھا کہ ایم اے کے طالب علم بالکل ابتدائی
مدارس کے بچوں کی طرح نصاب کی کتاب یعنی مبرّد کی الکامل،
ابن قتیبہ کی الشعر و الشعرا اور موطاء امام مالک سے کچھ پڑھتے
اور مولوی صاحب ہر اقتباس کے بعد انگریزی میں متن
کی تشریح اور تفسیر کرتے جاتے، پڑھنے میں کسی کو اعراب
پر ڈانٹ پڑتی، کسی کے تلفظ پر کان اینٹھے جاتے (یہ سچ
نہیں محاورے ہیں) لیکن اس ناگوار تمہید کے بعد حسن بیان

شبستاں کے دفتر میں شبستاں کے نگراں جناب یوسف دہلوی اور فیض احمد فیض

اور خوبیٔ تقریر سے کافی سے زیادہ تلافی ہو جاتی ، مولوی صاحب کے اوقات اور طریقِ تدریس کی طرح ان کا لباس بھی ہمیشہ سے اٹل تھا۔ سُرخ اونچی دیوار کی رومی ٹوپی ، سیاہ جوتے تنگ موری کی پتلون ، سرما میں وہی نیلا کوٹ اور گرما میں اسی وضع قطع کا سفید یا بادامی ، چنانچہ بعض زبان دراز شاگرد انہیں اسٹیشن ماسٹر کہا کرتے تھے۔ اور ریمی تقریبات میں کبھی اچکن اور شلوار بھی پہن لیا کرتے، لیکن ان تقریبات میں وہ آتے ہی کب تھے ، طلباء کے لئے کالج کے اوقات کے بعد ملاقات پر قدغن تھی۔ کبھی کوئی مشکل لے کر پہنچ گیا تو مولوی صاحب کالج کے پچھواڑے پیسہ اخبار گلی میں اپنے مکان کی بالائی منزل سے کھڑکی میں کھڑے کھڑے گفتگو فرماتے۔ درونِ دربار باریابی کا شرف شاید ہی کسی کو حاصل ہوا ہو، بعد میں وہ البتہ ہم سب پر انتہائی شفقت فرماتے رہے ، یہ دوسری بات ہے کہ سر سفید ہو جانے کے بعد بھی ان کی طلبی پر خفیف سی گھبراہٹ ضرور ہوتی تھی۔

مجھے طالب علمی کے دنوں سے اب تک دیس بدیس بیسیوں اہلِ فضل سے شرفِ نیاز رہا ہے لیکن السنہ شرق و غرب میں جیسی وسیع بصیرت اور جیسا یکساں عبور مولوی شفیع مرحوم کو حاصل تھا اس کی نظیر ڈھونڈے سے ملے گی۔ ضعیفی کی عمر میں انہوں نے اردو میں انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کی تالیف کا بارِ گراں اپنے سر لیا تھا۔ اس نوع کی مہم کے لئے جو ذرائع اور جتنی مہلت لازم ہیں وہ مولوی صاحب کی زندگی میں فراہم نہ ہو سکیں ہماری بد قسمتی ہے کہ وہ یہ کام ادھورا چھوڑ کر رخصت ہو گئے اس لئے کہ اس کی تکمیل کا بدل مشکل سے ملے گا۔ ہمارے ہاں گذشتہ کئی برس سے علم و ادب کے لئے سرکاری

اعزاز بٹنے لگے ہیں نہ جانے مولوی صاحب کا نام سرِ دربار پہنچا کہ نہ پہنچا۔ اگر نہیں پہنچا تو حیف ہے ہر چند ان جیسے اہلِ کمال رسمی اعزازات کے محتاج اور متمنی نہیں ہوتے لیکن کسی جگہ رسم ٹھیر جائے تو پھر ایسے بزرگوں کے اعزاز واکرام میں کوتاہی کسی طور بجا نہیں۔

○

راجہ غضنفر علی خاں مرحوم سے آولین ملاقات بھی طالب علمی ہی کے دوران ہوئی۔ راجہ صاحب ہمارے محبوب استاد پروفیسر احمد شاہ بخاری (پطرس) کے ہمجولیوں میں سے تھے۔ اگرچہ ایک لحاظ سے ان دونوں کے مشرب میں کافی فرق رہا ہوگا۔ راجہ صاحب گورنمنٹ کالج کے باغی قوم پرست طلباء کے سرغنہ تھے مولوی صاحب ادب برائے ادب کے وکیل سیاست سے کوسوں بھاگتے تھے۔ لیکن اس بات سے قطع نظر، خوش طبعی، یار باشی، فقرے بازی، بذلہ سنجی، محفل آرائی حتیٰ کہ مجلسی ہلڑ بازی میں دونوں ہم شغل اور ایک مزاج تھے۔ ہماری طالب علمی کے دنوں میں بخاری صاحب کے گھر پر مہینے، پندرہ دن بعد شوقین طلبا اور معروف ادبا کی ایک ملی جلی محفل منعقد ہوا کرتی تھی۔ طلباء میں سے حفیظ ہوشیار پوری، ن م راشد، آغا عبدالحمید (سابق کمشنر کراچی) سیّد رشید احمد (سابق ڈائرکٹر جنرل ریڈیو) شیر محمد حمید، چودھری نبی احمد اس محفل کے سرگرم کارکن تھے۔ متعدد لکھنے والوں میں مالک رام، پنڈت ہری چند اختر، سیّد امتیاز علی تاج، صوفی تبسم باقاعدگی سے شرکت کرتے تھے۔ کبھی کبھی حفیظ جالندھری بھی تشریف لاتے، گھنٹوں باتیں ہوتیں، گفتگو، شعر و سخن اور بحث و تنقید کا بازار گرم رہتا۔ ایسی ہی ایک صحبت میں راجہ صاحب بھی تشریف لائے، قومی سیاست میں ان کا نام جب تک کافی معروف ہو چکا تھا اور غالباً ان دنوں وہ وائسرائے کی لیجسلیٹو اسمبلی کے رکن بھی تھے، ایک ہی شام میں راجہ صاحب حسبِ معمول سب لوگوں سے ایسے گھل مل گئے گویا برسوں کی ملاقات ہے اور اس کے بعد کسی کو ان سے دوبارہ متعارف ہونے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اس کے بعد برسوں اور بار ہا راجہ صاحب کو خلوت و جلوت، وزارت، سفارت، گوشہ نشینی ہر رنگ میں دیکھا اور ہمیشہ یک رنگ پایا۔

اپریل ۱۹۵۶ء میں جیل سے رہائی کے بعد گھر پر میرا پہلا دن تھا۔ صبح ہی صبح راجہ صاحب تشریف لائے جب وہ دہلی میں ہمارے ہائی کمشنر تھے۔ آتے ہی انھوں نے اپنا مخصوص قہقہہ بلند کیا اور کہنے لگے بھئی خوب وقت پر آئے کیا TIMING کی ہے۔ اگلے مہینے ہم یوم اقبال پر مشاعرہ کر رہے ہیں تم بھی چلو۔" میں نے کہا۔ "راجہ صاحب ابھی تو پوری طرح گلو خلاصی بھی نہیں ہوئی، ضمانت کی رسّی گلے میں پڑی ہے بھلا مجھے دہلی کون جانے دے گا! بھاگ جاؤں تو؟"

"ہٹاؤ جی، وہ ہمارا ذمّہ ہے" راجہ صاحب نے فرمایا۔ "میں نے تو ہاں کر دی لیکن مجھے یقین تھا کہ راجہ صاحب اپنی مسلّمہ قدرتِ کاروبار کے باوجود ایسی تگڑم میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ چند دنوں بعد واقعی دہلی جانے کا پروانہ مل گیا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ اگلے مہینے دہلی میں راجہ صاحب کا دربار دیکھا۔ ان کے دروازے پر ہاتھی تو نہ جھومتے تھے لیکن اہلِ دہلی اور خاص طور سے خالصاؤں کے ٹھٹ ضرور لگے رہتے۔ کوئی نہ کہہ سکتا تھا کہ یہ ایک بدیسی سفیر کا مکان ہے، یہی محسوس ہوتا تھا کہ یہاں کسی حاکمِ اعلیٰ کا ایوان ہے۔ بہت دھوم کا مشاعرہ ہوا صدرِ ہند ڈاکٹر رادھا کرشنن صدر تھے۔ راجہ صاحب کا

مکان سلیقہ اور سجاوٹ میں پہلے ہی کم نہ تھا اس شام اور بھی چمک دمک گیا۔ وسیع لان اور برآمدے خلقت سے کھچا کھچ بھر گئے تو باہر کی دیواروں پر لاؤڈ اسپیکر نصب کئے گئے اور ہزاروں کے مجمع نے رات بھر مشاعرہ سنا۔ اگلی دوپہر راجہ صاحب میرے کمرے میں آئے اور کہنے لگے۔ "میں نے رات پروٹوکول (PROTOCOL) کے خیال سے پنڈت نہرو کو مدعو نہیں کیا تھا۔ ابھی انہوں نے ٹیلی فون پر شکایت کی ہے اور آج شام کو صرف پاکستانی شعراء کو سننے یہاں آرہے ہیں تم ذرا محمد جعفری اور زہرہ نگاہ کو اِطلاع کر دو۔"

راجہ صاحب کے سفارتی کمالات تو خیر ایک الگ باب ہے۔ کہنا یہ مقصود تھا کہ راجہ صاحب نڈر اور دھن کے پکے آدمی تھے۔ جس بات پر ڈٹ جاتے عام طور سے منوا کر رہتے۔ ورنہ ہمارے ہاں اچھے خاصے بھلے مانسوں کو بھی آسانی سے پاسپورٹ اور دیارِ غیر کے سفر کی اجازت کہاں ملتی ہے، جیہوں، ناک رگڑو، سو پشت کی چھان پھٹک کراؤ، جب کہیں نے عنایت کی تو خیر ورنہ خیر صلّا اور اگر کسی کا نام ہماری طرح پولیس کے دس نمبر میں درج ہے تو بڑے بڑے افسروں اور لیڈروں کا محض سفارش کی درخواست پر پانی پانی ہونے لگتا ہے لیکن راجہ صاحب مرحوم کو ایسے معاملات قطعی کبھی باک نہ ہوا۔ اس کی اور مثال یہ ہے کہ راجہ صاحب نے پاکستان چین دوستی کی تنظیم اس وقت قائم کی جب اِس عظیم ہمسائے کا نام ہمارے ذی اقدار حلقوں میں بالکل مقبول نہ تھا۔ بہت سے صحافی اور سیاسی بزرگ جو آج کل چین کی تعریف میں اِس قدر رطب اللسان اور چین و پاکستان کی دوستی پر اتنے مصر نظر آتے ہیں کل تک کسی امریکی فرمان سے سر مو انحراف تخریب اور گناہ گردانتے تھے اور جیسا

بے بسی کا کوئی درماں نہیں کرنے دیتے
اب تو ویرانے کو ویراں نہیں کرنے دیتے
دل کو صد لخت کیا سینے کو صد پارہ کیا
اور ہمیں چاک گریباں نہیں کرنے دیتے
آگ جو دل میں فروزاں ہے عدو اس کا بیاں
کوئی ~~مضمون~~ مضمون کسی عنواں نہیں کرنے دیتے
جان باقی ہے تو کرنے کو بہت باقی ہے
آج جو کچھ کہ مری جاں نہیں کرنے دیتے

فیض

کہ ساری دنیا جانتی ہے امریکی حکمت عملی میں چین دشمنی ہمیشہ سے سرِ فہرست ہے۔ ان دنوں چین سے دوستی کی بات کرنا ان سب بزرگوں کی نظر میں کمیونسٹ نوازی اور امریکی دشمنی کا ایک بہانہ تھا اور یہ الزامات کسی شریف آدمی کو کشتنی اور گردن زدنی ٹھہرانے کے لئے کافی سمجھے جاتے تھے۔ راجہ صاحب نے ان ہی دنوں اس تنظیم کی صدارت سنبھالی، اور ہر سال چین کے یوم انقلاب پر دھڑلے سے تقریبات منعقد کرتے رہے۔

مختلف سفارتوں کے دوران راجہ صاحب کے کارناموں کے بارے میں کچھ کہنا تحصیلِ حاصل ہے۔ یوں گمان ہوتا ہے کہ انہیں اپنے بزرگوں سے جذبِ کرامات کا حصّہ ورثے میں ملا ہو گا کہ جہاں بھی جاتے عوام و خواص دونوں کو اپنا گرویدہ بنا لیتے اور اگر یہ غیر عقلی بات قابلِ

قبول نہیں تو ان کی کام یابی اور مقبولیت کے لئے ان کے اپنے اوصاف کیا کم تھے، خلوص، بے غرضی اور ملنساری، حسنِ اخلاق، بے باکی اور جرأتِ رندانہ، بڑے چھوٹے، امیر، فقیر، ہر کسی سے ایک سا برتاؤ کرتے، نہ کسی سے دبے، نہ کسی سے کھنچے، ملازمت کے دوران کوئی مفید کام اور اہم سمجھا تو دفتری قاعدے قانون کو طاق پر رکھا۔ گھر کی وزارتوں کی مین میخ پر لعنت بھیجی اور من مانی کرتے رہے۔ پاکستان کی خوش قسمتی تھی کہ اِسے ابتدائی ایّام میں وکالت اور سفارت کے لئے ایسا بلیغ اور مؤثر کار کن ہاتھ آیا اور بد قسمتی ہے کہ بعد کے ایّام میں نہ ان کی خدمات سے مکمّل استفادہ کیا جا سکا نہ کوئی بدل بروئے کار آیا۔

"پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ"

○

شوکت تھانوی مرحوم یکایک محفل سے اُٹھ گئے۔ اس ہمدمِ دیرینہ کی جدائی میرا احباب کے دِل پر جو گزری سو گزری لیکن ذاتی غم سے زیادہ اِس بات کا دُکھ ہے کہ محفلِ وطن میں جہاں رُلانے کو بہت کچھ ہے لیکن ہنسانے کو صرف شوکت تھانوی تھے اور اب ان کی جگہ کون سنبھالیگا۔ برسوں سے ان کا نام و تکیہ کلام کی صورت گھر گھر وردِ زبان تھا۔ یہ فقرہ، وہ لطیفہ، وہ نقل ہزار جگہ۔ ہزار بات شوکت تھانوی سے روایت تھی۔ لطفِ صحبت اس پر مستزاد، آنکھ اوجھل، پہاڑ اوجھل، یادسے دُور، بیسیوں محفلیں، بیسیوں صورتیں اور طرح طرح کے بزرگ بھی تھے جنہیں مرحوم اپنی شعبدہ بازی سے دم بھر کو زندہ کر لیا کرتے تھے۔ لکھنؤ کا کوئی مشاعرہ، پورب کے کسی رئیس کی بیٹھک، دلی میں کسی حکیم کا مطب۔ یہ ثاقب لکھنوی ہیں، یہ نوح ناروی ہیں۔ یہ احسن مارہروی ہیں۔ یہ فلاں حکیم صاحب ہیں اور فلاں نواب صاحب۔ شوکت مرحوم اپنے ممدوح کی نقل نہیں اُتارتے تھے خود ہی بن جاتے تھے اور اس پر طرفہ یہ کہ جس صحبت کا تذکرہ کرتے، اس کی فضا اس کا سماں، اس کا پورا نقشہ آنکھوں میں گھوم جاتا یوں تھا کہ ان کے دَم سے ایک عالم زندان تھا۔ اب جو وہ رُخصت ہوئے تو ان اَن گنت محفلوں کا لطف بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ لیکن یہ تو اُن کے گوناگوں کمالات کا بہت چھوٹا سا جزو تھا۔ ان کی ذہین اور بوقلموں شخصیت نے جولانیٔ طبع کے لئے جو میدان منتخب کیا اس میں یکساں جوہر دکھائے۔ نظم، نثر، تمثیل، افسانہ، شخصیت نگاری، نامہ نویسی، ریڈیو، صحافت، بذلہ سنجی، بدیہہ گوئی، اس کی طبع زبان اور قلم ہر میدان میں یکساں طراری سے رواں رہتے۔ ان کی ظرافت میں تکلّف اور آورد کو دخل تھا۔ بے تکلّف اور بے تکان جیسے بولتے ویسے لکھتے۔ نہ گفتار میں اُن کی طبع کو غیر حاضر پایا نہ تحریر میں کبھی اُنہیں قلم پر زور دیتے دیکھا اور اِس مشّاقی کا راز ریاضت نہ تھی۔ ان کی خداداد ذہانت تھی جو اکتساب کی محتاج نہیں ہوتی۔

شوکت مرحوم اپنی ہم عصر دُنیا کے اُن محسنوں میں سے تھے جنہیں زندگی کی آسائشوں میں بہت کم حصّہ ملا۔ لیکن وہ اپنے سو اسب کے لئے فرحت اور انبساط کے اسباب بہم کرتے رہے۔ اب جو وہ نہیں ہیں تو اسی محرومی پر رنج ہے کہ اُن کی باغ و بہار صحبت اب کبھی حاصل نہ ہو سکے گی اور اس سے زیادہ رنج ان کی محرومی پر ہے۔ جو اس لطف سے کبھی آشنا نہ ہو سکیں گے۔

افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

■■

فیض کے خطوط

عبدالقیوم

تاحال فیض کے خطوط کا صرف ایک مجموعہ: "صلیبیں مرے دریچے میں" شائع ہوا ہے۔ یہ خطوط بھی فیض نے صرف اپنی اہلیہ ایلس کے نام انگریزی زبان میں لکھے تھے۔ جن کا ترجمہ خود فیض نے مرزا ظفر الحسن مرحوم کو لکھوایا تھا۔ اس مجموعہ میں کُل ۱۳۵ خطوط ہیں جن کی تفصیل کچھ یوں ہے:

حیدر آباد جیل (جون ۱۹۵۱ تا جون ۱۹۵۳)

۹۲ خطوط کراچی جیل، جناح ہسپتال، کراچی (جون ۱۹۵۳ تا اگست ۱۹۵۴) ——— ۸ خطوط منٹگمری جیل (اکتوبر ۱۹۵۴ تا اپریل ۱۹۵۵) ۳۵ خطوط ——— یوں جون ۱۹۵۱ سے لے کر اپریل ۱۹۵۵ یعنی تین سال گیارہ ماہ میں فیض نے کل ۱۳۵ خطوط لکھے۔ اُن خطوط کے بارے میں فیض نے "گذارشِ احوالِ واقعی" میں لکھا ہے۔

"ظاہر ہے کہ یہ ادبی تصنیف نہیں، نجی خطوط ہیں۔ جو قلم برداشتہ ہو کر لکھے گئے ہیں۔ کسی مربوط اور سنجیدہ بحث کی تلاش فضول ہے۔"

خطوط کے ترجمے کے بارے میں لکھتے ہیں:

"جیسے قلم برداشتہ یہ خطوط لکھے گئے تھے ویسے ہی موبہو زبانی ان کا ترجمہ کیا گیا ہے۔"

آج سے تین دہائی قبل لکھے گئے فیض کے ان خطوط میں خیالات، احساسات اور جذبات کے اتنے ان گنت پہلو سموئے ہوئے ہیں کہ ان کی من موہنی شخصیت کی تہ در تہ خصوصیات نمایاں ہوتی چلی جاتی ہیں۔ وہ ان خطوط میں ذاتی اور انسانی فطرت کی بوالعجبیوں اور کوتاہیوں کا ذکر بھی اتنے نرم و سُبک لہجے میں کرتے ہیں کہ تنفر کی ہلکی سی لہر بھی دل کے خاموش سمندر میں پیدا نہیں ہوتی۔ یہ انہیں کا کمال ہے کہ ان کو پڑھنے والا جذباتیت کی رَو میں بہنے کی بجائے عقلیت کی پناہ میں ہی سکون محسوس کرتا ہے۔ علاوہ ازیں ان خطوط میں فیض نے دنیا کے بہت سے نامور ادیبوں اور شاعروں اور دانشوروں کے خیالات اور اوصاف کو اپنے مخصوص انداز اور مختصر الفاظ میں یوں بیان کیا ہے کہ خطوط میں بوجھل پن چند لمحوں کے لیے محسوس نہیں ہوتا۔ فیض اہم بات کو بھی اختصار سے کہنے کے عادی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ عظیم ہستیوں کے بارے میں چند سطور میں تبصرہ کرتے ہیں تو سوچ کی لہریں ذہن کے کنارے سے ٹکراتی محسوس ہوتی ہیں اور کریدنے کی خواہش جنم لیتی ہے۔

تفکر اور عالی ظرفی کے نمونے فیض کے اکثر خطوط میں ملتے ہیں البتہ تفنن طبع کی کمی محسوس ہوتی ہے اور اس کی وجہ ان کی فطری کم گوئی کے علاوہ یہ بھی ہے کہ یہ خطوط جیل سے لکھے گئے تھے۔ یوں بھی فیض عملی زندگی میں بہت کم کھلتا تھا۔ جیل سے لکھے گئے ان خطوط کا مجموعی تاثر رجائیت کا رنگ لیے ہوئے ہے۔ کہیں کہیں خوش طبعی کی ہلکی ہلکی لہریں بھی پڑھنے والے کے دل کو چھوتی گزر جاتی ہیں۔ ایک بات جو فیض کے ان خطوط میں نمایاں نظر آتی ہے، وہ ان کا شریفانہ اور ہمدردانہ لب و لہجہ ہے۔ ایسی سطور تو ان خطوط میں تقریباً ناپید ہیں، جن میں خفگی اور درشتگی اور تلخی کی ہلکی سی لہریں بھی موجود ہوں۔ خطوط میں فلسفیانہ اندازِ تحریر اور تفکر کے عناصر بہت نمایاں ہیں اور فیض کی مجموعی شخصیت جاننے کے لئے ان عناصر کا مطالعہ بے حد اہم ہے۔ یہ خطوط ایک حساس، باہمت، اولوالعزم اور شریف النفس شخص کے ذہن کا ایسا آئینہ ہیں، جن کے چیدہ چیدہ حصوں کو جوڑ کر مکمل نہیں تو کم از کم اس کی شخصیت کی دل رُبا تصویر ضرور کھینچی جا سکتی ہے۔ ان کی ادبی شخصیت کے بہت سے مخفی پہلو ان خطوط میں نمایاں ہیں۔ کاش! فیض کے وہ خطوط بھی کتابی صورت میں شائع ہو جائیں، جو انہوں نے گزشتہ تین دہائی یعنی ۱۹۵۵ء سے لے کر ۱۹۸۴ء تک لکھے تھے

تاکہ ان کی مکمل و اکمل شخصیت کا احاطہ کر کے ان کی عہد بہ عہد شاعری سمجھنے میں مدد مل سکے۔

ذیل میں فیض کے خطوط کے چیدہ چیدہ اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔ جن کے مطالعے سے ان کی ذہنی اور جذباتی کیفیات کا کافی حد تک اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

مجموعہ کے پہلے خط میں لکھتے ہیں:

"تین چار دن جو لاہور میں گزرے، ایام اسیری کے سب سے اذیت ناک دن تھے۔ جب مجھے پہلی دفعہ احساس ہوا کہ اپنے چاہنے والوں کو کسی ایسی چیز کی خاطر دکھ اور اذیت پہنچانا، جو خود کو بہت عزیز ہو، لیکن ان کے لئے کچھ معنی نہ رکھتی ہو، غلط اور ناجائز بات ہے۔ اس نظر سے دیکھو تو آئیڈیل ازم یا اصول پرستی بھی خود غرضی کی ایک صورت بن جاتی ہے۔ اس لئے کہ اپنے کسی اصول کی دھن میں آپ یہ بھول جاتے ہیں کہ دوسروں کو کیا چیز عزیز ہے۔ اور اس طرح اپنی خوشنودی کی خاطر دوسروں کا دل دکھاتے ہیں۔"

انسان کے ضمیر کے زندہ ہونے اور بے ضمیری کی پرچھائیاں چھانے کے بارے میں کتنا خوب صورت فیصلہ فیض نے صادر کیا ہے۔

"اگر اپنے دل میں جرم و گناہ کا کوئی احساس نہ ہو تو آدمی عذاب اور دکھ درد، سب مغائرتیں، سب سختیاں اور مصیبتیں غرض وہ سب کچھ برداشت کر سکتا ہے، جو باہر سے اس کی ذات پر نازل ہوں۔ صرف گناہ کا احساس، خطا کاری کا احساس یا اپنے آپ سے دغا کرنے کا احساس ایسی چیز ہے، جس کا کوئی مداوا، کوئی علاج نہیں ہو سکتا ہے، اس لئے کہ یہ داخلی چیز ہے اور اس کا احساس زندگی بھر اپنے ساتھ رہتا ہے۔

دکھ بھری جدائی کا تصور ہی فیض کو اپنی اہلیہ ایلس سے چند لمحوں کی ملاقات کی خوشی کو کافور کر دینے کے لئے کافی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"بہت جی چاہا کہ تم بھی یہاں ہوتیں، لیکن شاید اچھا ہی ہوا کہ تم نہیں تھیں۔ اس قسم کی ملاقات کا انجام ہمیشہ درد و حسرت کا خمیازہ ہوتا ہے۔"

آگے چل کر اپنے اس فلسفے کی کتنی عمدگی سے تشریح کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

"لذت پرستی کے فلسفے میں اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا کہ اگر وقتی لذت کے بعد اس لذت سے زیادہ دکھ اٹھانا پڑے تو اس لذت سے گریز کرنا چاہئے۔ اس سوال کا حل مشکل اس لئے ہے کہ اس لذت اور درد کا تناسب پہلے سے دریافت نہیں کیا جا سکتا۔"

ایک دوسرے خط میں انسانی فطرت کی باریکیوں کو کتنے سہل انداز میں بیان کرتے ہیں، لکھتے ہیں:

"ایک خاص عمر کے بعد انسان بنیادی طور سے اپنے آپ کو بدل نہیں سکتا اور اپنی اصلاح کے بارے میں زیادہ خوش فہمی فضول ہے۔ لیکن یہ بھی ہے کہ جب تک چند کڑی آزمائشوں سے گزرنا نہ پڑے اپنی ذات کے جھوٹ سچ کا پتہ ہی نہیں چلتا نہ اپنی اصل شخصیت اور اس شخصیت کے درمیان فرق واضح ہوتا ہے، جو دکھاوے کے لئے آدمی دنیا کے سامنے

پیش کرتا ہے۔"

ملک کی عدالتوں کے فرنگی طرز پر یوں مدح و ذم کرتے ہیں:

"انگریز ہمارے لئے جو قانونی نظام چھوڑ گئے ہیں، اس کے بلاشبہ کچھ اچھے پہلو بھی ہیں بلکہ بہت سے اچھے پہلو ہیں، لیکن اس کی تھکا دینے والی اور لاتعداد رسومات پر (جن کا مقصد تو بے گناہوں کی حمایت ہے) وقت اور پیسے کا اس قدر بے دریغ اسراف ہوتا ہے کہ ایک عام انسان جس کا صبر اور پیسہ دونوں محدود ہوں، ان کی تاب نہیں لا سکتا۔"

شخصیت کے ادھورے پن کی وجوہات کو باریک انداز میں لیکن کتنے سہل انداز میں سمجھاتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

"میں نے ہمیشہ محسوس کیا ہے کہ انسانی رنج اور ناخوشی کی بنیاد دراصل یہی خود پسندی ہے۔ یعنی اپنی ذات سے بہت زیادہ اہمیت وابستہ کرنا، افسردگی، بد دلی اور خود ترحمی کے احساسات کی تہہ میں بھی یہی گلہ کارفرما ہوتا ہے کہ ساری کائنات ہماری ذاتی تمناؤں کے مطابق کیوں تشکیل نہیں دی گئی۔"

ایک خط میں زندگی کی اہمیت اور مزاج کے باہمی تعلق کو یوں واضح کرتے ہیں:

"زندگی کی جدوجہد میں صرف جدوجہد ہی کافی نہیں یہ بھی ضروری ہے کہ انسان یہ لڑائی بشاشت اور خوش طبعی سے لڑے اور اپنے پر دردمندی اور ترحم کے جذبات طاری ہونے دے ورنہ غنیم کا پلہ اور بھی گراں بن جاتا ہے۔

میں جانتا ہوں کہ ایک حد تک یہ اپنے اپنے مزاج کی بات ہے اور آدمی بالارادہ وہ سب کچھ نہیں کر سکتا، جو اسے کرنا چاہیئے۔ لیکن مشکلات کیسی بھی ہوں اپنی طرح کی کوشش تو لازم اور واجب ہے۔"

ایک خط میں بیوی کی کمزوریوں کو کتنے نرم لہجے میں بیان کرکے ان کو سمجھاتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

"تمہاری رائے مجھے معلوم ہے اور مجھے اس سے زیادہ کچھ اختلاف بھی نہیں، لیکن ایسی ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی بہت سے زاویے ایسے ہوتے ہیں، جنہیں پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ ان پر فوری طور سے سفید و سیاہ کا حکم لگا دینا ٹھیک نہیں ہے۔"

آگے چل کر اس خط میں لکھتے ہیں:

"مجھے معلوم ہے کہ تمہارے حق و ناحق کے DOWN RIGHT فلسفے میں اس طرح کی موشگافیوں کی گنجائش نہیں ہے، لیکن تمہیں اس نسبتاً کمزور مخلوق کو بھی برداشت کرنا چاہیئے۔ جو ہمیشہ صراطِ مستقیم پر ثابت قدم نہیں رہ سکتی۔"

اپنی ذات کے بارے میں فیض کتنی صفائی سے کام لیتے ہوئے فلسفیانہ لہجے میں لکھتے ہیں:

"اپنی صلاحیت ہنر تو بہت محدود ہے اور بہت سے لوگ مجھ سے زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں۔ بات صرف محنت اور عرق

ریزی کی ہے۔ خاص طور سے بیانیہ
تحریریں اس نوع کی تحریریں سہل
انگاری کی وجہ سے میلان یہ ہوتا ہے کہ
جو کبھی گرا پڑا لفظ ہاتھ آجائے یا ذہن
میں جو کبھی تصویر ہے، اس سے ملتی جلتی
جو بھی صورت الفاظ میں ڈھل جائے،
اسی سے کام چلا لیا جائے گا۔"
ایک خط میں ادب کے متعلق کتنی جچی تلی اور صائب
رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:
"تمام ادب خواہ وہ کسی سیاسی نظریے'
کسی مکتبِ فکر یا کسی شخص سے متعلق ہو
بہرصورت قومی اثاثے کا جزو ہے۔ اسی
لئے حالات کچھ بھی ہوں۔ ادب کی تخلیق
بہرصورت ایک قومی خدمت کی ادائیگی
ہے، جس کا کچھ اعتراف اور کچھ قدر ہونی
چاہیئے۔ شاید یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ہر
خادم قوم کی طرح ہر ادیب کو کم از کم اتنی
آزادی ضرور میسر ہونی چاہیئے کہ وہ یہ
خدمت انجام دے سکے۔"

■■

فارم نمبر ۴

شبستان اُردو ڈائجسٹ نئی دہلی کی ملکیت اور دوسری تفاصیل کے متعلق بیانات جو اخبارات کی رجسٹریشن کے مرکزی قواعد ۱۹۵۶ کی رُو سے شائع کرنا لازمی ہے۔

۱۔ مقامِ اشاعت: دفاتر شبستان اُردو ڈائجسٹ، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

۲۔ وقفۂ اشاعت: ماہانہ ۳، ۴۔ طابع و ناشر: ایم۔ یونس دہلوی۔ قومیت: ہندوستانی

۵۔ مُدیران: یونس دہلوی، ادریس دہلوی، الیاس دہلوی۔ قومیت: ہندوستانی
پتہ: دفاتر شبستان اُردو ڈائجسٹ، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

۶۔ مالکان: شمع ڈسٹری بیوٹرز پرائیویٹ لمٹیڈ ۱۳/۱۴، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

وہ حصہ دار جن کا ملکیت میں ایک فی صدی سے زائد حصہ ہے: محمد یونس دہلوی، محمد ادریس دہلوی، محمد الیاس دہلوی، حاجی محمد یوسف دہلوی، بیگم خلیق النساء (مرحومہ)، بیگم زینت کوثر دہلوی، بیگم امینہ خاتون دہلوی، جمیل الرحمٰن، عمر الٰہی، محمد سعید معرفت شمع ڈسٹری بیوٹرز پرائیویٹ لمٹیڈ، ۱۳/۱۴، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

میں محمد یونس دہلوی اقرار کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات جہاں تک میرے علم و یقین کا تعلق ہے، حق و سچائی پر مبنی ہیں۔

یکم مارچ ۱۹۸۵

محمد یونس دہلوی، ناشر
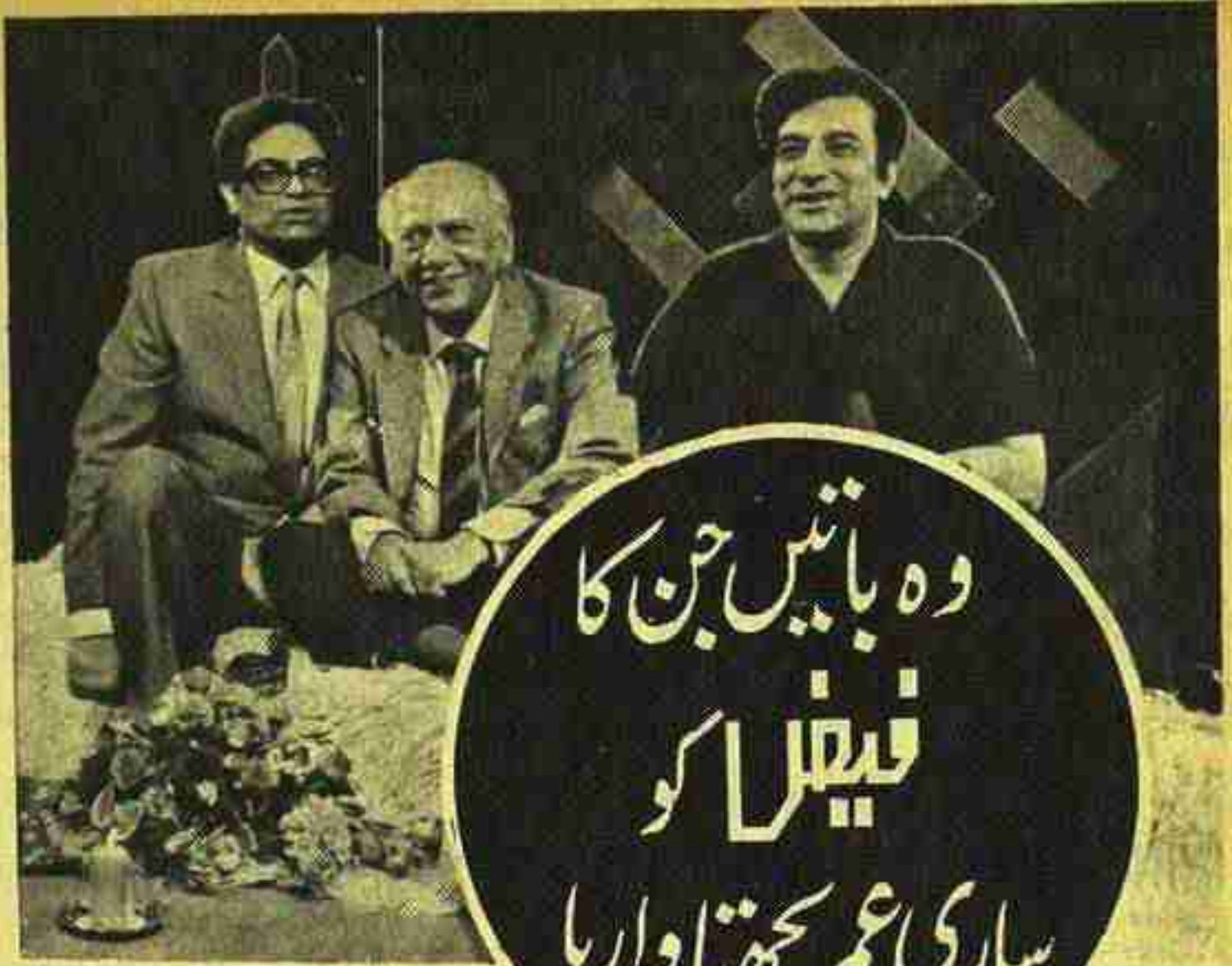
● احمد فراز، فیض احمد فیض اور افتخار عارف

وہ باتیں جن کا فیض کو ساری عمر پچھتاوا رہا

افتخار عارف: فیض صاحب، اگر ہم آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہیں، آپ کا انٹرویو لینا چاہیں تو ہمیں بتائیں کہ کون کون سی باتیں ہوں گی جنہیں آپ چاہیں گے کہ آپ سے پوچھی نہ جائیں۔

فیض: ایسی بہت سی باتیں ہیں، مثال کے طور پر ہمارے نامۂ اعمال میں کچھ پردہ نشینوں کے نام بھی آتے ہیں، وہ تو ہم نہیں بتائیں گے ——— اس کے علاوہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ کون سی باتیں ہیں جو آپ سے چھپانے کی ہیں۔ ہماری زندگی تو ایک کھلی کتاب کی سی ہے۔

عارف: عام طور سے آپ کے بارے میں ایک تاثر یہ ہے کہ آپ نے انتہائی بھرپور زندگی گذاری ہے اور بڑی کامیاب زندگی گذاری ہے۔ کبھی کوئی پچھتاوا بھی آپ کو ہوا ہوگا۔

فیض: ایک پچھتاوا تو ہے کہ جب ہم اسکول میں پڑھتے تھے تو ہماری AMBITION یہ تھی کہ ہم ایک بڑے کرکٹر بنیں۔ ابھی تک کبھی کبھی ہم خواب میں دیکھتے ہیں کہ ہم بہت بڑے ٹیسٹ کرکٹر ہیں اور کرکٹ میچ کھیل رہے ہیں ——— ایک تو وہ ہم نہیں بن سکے۔ یہ بہت بڑا پچھتاوا ہے۔

احمد فراز: فیض صاحب یہاں آپ سے تھوڑی سی عرض

فیض احمد فیض کا یہ آخری ٹیلی ویژن انٹرویو ہے جو بی بی سی ٹیلی ویژن کے لئے افتخار عارف اور احمد فراز نے لیا ——— یہ ایک بہت طویل انٹرویو تھا۔ اس کے بعد فیض صاحب لندن ہی نہیں دنیا سے ہی چلے گئے۔

کرنا چاہوں گا کہ اگر آپ کرکٹر بن بھی جاتے تو پانچ سات سال تک آپ کا جو خواب تھا وہ حقیقت کا روپ اختیار کر لیتا۔ بعد میں کرکٹ سے ریٹائر ہو کر تو اِدھر آنا ہی تھا آپ کو۔

فیض : یہ تو دوسری بات ہے نا۔

فراز : میں سوچ رہا تھا لندن کے حوالے سے اور انگلستان کے حوالے سے کہ.....

فیض : انگلستان کے حوالے سے یہ ہے کہ جب جنگ عظیم شروع ہوئی تو اُس سے چھ مہینے پہلے ہم نے کیمرج میں داخلہ لیا تھا۔ جانے کی تمام تیاریاں مکمل تھیں، بحری جہاز میں ہماری سیٹ بُک تھی۔ ہم نے کچھ کپڑے بھی سلوا لیے تھے۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب ہم امرتسر کے کالج میں پڑھاتے تھے۔ کالج کرکٹ ٹیم کے صدر تھے ایک سردار صاحب تھے جو ہماری کرکٹ ٹیم کو سامان مہیا کرتے تھے۔ ہم نے سوچ رکھا تھا کہ وہاں کام کاج کر کے کام چلا لیں گے۔ سردار صاحب سے بات ہوئی تو انہوں نے کہا کہ یوں کریں کہ آپ ہمارے ایجنٹ بن جائیں، ہم آپ کو مال کی فروخت پر معقول کمیشن دیں گے۔ مگر ایک شرط ہے کہ میں جیوتشی سے پوچھے بغیر کوئی کام نہیں کرتا۔ آپ کو اُس سے ملنا ہوگا۔ ہم اُس جیوتشی کے ہاں پہنچے۔ وہ کوئی پیشہ ور جیوتشی نہیں تھے، ریلوے میں ملازم تھے۔ جیوتشی صاحب نے ہمارا نام اور تاریخ پیدائش معلوم کی، کچھ یہ کچھ وہ پوچھا، ہاتھ دیکھا اور بولے "آپ تو جا ہی نہیں رہے ہیں۔" ہم نے پوچھا "کیا مطلب ہے؟" تو بولے راستہ ہی بند ہو گیا ہے۔ ہم نے کہا "راستہ بند سے کیا مطلب ہے۔ ہماری جیب میں ٹکٹ ہے، کیمرج میں داخلہ مل چکا ہے، تمام تیاریاں مکمل ہیں۔"

وہ بولے، آپ مانیں یا نہ مانیں، آپ نہیں جا رہے ہیں۔ اور واقعی ہوا یہ کہ چند ہی ماہ بعد جنگِ عظیم شروع ہو گئی۔ ہمارا اطالوی جہاز جو ہمیں لندن لے جانے والا تھا بمبئی ہی نہیں آسکا۔ اس طرح واقعی ہمارا راستہ بند ہو گیا۔ جب سے آج تک کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ واقعی کچھ ہوگا اس علم میں بھی۔

فراز : فیض صاحب آپ سے پوچھنا چاہوں گا کہ اپنے لٹریچر میں، اپنی گفتگو میں جو مقصدِ زندگی کا آپ نے بنایا ہے، جو کاز رکھا اُس میں جیوتشی یا ستاروں کی طاقت کی کوئی جگہ ہے۔ اُس چھوٹے سے واقعہ نے آپ کو کس حد تک متاثر کیا؟

فیض : متاثر صرف اس حد تک کیا کہ اُس کی بات سچ ہو گئی۔ کبھی کبھی تُکا بھی لگ جاتا ہے۔

عارف : آپ کا گھر سیالکوٹ میں تھا، وہیں آپ نے ابتدائی تعلیم حاصل کی، اُس زمانے کے حوالے سے بچپن کی کچھ یادوں میں ہمیں بھی شریک کر لیں۔

فیض : بچپن کی یادیں کہ جب ہم نے ہوش سنبھالا ہے، یعنی پانچ چھ سات سال کے ہوئے تو ابتداء ہم نے قرآن شریف حفظ کرنے سے کی۔ ایک حافظ صاحب مقرر کیے گئے کہ ہم کو حفظ کرائیں

تو ہم نے تین سپارے حفظ کئے۔ اُس کے بعد ہماری آنکھیں دُکھنے آگئیں۔ تو ایک بہانا وا یہ بھی ہے۔ جو آپ ابھی پوچھ رہے تھے کہ اس کے بعد ہم آگے حفظ نہ کر سکے۔

ابتدا میں ماسٹر عطا محمد سے گھر پہ اُردو اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ پھر ہم مدرسہ میں داخل ہوئے۔ ہمارے ابا جو تھے وہ انجمن اسلامیہ کے صدر تھے۔ اس لئے پہلے ہمیں وہیں داخل کیا گیا۔ ہم جب پہلی مرتبہ مدرسہ بھیجے گئے تو بڑے اہتمام کئے گئے۔ ہمیں مخملی کپڑے پہنائے گئے، آنکھوں میں کاجل لگایا گیا، یہ اور وہ نہ جانے کیا کیا اہتمام ہوئے۔ دو گھوڑوں والی گاڑی میں بٹھا کر مدرسہ بھیجا گیا۔ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ ٹاٹ بچھا ہوا ہے اور میلے کچیلے کپڑوں میں بے چارے بچے بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے کہ یہ کون سا جانور آگیا ہے۔

فراز: (قطع کلام کرتے ہوئے) فیض صاحب کی زندگی پر اس واقعہ کا بہت اثر ہے۔

فیض: بچوں نے ایسے ٹھٹھے لگائے ہم پر کہ بہت ندامت ہوئی اور فیصلہ کیا کہ آج کے بعد ہم یہ نہیں کریں گے کہ ہم اور یہ الگ الگ ہیں۔ خیر تھوڑے دن تک رہے ہم اُس اسکول میں مگر بچوں نے ہماری زندگی عذاب کر دی۔ ایک تو ہمارے ابا چونکہ اسکول کے صدر تھے اس لئے ہر ماسٹر ہم کو سلام کرتا تھا۔ امتحان وغیرہ تو ہوتے ہی نہیں تھے۔ ویسے بھی ہم اُردو، فارسی گھر پر اُس سے زیادہ پڑھ چکے تھے جو وہاں کے اُستادوں کو آتی تھی۔ آخر ایک دن ہم نے اپنے ابا سے کہا کہ ہم اس اسکول میں نہیں پڑھیں گے وہاں سے ہم مشن اسکول چلے گئے۔

یہ بھی اُس زمانہ کی یاد ہے کہ کانگریس اور خلافت کی تحریک چلی تھی۔ امرتسر میں مارشل لاء لگا تھا سارے شہر میں ایک طرح کا ہنگامہ تھا۔ سیاسی گہما گہمی تھی۔ باہر سے لیڈر آتے تھے اور اُن کے لئے شہر بھر میں پھولوں کے دروازے لگائے جاتے تھے۔ پھولوں سے سجی گاڑیاں تیار کی جاتی تھیں جب اُن کا جلوس نکلتا تو ہندو، مسلمان، سکھ سب ساتھ ہوتے تھے۔ نعرے لگتے تھے "جو بولے سو نہال۔ ست سری اکال" پھر نعرۂ تکبیر، اللہ اکبر کی صدا بلند ہوتی۔ قومی نعرہ۔ بندے ماترم" کی آواز لگتی تھی اور اُس کے بعد علامہ اقبال کا ترانہ "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" گایا جاتا تھا۔

یہ ہنگامے ہوتے ہی رہتے تھے۔ ہمارے ابا چونکہ شہر کے بہت بڑے رئیس تھے تو لوگ آتے تھے کہ آپ بھی تحریک میں حصہ لیجئے۔ وہ کہتے تھے جی تو بہت چاہتا ہے کہ میں بھی اس میدان میں کود پڑوں مگر مجھے اپنے بچوں کا خیال آتا ہے، یہ ابھی بہت چھوٹے ہیں۔ اور چونکہ وہ اُس میدان میں نہیں کودے تو انگریز سے اُنہیں خان بہادر کا خطاب مل گیا۔

عارف: علامہ اقبال سے آپ کی ملاقاتیں کیسی تھیں؟

فیض : علامہ صاحب کو صرف ایک ہی بار دیکھا ہے،
ذہن میں بہت دھندلا سا تصوّر ہے۔ یہ پوچھئے
کہ پہلی بار ہم پبلک میں کب آئے ——— انجمن
اسلامیہ کا ہر سال ایک جلسہ ہوتا تھا۔ جس میں
مسلمانوں کے بڑے بڑے لیڈر آتے تھے۔ ہمارے
ابا انجمن کے صدر تھے، ہماری عمر چار یا پانچ سال
کی ہوگی۔ جب ہم نے قرآن شریف حفظ کرنا شروع
ہی کیا تھا۔ جلسہ میں ہمیں قرأت کرنے کے لئے
کھڑا کردیا گیا۔ ہم نے پلیٹ فارم پہ پہنچ کر
قرأت شروع کی تھی کہ انجمن کے سیکریٹری
شیخ ظہور الٰہی مراد نے ہمیں اٹھا کر منبر پہ
کھڑا کردیا۔ وہاں ہم نے تھوڑی سی تلاوت
کی۔ یہ تھی ہماری پہلی پبلک اپیرنس
(PUBLIC APPEARANCE)
ہمارے ابا چونکہ شہر کے رئیس تھے، ڈسٹرکٹ
بورڈ کے وائس چیرمین تھے، اور نہ جانے کیا کیا
تھے وہ۔ ڈپٹی کمشنر، کمشنر، کمانڈر انچیف باہر
سے آتے تو ہمارے ابا ہمارے بڑے بھائی
طفیل اور چھوٹے بھائی عنایت کو چھوڑ کر ہمیں
اپنے ساتھ رکھتے تھے کیوں کہ ہم اچھی انگریزی
بول لیتے تھے۔ ہمیں یہ اچھا نہیں لگتا تھا مگر
اس طرح پبلک لائف سے بچپن میں ہی روشناس
ہوگئے۔ جب ہم ساتویں آٹھویں جماعت میں
پہنچے تو بڑے بھائی کے ہم جماعت نذیر احمد محمود
جو بعد میں جسٹس بنے کہنے لگے کہ تم شاعری کی
کتابیں پڑھتے رہتے ہو کبھی شاعری بھی کی۔
ہم نے کہا شاعری تو کبھی نہیں کی۔ کہنے لگے

ہماری کلاس میں ایک لڑکا ہے چھجو رام۔
اُس کی ہجو لکھو۔ جو سمجھ میں آیا، ہم نے الٹی سیدھی
ہجو لکھ دی کہ چھجو رام کا سر اس طرح کا ہے،
پیٹ اس طرح کا ہے، ٹانگیں اس طرح کی
ہیں ——— انہوں نے ہجو پڑھی تو کہنے لگے
تم تو شاعر ہو ——— اگلے دن سارے
اسکول میں ہجو مشہور کردی۔ ہمیں بہت ندامت
ہوئی کہ چھجو رام کو رنج ہوا ہوگا۔ ہم اُسے جانتے
بھی نہیں تھے کہ کون ہے۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر
اُس تک پہنچے، معافی مانگی تو کہنے لگا "معافی
کیسی، میں تو شکر گذار ہوں کہ آپ نے مجھے
سارے اسکول میں مشہور کردیا۔"
تو یہ تھی شاعری میں ہماری پہلی کوشش پھر
ہم جب دسویں جماعت میں پہنچے تو ہمارے ماسٹر
بہاری لال نے ایک مصرع دے کر سب کو
غزل کہنے کی دعوت دی۔ شمس العلماء سیّد
میر حسن جج تھے۔ ہماری غزل کو پہلا انعام ملا۔
حالانکہ میں سمجھتا ہوں کہ غزل کے آدھے
مصرعے وزن سے خارج تھے۔ شمس العلماء نے
خوش ہوکر ہمیں ایک روپیہ انعام میں دیا۔
یہ پہلا انعام تھا جو ہمیں ملا تھا۔ آج تک یہ
انعام یاد ہے۔
عارف : کچھ فوج کے بارے میں بتائیں کہ آپ کیسے
گئے تھے؟
فیض : جب سن ۱۹۳۹ میں لڑائی شروع ہوئی اُس
وقت ہمارے جو سیاسی دوست تھے انہوں نے
کہا یہ سامراجی جنگ ہے، ہمارا اس سے کوئی

واسطہ نہیں ہے۔ کانگریس نے ہندوستان چھوڑو تحریک چلا رکھی تھی اور جتنے بائیں بازو کے لوگ تھے خاص طور سے کمیونسٹ اور سوشلسٹ ان سب کو انگریزوں نے دیولالی کیمپ میں نظر بند کر دیا تھا۔ ہمارے ایک بزرگ دوست مجید ملک فوج میں پبلک ریلیشنز افسر بن کر چلے گئے تو انہوں نے بہت چاہا کہ ہم فوج میں چلے جائیں مگر ہم نے انکار کر دیا کہ یہ امپیریلزم کی جنگ ہے ہم اس میں شریک نہیں ہوں گے۔

اُس دوران میں بی بی سی نے اس سلسلہ کے کچھ پروگرام شروع کئے۔ افضل (مرحوم) چچا سید (مرحوم) اعجاز بٹالوی، بی بی سی سے وابستہ ہو گئے۔ زیڈ بی بخاری انچارج تھے۔ اُن کا تار آیا کہ بی بی سی میں آجاؤ۔ ہمیں اُن دنوں امرتسر میں لیکچرار کے طور پر ایک سو بیس روپے تنخواہ ملتی تھی۔ تھوڑا سا دل للچایا کہ اس بہانے سے لندن دیکھ لیں۔ ہم نے انگلستان دیکھا نہیں تھا۔ حالانکہ انگریز بیوی سے تو شادی کر چکے تھے۔ انگریز خاتون سے شادی کرنے کے لئے انگلستان جانے کی زحمت نہیں اٹھانا پڑی تھی، وہ خود ہی آ گئی تھی۔ دل کہتا تھا کہ ملازمت کے ساتھ ساتھ ممکن ہوا تو کیمبرج میں داخلہ لے لیں گے یا بیرسٹر بن جائیں گے لیکن بہت سوچ بچار کے بعد ہم نے تار بھیج دیا کہ ہم اس جنگ میں امپیریلزم کا ساتھ نہیں دیں گے۔

پھر جرمنوں نے روس پر حملہ کر دیا، دوسری طرف جاپانی ہندوستان کی سرحدوں تک آ گئے۔ ہمارے دوستوں نے کہا حضور یہ ملک کے تحفظ کا مسئلہ ہے، یہ عالمی جنگ ہے۔ یہ فاشزم کے خلاف جنگ تو لڑنا ہی چاہیئے۔ فوج میں ہم اس طرح گئے کہ شام کو ہم ریڈیو پر تقریر کرنے کے لئے گئے تھے کہ وہاں دہلی سے مجید ملک کا فون آیا کہ کل دلّی آجاؤ تم سے بات کرنا ہے۔ میں سمجھ گیا۔ دوستوں سے مشورہ کیا تو سب نے اجازت دے دی۔

دہلی میں انگریز بریگیڈیر کے سامنے پیش کیا گیا تو اُس نے کہا "تمہاری سی آئی ڈی کی فائل میرے سامنے میز پر رکھی ہے اُس پر لکھا ہوا ہے:

"YOU ARE ADVANCED COMMUNIST"

(تم ایک زبردست کمیونسٹ ہو)

میں نے پوچھا:

"WHAT IS A RETARDED COMMUNIST?"

(کمزور کمیونسٹ کیا ہوتا ہے؟)

کہنے لگے خیر مجھے اس رپورٹ کی پروا نہیں، تم کام کرو گے؟ میں نے کہا ہاں کروں گا—— تب ہم اس طرح فوج میں آ گئے۔

عارف: آپ نے کہا تھا گاندھی کی آواز پر بھی تو کچھ ملکی نغمے لکھے تھے۔

فیض: جی ہاں۔ اُن دنوں ہم لیڈر تھے۔ بہت سے نغمے ہم نے لکھے جیسے "تجھ کو منظور......"

●●

○ فیض احمد فیضؔ اور بی بی سی ٹیلی ویژن کے کرشن گولڈ جنھوں نے یہ آخری انٹرویو ریکارڈ کیا۔

پاکستان جانے سے پہلے فیض احمد فیضؔ نے بی بی سی کے ایشیائی پروگرام کے لئے ایک انٹرویو ریکارڈ کرایا تھا جو پروگرام کے پروڈیوسر جناب کرشن گولڈ نے کیا تھا۔ کرشن گولڈ کے مطابق یہ فیض صاحب کا آخری انٹرویو ہے شبستان کے لئے اسے سلطان محمود نے مرتّب کیا ہے۔

کرشن: فیض صاحب! ابھی حال ہی میں ایک انٹرویو میں آپ سے پوچھا گیا تھا کہ آپ یہ بتایئے کہ ایسے کون سے سوال ہیں جو آپ سے نہ پوچھے جائیں لیکن میں اس کے بالکل برعکس کہنا چاہتا ہوں آپ نے سینکڑوں ہزاروں انٹرویو دیے ہیں آپ ایسے سوال بتائیں جو آپ نے ہمیشہ سوچا ہو کہ کاش مجھ سے کوئی پوچھے اور میں اس کا یہ جواب دوں۔ ایسا کوئی سوال ہے؟

فیض: کبھی بات یہ ہے کہ ہم تو انٹرویو وغیرہ دینے کے قائل ہی نہیں ہیں۔ ہمارا کام تو صرف لکھنا ہے۔ ہم سے کوئی کیا سوال پوچھتا ہے۔ کیوں پوچھتا ہے ہم نے کبھی غور نہیں کیا۔ جو بھی کوئی سوال کرے ہم جواب دینے کو تیار ہیں۔ آپ پوچھ رہے ہیں کہ کوئی ایسا سوال جو ہم سے کرنا چاہیئے تھا اور ہمیں اس کا جواب دینا چاہیئے تھا۔ یہ ذرا سوچنے کا مجھے موقع دیجئے۔ اگلا سوال کیجئے۔

کرشن: آپ نے ابھی کہا ہے کہ میرا کام لکھنا ہے اچھا تو پھر یہ بتا دیجئے، آپ نے شعر لکھنا کب شروع کیا تھا۔

فیض: شعر تو شاید ہم نے بچپن ہی میں تک بندی شروع کر دی ہوگی۔ جس کا ہم نے کبھی کوئی

ریکارڈ نہیں رکھا۔ لیکن سنجیدگی سے ہم نے اُس وقت لکھنا شروع کیا تھا جب ہم گورنمنٹ کالج میں داخل ہوئے۔ یہ بات ۱۹۲۹ء کی ہے جب ہم تھرڈ ائیر میں پڑھتے تھے۔ جب پہلا مشاعرہ ہوا گورنمنٹ کالج لاہور میں۔ کالج کے اُس مشاعرے میں شہر کے نامور شعراء حضرات تشریف لائے تھے۔ آج کل جو فرشی مشاعرے کا رواج چل نکلا ہے، اُس زمانے میں ایسا نہیں ہوتا تھا۔ کالج میں ایسا ہوتا کہ جو بڑے بڑے شاعر ہوتے تھے، وہ اسٹیج پر کرسیوں پر بیٹھتے تھے اور جو ہمارے جیسے ابھی شاعر بننے کی کوشش میں ہوتے تھے، وہ سامعین میں بیٹھتے تھے۔ اور باری باری ان کو پکارا جاتا تھا۔ تو ہم نے مشاعرہ میں پڑھنا تو گورنمنٹ کالج میں ہی شروع کیا تھا۔ پہلی بار جو ہم نے غزل پڑھی تو بہت داد ملی۔ اُس مشاعرے کی صدارت پطرس بخاری صاحب کر رہے تھے۔ پہلے دَور میں بہت داد ملی تو دوسرے دَور کے لئے بھی ہمیں بلایا گیا۔ مگر ہمارے پاس تو صرف ایک ہی غزل تھی۔

ایک بار ہمارے ایک دوست برج موہن نے اپنے ایک دوست کے نام ایک منظوم خط ہم سے لکھوایا تھا جو کہ ہم نے ایک نظم کر کے لکھ دیا تھا ——— ہم نے مجبوراً دوسرے دَور میں وہ منظوم خط پڑھ دیا۔ اس کے بعد مشاعرہ ختم ہوا تو چراغ حسن حسرت، صوفی تبسم، اور عبدالمجید سالک جیسے بلند پایہ صاحب سخن اور اہلِ قلم ہمارے پاس آگئے اور کہنے لگے کہ معلوم ہوتا ہے دل کو بہت چوٹ لگی ہے۔ میں نے کہا "جی ہاں لگی تو ہے"۔ کہنے لگے "ہاں بھئی اِرنگ بہت اچھا ہے شعر کہا کریں"۔ ہم نے سمجھا کہ ہم تو واقعی شاعر ہو گئے ہیں جو اس قسم کے چوٹی کے لوگ ہمیں سراہ رہے ہیں۔ یہ ہے ہمارے شعری سفر کا آغاز۔

کرشن: ابھی آپ نے کہا کہ کسی زمانے میں آپ تک بندی کیا کرتے تھے اُس زمانے میں کبھی خیال آیا تھا کہ آپ شاعر بنیں گے؟

فیض: کبھی بھی نہیں۔ اُس وقت تو ہم کرکٹر بننا چاہتے تھے۔ اپنی خواہشات کا دائرہ یہاں تک ہی محدود تھا۔

کرشن: شاعری کے علاوہ آپ پروفیسر بھی رہے اور اخبار کے ایڈیٹر بھی۔ آپ فوج میں بھی رہے ان سب کے باوجود آپ کا شاعری سے ناطہ برقرار رہا۔ یہ بتائیے مذکورہ ملازمتوں میں آپ کیسے چلے گئے۔ مثلاً فوج میں آپ کیوں اور کیسے گئے؟

فیض: جب جرمن نے روس پر حملہ کر دیا اور جاپانی ہندوستان تک پہنچ گئے تو ہم نے سوچا کہ اب تو فاشزم کا سوال ہے۔ یہ انگریزوں کی حمایت کا سوال نہیں ہے وہ ایک عالمگیر تحریک تھی۔ فاشزم کے خلاف اور جمہوریت کے حق میں۔ تب ہم نے سوچا کہ ہمیں فوج میں شامل ہونا چاہئے اور جمہوری قدروں کی بحالی کے لئے ہمیں بھی ہاتھ بٹانا چاہئے

کرشن: اس کے بعد پھر آپ نے سیاست میں بھی حصّہ لیا؟

فیض: سیاست میں تو ہم نے فوج میں جانے سے پہلے ہی حصّہ لینا شروع کر دیا تھا۔ ہوا یوں کہ جب ہم ۱۹۳۵ میں امرتسر میں پڑھاتے تھے تو ہمارے ساتھ ایک ہمارے رفیقِ کار تھے۔ رام پور سے صاحب زادہ محمود الظفر ان کی بیگم تھی ڈاکٹر رشیدہ جہاں۔ وہ لوگ ہمارے ساتھ تھے۔ محمود الظفر نے ہم سے کہا کہ ہم نے لندن میں ہندوستانی ترقی پسند مصنّفین کی ایک ایسوی ایشن قائم کی ہے اور اب چاہتے ہیں کہ وہ تنظیم ہندوستان میں بھی قائم کی جائے۔ کیا تمہیں اس میں کوئی دلچسپی ہے تو ہم نے کہا ہاں! ہم ضرور کام کریں گے۔ یہ ہمارے شباب کا زمانہ تھا۔ اور عاشقی وغیرہ کا مرض بھی لاحق تھا۔ بیگم رشیدہ جہاں نے کہا چھوڑ یہ عاشقی وغیرہ کے چکر، سب فضول بات ہے۔ دنیا کے دکھ جو ہیں ان کی نوعیت زیادہ سنگین ہے۔ یہ تمہارا عاشقی کا چھوٹا سا معاملہ ہے۔ اور انہوں نے ہم کو سکھایا کہ اپنا غم جو ہے یہ تو بہت معمولی سی چیز ہے۔ دنیا بھر کے دکھ دیکھو اور اپنے لوگوں کے اپنی قوم کے اور اپنے ملک کے۔ ان کی بپتا کے بارے میں تمہیں سوچنا چاہیئے۔ اگر اپنے لئے سوچتے رہو گے تو یہ خود غرضی کا عمل ہوگا چنانچہ یہ شعر ہمارے اسی ٭ نے کی یادگار ہے۔

"اور بھی غم ہیں زمانے میں محبّت کے سوا"

کرشن: کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ جب آپ جیل میں تھے وہ زمانہ آپ کی شاعری کا سب سے زرخیز زمانہ تھا؟

فیض: یہ بالکل ٹھیک ہے کیونکہ جیل خانے میں اور کوئی مصروفیت نہیں تھی کوئی اپائنٹمنٹ نہیں ہوتی تھی۔ جیل کا زمانہ ایسا ہی ہے جیسا پھر سے عشق کر لیا جائے۔ جیسے عشق میں خواہ مخواہ شعر بنتے چلے جاتے ہیں۔ انسان جذبات کی رَو میں بہہ کر کہتا ہی چلا جاتا ہے۔ جیل خانے میں بھی ایسا ہی ہے جیسا آپ نے دوبارہ عشق کر لیا ہو۔ جیل میں میرا یہ عشق شاعری سے تھا۔

کرشن: عام طور پر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ آپ نے انتہائی بھرپور اور کامیاب زندگی گزاری ہے کیا آپ بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں؟

فیض: بھرپور تو ٹھیک ہے لیکن کامیاب ہم نہیں کہہ سکتے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہر پانچ یا چھ سال کے بعد انسان کو اپنا کام بدل لینا چاہیئے جیسے ہم نے پہلے پانچ سال پڑھایا پھر پانچ سال فوج کی نوکری کی۔ پھر اس کے بعد پانچ یا چھ سال صحافت کی نذر کر دیے۔ اس کے بعد پانچ سال جیل خانے گئے۔ اس کے بعد ہم نے کلچرل کام کیا چار سال باہر گزارے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ آدمی کو کسی ایک رٹ میں نہیں لگا رہنا چاہیئے۔

کرشن: کوئی ایسا کام جو آپ کرنا چاہتے تھے اور وہ نہیں ہوا؟

فیض: ایسے تو بہت سے کام ہیں جو ہم کرنا چاہتے تھے اور نہیں ہوئے اور ایسے بہت سے کام بھی ہیں جو ہم نہیں کرنا چاہتے تھے اور وہ ہم نے

کردے۔ ہم سمجھتے ہیں جو کام ہمیں کرنا چاہیے تھے وہ ہم اِس لئے نہیں کر پائے کہ ہمیں وہ کام کرنے کی مہلت ہی نہیں ملی۔ مثلاً ہم یہ چاہتے تھے کہ شاعری کو چھوڑ کر ادب خاص طور پر اُردو شاعری کے سیاسی، اقتصادی اور سماجی رشتوں کے بارے میں جم کے بیٹھ کر کچھ لکھیں آخر غزل کیسے اور کیوں بدلتی رہی۔ مختلف زمانوں میں مثلاً ناول نے کیسے اور کیوں جنم لیا۔ انگریزوں کے آنے کے بعد نقشہ کیسے بدلا وغیرہ ہمارے ہاں ادبی تاریخ تو کافی لکھی گئی ہے لیکن وہ سب سطحی ہے۔ اس میں ادبی معاملات پر غور کیا گیا ہے اور ادب کے جو معاشرتی اقتصادی اور سیاسی رشتے ہیں ان پر زیادہ غور نہیں کیا گیا۔ ہم چاہتے تھے کہ یکسوئی کے ساتھ بیٹھ کر اس خلاء کو پُر کر لیا جائے۔ یہ کافی لمبا اور محنت طلب کام ہے جو ہم ابھی تک نہیں کر سکے۔

کرشن: نوجوان شاعروں کو آپ شاعری کے بارے میں کیا مشورہ دیں گے؟

فیض: شاعری کے بارے میں تین مشورے ہیں۔ پہلا مشورہ تو یہ ہے کہ جو کچھ لکھو اپنے دل سے لکھو۔ کسی کے کہنے کی وجہ سے مت لکھو۔ دباؤ میں آکر مت لکھو۔ ثواب کی خاطر مت لکھو۔ حتیٰ کہ سیاست کی خاطر بھی مت لکھو۔ جو دل سے بات نکلتی ہے وہی لکھو۔ اگر دل سے بات نہیں نکلتی تو مت لکھو۔ دوسرا مشورہ یہ ہے کہ انسان کی اپنی ذات تو حقیر سی چیز ہے۔ اندر سے تم کیا نکال لو گے۔ اندر جو کچھ ہے وہ تو باہر ہی سے آتا ہے۔ تو دیکھنے کی بات یہ ہے کہ باہر کیا ہے تو باہر کی بات کے تین حلقے ہیں ایک تو آپ کی اپنی ذات کا حلقہ ہے۔ آپ پر خود کیا گزری اور آپ پر جو گزری ہے اُس کا آپ کے لوگوں اور آپ کے قوم پر کیا اثر ہوا ہے۔ اِن مناظر میں آپ حالات کا جائزہ لیں۔ یہ تو تین اہم سرکل ہیں جن پر انسان کی نظر ہونی چاہیئے اور دوسرا آپ کو اپنے ماضی حال اور مستقبل پر بھی نظر رکھنی چاہیئے۔ یہ امر مدِّ نظر رہنا چاہیئے کہ ماضی سے ہمارا کیا رشتہ تھا؟ حال میں ہم کیا کر رہے ہیں اور مستقبل میں ہمیں کون سے راستے پر چلنا ہے اِن پر بھی نظر رکھنی چاہیئے۔ پھر جا کر کہیں بڑی شاعری بنتی ہے جس سے معاشرے کی خدمت ممکن ہوتی ہے۔

کرشن: آخر میں، مَیں فیض صاحب! آپ سے درخواست کروں گا کہ اپنا کوئی تازہ کلام سنائیے۔

فیض: ابھی ہم گھر گئے تھے کوئی پانچ چھ مہینے ہوئے تو وہاں جو کچھ ہم نے دیکھا اور جو ہم پر گزری وہ ہم عرض کئے دیتے ہیں۔

نہیں نگاہ میں منزل تو جستجو ہی سہی
نہیں وصال میسر تو آرزو ہی سہی

نہ تن میں خون فراہم نہ اشک آنکھوں میں
نمازِ شوق تو واجب ہے بے وضو ہی سہی
گر انتظار کٹھن ہے تو جب تلک اے دل
کسی کے وعدۂ فردا کی گفتگو ہی سہی

●●

کرکٹ کی زبان میں فیض صاحب سے گفتگو

انور مقصود

فیض احمد فیض کو کرکٹ سے بہت دل چسپی تھی، بلکہ وہ کرکٹر ہی بننا چاہتے تھے مگر کالج کی کرکٹ ٹیم کے صدر بن کر رہ گئے —— انور مقصود نے فیض صاحب سے کرکٹ کی زبان میں انٹرویو لیا ہے جس میں ان کی زندگی کے بہت سے پہلو کرکٹ کی زبان کے ذریعہ اُجاگر کئے گئے ہیں۔

انور مقصود: فیض صاحب! آپ کے خیال میں آپ کی سب سے اچھی اننگ کون سی ہے؟

فیض: ہم نے کئی اچھی اننگ کھیلی ہیں۔ اس وقت یاد نہیں آرہی ہیں۔

انور: ہر اچھا بیٹس مین اپنی سب سے اچھی اننگ ہمیشہ یاد رکھتا ہے۔

فیض: ایک اننگ ہم نے وطن کو حسین بنانے کے لئے کھیلی تھی۔ اس اننگ میں بھی ہم مصائب جھیلتے رہے، خون کے آنسو پیتے رہے، پھر ہمیں کوئی آؤٹ نہیں کرسکا۔

انور: وہ کون سی اننگ تھی؟

فیض: وہ ہمارا دوسرا ٹیسٹ تھا، "دستِ صبا" ہمارے خیال میں ہماری سب سے اچھی اننگ "دستِ صبا" تھی۔

انور: آپ فاسٹ بالنگ سے ڈرتے ہیں؟

فیض: ہم نے کبھی ہیلمٹ نہیں پہنی۔

انور: وہ کیوں؟

فیض: آزاد فضا میں سانس لینے کا مزا دوسرا ہے۔ دماغ پر بلا وجہ بوجھ ڈالنے سے کیا فائدہ؟

انور: مگر ہیلمٹ پہننے کے مواقع تو آپ کو بہت ملے؟

فیض: بھئی، ہم دوسری طرح کے کھلاڑی تھے۔ تم ہمیں غلط مت سمجھو۔

انور: سنا ہے آپ زیادہ تر بولڈ ہوئے ہیں؟

فیض: تم کبھی درست باتیں بھی سنا کرو۔ ہم ہمیشہ کیچ ہوئے ہیں۔ بولڈ کبھی نہیں ہوئے۔

انور: کس سائڈ پر زیادہ مرتبہ کیچ ہوئے؟

فیض: ہمیشہ رائٹ سائڈ پر۔ کیوں کہ ہماری لیفٹ سائڈ بہت پاورفل تھی، اس وجہ سے ہم زیادہ تر رائٹ کی گیند کو بھی لیفٹ پر کھیلنے کی کوشش کرتے تھے اور ہمیشہ سلپ میں ہمیں کوئی نہ کوئی پکڑ لیتا تھا۔

انور: آج کل آپ نے کرکٹ کچھ کم کردی ہے؟

فیض: کم نہیں کردی ہے، دوسری طرف کوئی کھیلنے والا نظر نہیں آرہا ہے۔ اکیلے کہاں تک بھاگیں؟

موسیقار خورشید انور اور فیض احمد فیض آگے پیچھے دُنیا سے رخصت ہوئے۔ فیض صاحب بین الاقوامی شہرت کے شاعر اور دانشور تھے۔ خورشید انور کو وہ شہرت اور مقام نہ ملا لیکن درحقیقت دونوں ایک ہی پائے کے لوگ تھے۔ بچپن سے ساتھ رہے، پڑھے لکھے، پلے بڑھے۔ بہت کم لوگوں کو علم ہے کہ خورشید انور آئی۔سی۔ایس کا امتحان دے رہے تھے مگر دہشت پسندی اور آزادی کی تحریک میں ایسے پھنسے کہ آئی۔سی۔ایس بلکہ ہر سرکاری نوکری سے نفرت ہو گئی۔ دوسرے لطیفے کی بات یہ ہے کہ کالج کے زمانے میں خورشید انور صاحب کو شاعری کا شوق تھا اور وہ شعر موزوں کہا کرتے تھے جب کہ فیض صاحب موسیقی سے دلچسپی رکھتے تھے۔ طبلہ بجاتے اور طرزیں بناتے۔ مگر تقدیر نے دونوں کے لئے بالکل متضاد عمل رکھے تھے۔ فیض صاحب زندۂ جاوید شاعر بن گئے۔ خورشید انور نے موسیقی میں وہ مقام پیدا کیا کہ اکبر کے زمانے میں ہوتے تو شاید اُس کے نورتنوں میں سب سے آب دار رتن ہوتے۔

علی سفیان آفاقی

انور: اچھا ایک بات بتائیں۔ سلیکشن کمیٹی ہمیشہ آپ کے خلاف کیوں ہو جاتی ہے؟

فیض: بھئی بلاوجہ تو نہیں ہوتی۔ جب ٹیسٹ پلیئر خود سلیکشن کمیٹی کے خلاف ہو تو پھر اس کی ناراضگی جائز ہے۔

انور: ایک اچھی اننگ کھیلنے کے لئے کیا چیز ضروری ہے؟

فیض: اچھی اننگ کھیلنے کے لئے قلم، کاغذ اور اخبار ان کا اچھا ہونا بہت ضروری ہے۔

انور: آپ بالنگ کرتے ہیں؟

فیض: ہم لیفٹ آرم گگلی باؤلر ہیں۔

انور: آپ فیلڈر کیسے ہیں؟

فیض: بہت بڑے فیلڈر ہیں۔ ہم نے بہت چوکے چھوڑے ہیں۔

انور: وہ کیوں؟

فیض: بھئی بات یہ ہے ہم سے جھکا نہیں جاتا۔

انور: آپ کا بینی فٹ میچ کب ہو رہا ہے؟

فیض: ہم اپنا بینی فٹ میچ کیوں کروائیں۔ ہم بالکل فٹ ہیں۔

انور: آپ اب تک کتنے میچ جیت چکے ہیں؟

فیض: ہمارے میچ ہار جیت والے نہیں ہوتے۔ میچ اچھا ہو تو پھر ہار جیت کو کون دیکھتا ہے۔ پھر اگر ہم جیت گئے تو کیا کہنا اور اگر ہار گئے تو مات کی طرف دھیان ہی نہیں جاتا۔

انور: آئندہ کا کیا پروگرام ہے؟

فیض: اب ہم اپنی دوسری دنیا میں میچ کھیلنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔

انور: ابھی سے۔ ابھی تو آپ کو بہت میچ کھیلنا ہیں۔

فیض: بھئی بلاوجہ۔ بہت کھیل چکے۔

انور: بہت جلدی پروگرام بنا لیا۔

فیض: فکرِ سُود و زیاں تو چھوٹے گی
منتِ این و آں تو چھوٹے گی
خیر، دوزخ میں مے ملے نہ ملے
شیخ صاحب سے جاں تو چھوٹے گی

●●

۱۶- نومبر کو میں نے اپنے بہنوئی فیض احمد فیضؔ سے ماڈل ٹاؤن میں ان کی رہائش گاہ پر ملاقات کی مقصد پاکستان میں عورتوں کی حیثیت کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر معلوم کرنا تھا۔ میں پوچھنا چاہتی تھی کہ عورتوں کو کمتر سمجھنے کے رویّے کو کس طرح بدلا جا سکتا ہے۔ بدقسمتی سے یہ ان کا آخری انٹرویو ثابت ہوا۔ اس سے اگلے دن وہ اپنے آبائی گاؤں چلے گئے اور وہاں سے واپسی پر سخت بیمار پڑ گئے۔

فیض صاحب نے اس موضوع پر بہت یقین اور شدّتِ احساس کے ساتھ اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا "عورتیں اپنے حقوق کو مردوں کے حقوق سے الگ کوئی چیز سمجھتی ہیں اور اس کے لئے علیحدہ جدوجہد کر رہی ہیں حالانکہ مردوں اور عورتوں کے مسائل کو الگ الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اس صورتِ حال کا انحصار تمام تر عورتوں پر ہے۔ قدیم اور پس ماندہ معاشروں میں جہاں مرد اور عورت کی محنت کی تقسیم میں کوئی فرق نہیں وہاں ان کے حالات بھی یکساں ہیں۔ عورتوں کی حالت اُس نظام کے مطابق بہتر یا بدتر ہوتی ہے۔ جس کے تحت وہ زندگی گذارتی ہیں جس سماجی نظام میں مرد کی ذات اہم کردار ادا کرتی ہے۔ وہاں عورت کی حالت اس معاشرے کا ایک فرد ہونے کی حیثیت سے ضرور مرد سے متاثر ہوگی۔ وہ مزید استبداد کا شکار ہو جائے گی۔ پاکستان کے جن علاقوں میں عورتوں کو نسبتاً بہتر حیثیت دی جاتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں کے مرد بھی ترقی کر چکے ہیں چنانچہ یہ سوچنا غلط ہے کہ عورتیں مردوں کے بغیر اپنے حقوق منوا سکتی ہیں۔ عورتیں اکیلی کچھ نہیں کر سکتیں۔ ظاہر ہے جب مرد تعلیمی ذہنی اور معاشی اعتبار سے پس ماندہ ہوں گے تو عورتوں کو زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔"

"ہمارے بعض علاقوں میں تو صورتِ حال بہت ہی افسوس ناک ہے مثلاً دیہات وغیرہ میں بالغ عورت کی

شادی نوخیز بچوں سے کر دی جاتی ہے یا برادری میں رشتہ نہ ہونے کے باعث اس کی شادی نہیں کی جاتی اُس کو جائداد کے حصّے سے محروم رکھا جاتا ہے۔ نواب پور کا المیہ (یہاں عورتوں کو برہنہ کر کے جلوس نکالا گیا اور بید سے اُن کے جسم لہو لہان کئے گئے) مَردوں کی غیر مہذب ذہنیت ہی کا ثبوت ہے جن علاقوں میں سماجی نظام استبداد پر مبنی ہو وہاں ایسے ہی واقعات ہوتے ہیں یہ دراصل معاشرے کے پورے ڈھانچے کا مسئلہ ہے۔ جہاں معاشرے کا یہ ڈھانچہ زیادہ روشن خیال ہے اور عورت اور مرد دونوں کی صلاحیتوں کی نشوونما کے مواقع مہیا کرتا ہے وہاں بھی کچھ نہ کچھ تفریق باقی رہتی ہے لیکن وہ اتنی زیادہ نہیں ہوتی جتنی پس ماندہ معاشروں میں ہوتی ہے۔

عورتوں کو ذہنی اور سماجی طور پر مَردوں کے برابر لانے کے لئے ضروری ہے کہ سیاسی اور سماجی نظام میں انقلابی تبدیلی لائی جائے۔

عورتوں اور مَردوں کو اکٹھے مل کر کام کرنا ہے اور یہ اُسی صورت میں ممکن ہے جب عورتوں کے حقوق کی جدوجہد صرف ایک چھوٹے سے مراعات یافتہ طبقے تک محدود نہ ہو بلکہ پوری آبادی کی طرف سے ایک عوامی سیاسی جدوجہد کی صورت اختیار کرلے۔ گھروں میں بند رہنے والی عورتیں تبھی آزاد ہو سکتی ہیں جب وہ سیاسی تحریکوں میں حصّہ لیں۔ سیاسی نظام ایک بہت بنیادی چیز ہے اور باقی ہر چیز اس سے وابستہ ہے۔ ایک پس ماندہ اور بے انصافی پر مبنی نظام کو بدلے بغیر آپ کچھ تبدیلی نہیں لا سکتے۔ سیاسی نظام ہی دراصل سماجی نظام ہے مثلاً ناخواندگی کو ہی لیجئے۔ دنیا بھر میں کسی جگہ بھی آج تک یہ نہیں ہوا کہ ایک وسیع ترین سیاسی تحریک کے بغیر ناخواندگی دور ہوئی ہو پھر سیاسی جدوجہد کے بغیر سیاسی تحریک نہیں چل سکتی۔ اسی تحریک سے خواندگی پروان چڑھے گی۔ سیاسی نظام کی خرابیوں کے اثرات سے معاشیات بھی محفوظ نہیں۔ مسائل سے بھرپور انداز میں فائدہ اٹھانے کے لئے ضروری ہے کہ لوگ اپنی جدوجہد جاری رکھنا چاہتے ہوں۔ اِس وقت ہمارے یہاں زیادہ تر وسائل چند لوگوں کے ہاتھ میں ہیں۔ اِسی لئے عوام کی صلاحیتوں کو پوری طرح استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ کوئی بھی انقلاب بلاوجہ برپا نہیں ہوتا۔ یہ ناانصافی کے خلاف ایک رَدِّعمل کے طور پر ابھرتا ہے، کیوبا کی مثال لیں۔ وہاں ۷۰ فیصد ناخواندگی تھی۔ کوئی صحتِ عامّہ کا نظام نہیں تھا وہاں کی نئی قیادت نے انقلاب کے بعد ہی ان سارے مسائل سے نبٹنا شروع کیا۔ سماجی نظام کو بدلنا بہت ضروری ہے۔ اس کے بغیر ہم کسی ایک مسئلے کو علیحدہ سے حل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے مثلاً فیملی پلاننگ کو تعلیم اور ادویات کے بغیر رائج نہیں کیا جا سکتا۔ بھارت میں لازمی فیملی پلاننگ ناکام ہو گئی بلکہ اندرا کو اس سے انتخاب میں نقصان اٹھانا پڑا جبکہ چین میں فیملی پلاننگ کامیاب رہی۔ عورتوں کو مَردوں کے شانہ بشانہ ترقی کی جدوجہد میں حصہ لینا چاہیئے خاص طور پر ملازمت پیشہ خواتین کو سمجھ لینا چاہیئے کہ ان کی کاوشوں سے ہی حالات کی بہتری کی کوئی صورت نکل سکتی ہے۔ عورتوں اور مَردوں کو الگ الگ خانوں میں نہیں بانٹا جا سکتا۔ جب تک مَردوں کو سماجی نظام میں انصاف نہیں ملے گا عورتیں بھی اس سے محروم رہیں گی۔

منتخب کلام

انتخاب

سارے سخن ہمارے
نقشِ فریادی
دستِ صبا
زنداں نامہ
دستِ تہہ سنگ
سرِ وادیِ سینا
شامِ شہرِ یاراں
مرے دل مرے مسافر
غبارِ ایام

انتساب

آج کے نام

اور

آج کے غم کے نام

آج کا غم کہ ہے زندگی کے بھرے گلستاں سے خفا

زرد پتوں کا بن

زرد پتوں کا بن جو مرا دیس ہے

درد کی انجمن جو مرا دیس ہے

کلرکوں کی افسردہ جانوں کے نام

کرم خوردہ دلوں اور زبانوں کے نام

پوسٹ مینوں کے نام

تانگے والوں کے نام

ریل بانوں کے نام

کارخانوں کے بھوکے جیالوں کے نام

بادشاہِ جہاں، والیِ ماسوا، نائب اللہ فی الارض

دہقاں کے نام

جس کے ڈھوروں کو ظالم ہنکا لے گئے

جن کی بیٹی کو ڈاکو اٹھا لے گئے

ہاتھ بھر کھیت سے ایک انگشت پٹوار نے کاٹ لی

دوسری مالیے کے بہانے سے سرکار نے کاٹ لی

جن کی پگ زور والوں کے پاؤں تلے

دھجیاں ہو گئی

اُن دکھی ماؤں کے نام

رات میں جن کے بچے بلکتے ہیں اور

نیند کی مار کھائے ہوئے بازوؤں سے سنبھلتے نہیں

دکھ بتاتے نہیں

منتوں زاریوں سے بہلتے نہیں

ان حسیناؤں کے نام

جن کی آنکھوں کے گل

چلمنوں اور دریچوں کی بیلوں پہ بیکار کھل کھل کے

مرجھا گئے

اُن بیاہتاؤں کے نام

جن کے بدن

بے محبت ریاکار سیجوں پہ سج سج کے اکتا گئے

بیواؤں کے نام

کٹڑیوں اور گلیوں محلوں کے نام

جن کی ناپاک خاشاک سے چاند

راتوں کو آ آ کے کرتا ہے اکثر وضو

جن کے سایوں میں کرتی ہے آہ و بکا

آنچلوں کی حنا

چوڑیوں کی کھنک

کاکلوں کی مہک

آرزومند سینوں کی اپنے پسینے میں جلنے کی بو

پڑھنے والوں کے نام

وہ جو اصحابِ طبل و علم

کے دروں پر کتاب اور قلم

کا تقاضا لئے ہاتھ پھیلائے پہنچے

اور لوٹ کر گھر نہ آئے

وہ معصوم جو بھولپن میں

وہاں اپنے ننھے چراغوں میں لو کی لگن

لے کے پہنچے جہاں

بٹ رہے تھے گھٹا ٹوپ بے انت راتوں کے سائے

اُن اسیروں کے نام

جن کے سینوں میں فردا کے شبتاب گوہر

قید خانوں کی شوریدہ راتوں کی صرصر میں

جل جل کے انجم نما ہو گئے

آنے والے دنوں کے سفیروں کے نام

وہ جو خوشبوئے گُل کی طرح

اپنے پیغام پر خود فدا ہو گئے

منیر احمد منیر (ناقل)

میر تقی میر کے مشہور ۲، اشعار اُن کے '۲، نشتر' کہے جاتے ہیں اور اپنی مقبولیت اور اثر آفرینی کی وجہ سے اُردو غزل کی آبرو مانے جاتے ہیں۔ فیض احمد فیض کے ۲، نشتر بھی اُردو شاعری میں اپنی جگہ بنا چکے ہیں۔

۲، نشتر

رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے
جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آجائے

●

اپنی تکمیل کر رہا ہوں میں
ورنہ تجھ سے تو مجھ کو پیار نہیں

●

فریبِ آرزو کی سہل انگاری نہیں جاتی
ہم اپنے دل کی دھڑکن کو تری آوازِ پا سمجھے

●

ایک تری دید چھن گئی مجھ سے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں باقی

●

ویراں ہے مے کدہ خم و ساغر اداس ہیں
تم کیا گئے کہ رُوٹھ گئے دن بہار کے
اِک فرصتِ گناہ مِلی وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے

●

نہ جانے کس لئے اُمیدوار بیٹھا ہوں
اِک ایسی راہ پہ جو تری رہگزر بھی نہیں

فیض احمد فیض

فیض احمد فیض کا کلام
ان کی اپنی تحریر میں

آج شب کوئی نہیں ہے

آج شب دل کے قریں کوئی نہیں ہے
آنکھ سے دور طلسمات کے در وا ہیں کئی
خواب در خواب محلات کے در وا ہیں کئی
اور مکیں کوئی نہیں ہے
آج شب دل کے قریں کوئی نہیں ہے
کوئی نغمہ، کوئی خوشبو، کوئی کافر صورت
کوئی امید، کوئی آس مسافر صورت
کوئی غم، کوئی کسک، کوئی شک، کوئی یقیں
کوئی نہیں ہے
آج شب دل کے قریں ...
تم اگر ہو تو مرے پاس ہو یا دور ہو تم
ہر گھڑی سایہ گرِ خاطرِ رنجور ہو تم
اور نہیں ہے [illegible] کوئی نہیں ہے
آج شب دل کے قریں کوئی نہیں

نہیں جاتی متاعِ لعل و گوہر کی گراں یابی
متاعِ غیرت و ایماں کی ارزانی نہیں جاتی

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

●

ہوتی ہے حضرتِ ناصح سے گفتگو جس شب
وہ شب ضرور سرِ کوئے یار گزری ہے
وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات اُن کو بہت ناگوار گزری ہے

●

صبا نے پھر درِ زنداں پہ آکے دی دستک
سحر قریب ہے دل سے کہو نہ گھبرائے

●

رنگ پیراہن کا، خوشبو زلف لہرانے کا نام
موسمِ گُل ہے تمہارے بام پر آنے کا نام

●

روش روش کہیں بہار کے اِمکاں ہوئے تو ہیں
گلشن میں چاک چند گریباں ہوئے تو ہیں

●

ہم نے جو طرزِ فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
فیضؔ گلشن میں وہی طرزِ بیاں ٹھہری ہے

●

آئے تو یوں کہ جیسے ہمیشہ تھے مہرباں
بھولے تو یوں کہ گویا کبھی آشنا نہ تھے

●

ہم پہ گزری سو گزری مگر شبِ ہجراں
ہمارے اشک تری عاقبت سنوار چلے
مقامِ فیضؔ کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

●

تری اُمید ترا انتظار جب سے ہے
نہ شب کو دن سے شکایت نہ دن کو شب سے ہے

●

ہر صبحِ گلستاں ہے ترا روئے بہاریں
ہر پھول تری یاد کا نقشِ کفِ پا ہے
ہر بھیگی ہوئی رات تری زلف کی شبنم
ڈھلتا ہوا سورج ترے ہونٹوں کی فضا ہے
ہر راہ پہنچتی ہے تری چاہ کے در تک
ہر حرفِ تمنا ترے قدموں کی صدا ہے

●

وہ تیرگی ہے رہِ بُتاں میں چراغِ رُخ ہے نہ شمعِ وعدہ
کرن کوئی آرزو کی لاؤ کہ سب درو بام بجھ گئے ہیں
بہار اب آکے کیا کرے گی کہ جن سے تھا جشنِ رنگ و نغمہ
وہ گُل سرِ شاخ جل گئے ہیں وہ دل تہِ دام بجھ گئے ہیں

●

مِٹ جائے گی مخلوق تو انصاف کرو گے
منصف ہو تو اب حشر اٹھا کیوں نہیں دیتے

●

دل و جان فدا ئے راہ کبھی آکے دیکھ ہمدم
سرِ کوئے دل فگاراں شبِ آرزو کا عالم
یہ عجب قیامتیں ہیں تری رہ گزر میں گزراں
نہ ہوا کہ مر مٹیں ہم، نہ ہوا کہ جی اُٹھیں ہم
لو سُنی گئی ہماری، یوں پھرے ہیں دن کہ پھر سے
وہی گوشۂ قفس ہے، وہی فصلِ گُل کا ماتم

●

نہ سوالِ وصل، نہ عرضِ غم، نہ حکایتیں نہ شکایتیں

ترے عہد میں دلِ زار کے سبھی اختیار چلے گئے
یہ ہمیں تھے جن کے لباس پر سرِ رہ سیاہی لکھی گئی
یہی داغ تھے جو سجا کے ہم سرِ بزمِ یار چلے گئے
نہ رہا جنونِ رُخِ وفا، یہ رسن یہ دار کرو گے کیا
جنہیں جرمِ عشق پہ ناز تھا وہ گناہ گار چلے گئے

●

کرو کج جبیں پہ سرِ کفن مرے قاتلوں کو گماں نہ ہو
کہ غرورِ عشق کا بانکپن پسِ مرگ ہم نے بھلا دیا
جو رکے تو کوہِ گراں تھے ہم جو چلے تو جاں سے گزر گئے
رہِ یار ہم نے قدم قدم تجھے یادگار بنا دیا

●

مے خانے میں عاجز ہوئے آزردہ دلی سے
مسجد کا نہ رکھا ہمیں آشفتہ سری نے

●

زنداں زنداں شورِ انا الحق، محفل محفل قلقلِ مے
خونِ تمنا دریا دریا، دریا دریا عیش کی لہر
دامن دامن رُت پھولوں کی، آنچل آنچل اشکوں کی
قریہ قریہ جشن بپا ہے، ماتم شہر بہ شہر

●

سو پیکاں تھے پیوستِ گلو جب چھیڑی شوق کی لے ہم نے

●

سو تیر ترازو تھے دل میں جب ہم نے رقص آغاز کیا
جس خاک میں مل کر خاک ہوئے وہ سرمۂ چشمِ خلق بنی
جس خار پہ ہم نے خوں چھڑکا ہم رنگِ گلِ طناز کیا
لو وصل کی ساعت آ پہنچی پھر حکمِ حضوری پر ہم نے
آنکھوں کے دریچے بند کیے اور سینے کا در باز کیا

گھر رہیے تو ویرانیٔ دل کھانے کو آوے
رہ چلیے تو ہر گام پہ غوغائے سگاں ہے
یاں اہلِ جنوں یک بہ دگر دست و گریباں
واں جیشِ ہوس تیغ بکف درپئے جاں ہے

●

کئے آرزو سے پیماں جو مآل تک نہ پہنچے
شب و روزِ آشنائی مہ و سال تک نہ پہنچے
کفِ باغباں پہ بہارِ گل ہے قرض پہلے سے بیشتر
کہ ہر ایک پھول کے پیرہن میں نمود میرے لہو کی ہے

●

شرحِ بے دردیٔ حالات نہ ہونے پائی
اب کے بھی دل کی مدارات نہ ہونے پائی

●

کہیں تو کاروانِ درد کی منزل ٹھہر جائے
کنارے آ لگے عمرِ رواں یا دل ٹھہر جائے

●

عمرِ جاوید کی دُعا کرتے
فیضؔ اتنے وہ کب ہمارے تھے

●

جُدا تھے ہم تو میسر تھیں قربتیں کتنی
بہم ہوئے تو پڑی ہیں جُدائیاں کیا کیا

●

تھے بہت بے درد لمحے ختمِ دردِ عشق کے
تھیں بہت بے مہر صبحیں مہرباں راتوں کے بعد

●

یہ برہمن کا کرم، وہ عطائے شیخِ حرم
کبھی حیات کبھی مے حرام ہوتی رہی

تجھے پکارا ہے بے ارادہ
جو دِل دُکھا ہے بہت زیادہ

●

خوشا کہ آج ہر اک مدّعی کے لب پر ہے
وہ راز جس نے ہمیں راندۂ زمانہ کیا

●

وہ بُتوں نے ڈالے ہیں وسوسے کہ دلوں سے خوفِ خدا گیا
وہ پڑی ہیں روزِ قیامتیں کہ خیالِ روزِ جزا گیا
جو نفس تھا خارِ گلو بنا، جو اُٹھے تھے ہاتھ لہو ہوئے
وہ نشاطِ آہِ سحر گئی، وہ وقارِ دستِ دُعا گیا
جو طلب پہ عہدِ وفا کیا، تو وہ قدرِ رسمِ وفا گئی
سرِ عام جب ہوئے مدّعی، تو ثوابِ صدق و صفا گیا

●

حیراں ہے جبیں آج کدھر سجدہ روا ہے
سر پہ ہیں خداوند سرِ عرش خدا ہے

●

چاند سے ماند ستاروں نے کہا آخرِ شب
کون کرتا ہے وفا عہدِ وفا آخرِ شب
لمسِ جانانہ لیے مستیِ پیمانہ لیے
حمدِ باری کو اُٹھے دستِ دعا آخرِ شب

●

آخر کو آج اپنے لہو پر ہوئی تمام
بازیِ میانِ قاتل و خنجر لگی ہوئی

●

یہ سخن جو ہم نے رقم کئے یہ ہیں سب ورق تری یاد کے
کوئی لمحہ صبحِ وصال کا، کئی شامِ ہجر کی مدّتیں

اب کے برس دستورِ ستم میں کیا کیا باب ایزاد ہوئے
جو قاتل تھے مقتول ہوئے جو صید تھے اب صیاد ہوئے

●

ہر اک شب ہر گھڑی گزرے قیامت یوں تو ہوتا ہے
مگر ہر صبح ہو روزِ جزا ایسے نہیں ہوتا

●

نہیں نگاہ میں منزل تو جستجو ہی سہی
نہیں وصال میسّر تو آرزو ہی سہی
نہ تن میں خون فراہم نہ اشک آنکھوں میں
نمازِ شوق تو واجب ہے بے وضو ہی سہی
دیارِ غیر میں محرم اگر نہیں کوئی
تو فیضؔ ذکرِ وطن اپنے روبرو ہی سہی

●

جس دھجی کو گلیوں میں لیے پھرتے ہیں طفلاں
یہ میرا گریباں ہے کہ لشکر کا علم ہے

●

صحرا پہ لگے پہرے اور قفل پڑے بن پر
اب شہر بدر ہو کر دیوانہ کدھر جائے

●

ہم شیخ نہ لیڈر نہ مصاحب نہ صحافی
جو خود نہیں کرتے وہ ہدایت نہ کریں گے

●

تھک کر یونہی پل بھر کے لئے آنکھ لگی تھی
سو کر ہی نہ اٹھیں یہ ارادہ تو نہیں تھا

●

ہر خارِ رہِ دشتِ وطن کا ہے سوالی
کب دیکھیے آتا ہے کوئی آبلہ پا اور

●●

برو اے عقل و مہنہ منطق و حکمت دَر پیش
کہ مرا نسخۂ غمہائے فلاں در پیش است

(عُرفی)

”دِلے بفروختم، جانے خریدم“

(نظامی)

ایک منظر

بام و در خاموشی کے بوجھ سے چور
آسمانوں سے جوئے درد رواں
چاند کا دکھ بھرا فسانۂ نور
شاہراہوں کی خاک میں غلطاں
خواب گاہوں میں نیم تاریکی
مضمحل لَے ربابِ ہستی کی
ہلکے ہلکے سُروں میں نوحہ کُناں

●

سرود

موت اپنی، نہ عمل اپنا، نہ جینا اپنا
کھو گیا شورشِ گیتی میں قرینا اپنا

ناخدا دُور ہَوا تیز، قریں کامِ نہنگ
وقت ہے، پھینک دے لہروں میں سفینا اپنا

عرصۂ دہر کے ہنگامے تہِ خواب سہی
گرم رکھ آتشِ پیکار سے سینا اپنا

ساقیا رنج نہ کر جاگ اٹھے گی محفل
اور کچھ دیر اُٹھا رکھتے ہیں پینا اپنا

بیش قیمت ہیں یہ غمہائے محبت مت بھول
ظلمتِ یاس کو مت سونپ قرینا اپنا

عشق منت کشِ قرار نہیں
حُسن مجبورِ انتظار نہیں
تیری رنجش کی انتہا معلوم!
حسرتوں کا مِری شمار نہیں
اپنی نظریں بکھیر دے ساقی
مے باندازۂ خُمار نہیں
زیرِ لب ہے ابھی تبسم دوست
منتشر جلوۂ بہار نہیں
اپنی تکمیل کر رہا ہوں میں
ورنہ تجھ سے تو مجھ کو پیار نہیں
چارۂ انتظار کون کرے
تیری نفرت بھی استوار نہیں
فیض زندہ رہیں، وہ ہیں تو سہی
کیا ہوا گر وفا شعار نہیں

حسن اور موت

جو پھول سارے گلستاں میں سب سے اچھا ہو
فروغِ نور ہو جس سے فضائے رنگیں میں

خزاں کے جور و ستم کو نہ جس نے دیکھا ہو
بہار نے جسے خونِ جگر سے پالا ہو
وہ ایک پھول سماتا ہے چشمِ گلچیں میں

ہزار پھولوں سے آباد باغ ہستی ہے
اجل کی آنکھ فقط ایک کو ترستی ہے

کئی دلوں کی امیدوں کا جو سہارا ہو
فضائے دہر کی آلودگی سے بالا ہو
جہاں میں آکے ابھی جس نے کچھ نہ دیکھا ہو

نہ قحطِ عیش و مسرت، نہ غم کی ارزانی
کنارِ رحمتِ حق میں اسے سلاتی ہے
سکوتِ شب میں فرشتوں کی مرثیہ خوانی

طواف کرنے کو صبحِ بہار آتی ہے
صبا چڑھانے کو جنت کے پھول لاتی ہے

خدا وہ وقت نہ لائے ....

خدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہو تو
سکوں کی نیند تجھے بھی حرام ہو جائے
تری مسرتِ پیہم تمام ہو جائے
تری حیات تجھے تلخ جام ہو جائے
غموں سے آئینۂ دل گداز ہو جائے
ہجومِ یاس سے بیتاب ہو کے رہ جائے
وفورِ درد سے سیماب ہو کے رہ جائے
ترا شباب فقط خواب ہو کے رہ جائے
غرورِ حسن سراپا نیاز ہو جائے
طویل راتوں میں تو بھی قرار کو ترسے
تری نگاہ کسی غمگسار کو ترسے
خزاں رسیدہ تمنا بہار کو ترسے
کوئی جبیں نہ ترے سنگِ آستاں پہ جھکے
کہ جنسِ عجز و عقیدت سے تجھ کو شاد کرے
فریبِ وعدۂ فردا پہ اعتماد کرے
خدا وہ وقت نہ لائے کہ تجھ کو یاد آئے
وہ دل کہ تیرے لئے بیقرار اب بھی ہے
وہ آنکھ جس کو ترا انتظار اب بھی ہے

اشعار

رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے

جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آجائے

۲

دل رہینِ غمِ جہاں ہے آج
ہر نفس تشنۂ فغاں ہے آج

سخت ویراں ہے محفلِ ہستی
اے غمِ دوست! تو کہاں ہے آج

اداے حسن کی معصومیت کو کم کر دے
گناہ گارِ نظر کو حجاب آتا ہے

میں دل فگار نہیں، تو ستم شعار نہیں
بہت دنوں سے مجھے تیرا انتظار نہیں
ترا ہی عکس ہے ان اجنبی بہاروں میں
جو تیرے لب، ترے بازو، ترا کنار نہیں

حسن مرہونِ جوشِ بادۂ ناز
عشق منت کشِ فسونِ نیاز
دل کا ہر تار لرزشِ پیہم
جاں کا ہر رشتہ وقفِ سوز و گداز
سوزشِ دردِ دل کسے معلوم!
کون جانے کسی کے عشق کا راز
میری خاموشیوں میں لرزاں ہے
میرے نالوں کی گمشدہ آواز
ہو چکا عشق، اب ہوس ہی سہی
کیا کریں فرض ہے اداے نماز
تو ہے اور اک تغافلِ پیہم
میں ہوں اور انتظارِ بے انداز
خوفِ ناکامیٔ امید ہے فیضؔ
ورنہ دل توڑ دے طلسمِ مجاز

انتہائے کار

پندار کے خوگر کو
ناکام بھی دیکھو گے
آغاز سے واقف ہو
انجام بھی دیکھو گے
رنگینیٔ دنیا سے
مایوس سا ہو جانا
دکھتا ہوا دل لے کر
تنہائی میں کھو جانا
ترسی ہوئی نظروں کو
حسرت سے جھکا لینا
فریاد کے ٹکڑوں کو
آہوں میں چھپا لینا
راتوں کی خموشی میں
چھپ کر کبھی رو لینا
مجبور جوانی کے
ملبوس کو دھو لینا
جذبات کی وسعت کو
سجدوں سے بسا لینا
بھولی ہوئی یادوں کو
سینے سے لگا لینا

راز الفت چھپا کے دیکھ لیا
دل بہت کچھ جلا کے دیکھ لیا

اور کیا دیکھنے کو باقی ہے
آپ سے دل لگا کے دیکھ لیا

وہ مرے ہو کے بھی مرے نہ ہوئے
ان کو اپنا بنا کے دیکھ لیا

آج ان کی نظر میں کچھ ہم نے
سب کی نظریں بچا کے دیکھ لیا

فیضؔ تکمیل غم بھی ہو نہ سکی
عشق کو آزما کے دیکھ لیا

●

ہمت التجا نہیں باقی
ضبط کا حوصلہ نہیں باقی
اک تری دید چھن گئی مجھ سے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں باقی
اپنی مشق ستم سے ہاتھ نہ کھینچ
میں نہیں یا وفا نہیں باقی
تیری چشم الم نواز کی خیر
دل میں کوئی گلہ نہیں باقی
ہو چکا ختم عہد ہجر و وصال
زندگی میں مزا نہیں باقی

حسن اور موت

دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے
وہ جا رہا ہے کوئی شب غم گزار کے
ویراں ہے میکدہ، خم و ساغر اداس ہیں
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے
اک فرصت گناہ ملی، وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے
دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے
بھولے سے مسکرا تو دیے تھے وہ آج فیضؔ
مت پوچھ ولولے دل ناکردہ کار کے

●

چشم میگوں ذرا ادھر کر دے
دست قدرت کو بے اثر کر دے
تیز ہے آج درد دل ساقی
تلخی مے کو تیز تر کر دے
جوش وحشت ہے تشنہ کام ابھی
چاک دامن کو تا جگر کر دے
میری قسمت سے کھیلنے والے
مجھ کو قسمت سے بے خبر کر دے
لٹ رہی ہے مری متاع نیاز
کاش وہ اس طرف نظر کر دے
فیضؔ تکمیل آرزو معلوم
ہو سکے تو یونہی بسر کر دے

اقبال

آیا ہمارے دیس میں اک خوش نوا فقیر
آیا اور اپنی دھن میں غزلخواں گزر گیا
سنسان راہیں خلق سے آباد ہو گئیں
ویران میکدوں کا نصیبہ سنور گیا
تھیں چند ہی نگاہیں جو اس تک پہنچ سکیں
پر اس کا گیت سب کے دلوں میں اتر گیا
اب دور جا چکا ہے وہ شاہِ گدا نما
اور پھر سے اپنے دیس کی راہیں اداس ہیں
چند اک کو یاد ہے کوئی اس کی ادائے خاص
دو اک نگاہیں چند عزیزوں کے پاس ہیں
پر اس کا گیت سب کے دلوں میں مقیم ہے
اور اس کی لے سے سینکڑوں لذت شناس ہیں

آج کی رات

آج کی رات سازِ درد نہ چھیڑ
دکھ سے بھرپور دن تمام ہوئے — اور کل کی خبر کسے معلوم؟
دوش و فردا کی مٹ چکی ہیں حدود — ہو نہ ہو اب سحر کسے معلوم؟
زندگی ہیچ! لیکن آج کی رات
ایزدیت ہے ممکن آج کی رات
آج کی رات سازِ درد نہ چھیڑ!
اب نہ دہرا فسانہ ہائے الم — اپنی قسمت پہ سوگوار نہ ہو
فکرِ فردا اتار دے دل سے — عمرِ رفتہ پہ اشکبار نہ ہو
عہدِ غم کی حکایتیں مت پوچھ
ہو چکیں سب شکایتیں مت پوچھ
آج کی رات سازِ درد نہ چھیڑ!

مجھ سے پہلی محبت مرے محبوب نہ مانگ

مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ
میں نے سمجھا تھا کہ تو ہے تو درخشاں ہے حیات
تیرا غم ہے تو غمِ دہر کا جھگڑا کیا ہے
تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات
تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے
تو جو مل جائے تو تقدیر نگوں ہو جائے
یوں نہ تھا، میں نے فقط چاہا تھا یوں ہو جائے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
ان گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم!
ریشم و اطلس و کمخواب میں بنوائے ہوئے
جابجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم!
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے
جسم نکلے ہوئے امراض کے تنوروں سے
پیپ بہتی ہوئی گلتے ہوئے ناسوروں سے
لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجے
اب بھی دلکش ہے ترا حسن، مگر کیا کیجے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ

ایک رہگذر پر

وہ جس کی دید میں لاکھوں مسرتیں پنہاں
وہ حسن جس کی تمنا میں جنتیں پنہاں

ہزار فتنے تہِ پائے ناز خاک نشیں
ہر اک نگاہ خمارِ شباب سے رنگیں

شباب، جس سے تخیل پہ بجلیاں برسیں
وقار جس کی رفاقت کو شوخیاں ترسیں

ادائے لغزشِ پا پہ قیامتیں قرباں
بیاضِ رُخ پہ سحر کی صباحتیں قرباں

سیاہ زلفوں میں وارفتہ نکہتوں کا ہجوم
طویل راتوں کی خوابیدہ راحتوں کا ہجوم

وہ آنکھ جس کے بناؤ پہ خالق اترائے
زبانِ شعر کو تعریف کرتے شرم آئے

وہ ہونٹ فیض سے جن کے بہارِ لالہ فروش
بہشت و کوثر و تسنیم و سلسبیل بدوش

گداز جسم قبا جس پہ سج کے ناز کرے
دراز قد جسے سروِ سہی نماز کرے

غرض وہ حُسن جو محتاجِ وصف و نام نہیں
وہ حُسن جس کا تصور بشر کا کام نہیں

کِسی زمانے میں اس رہگذر سے گزرا تھا
بہ صد غرور و تجمل، ادھر سے گزرا تھا

اور اب یہ راہگذر بھی ہے دلفریب و حسیں
ہے اس کی خاک میں کیفِ شراب و شعر مکیں

ہوا میں شوخیِ رفتار کی ادائیں ہیں
فضا میں نرمیِ گفتار کی صدائیں ہیں

غرض وہ حسن اب اس جا کا جزوِ منظر ہے
نیازِ عشق کو اک سجدہ گہ میسر ہے

مری جاں اب بھی اپنا حُسن واپس پھیر دے مجھ کو

مری جاں اب بھی اپنا حُسن واپس پھیر دے مجھ کو!
ابھی تک دل میں تیرے عشق کی قندیل روشن ہے
ترے جلوؤں سے بزم زندگی جنّت بہ دامن ہے
مری روح اب بھی تنہائی میں تجھ کو یاد کرتی ہے
ہر اک تارِ نفس میں آرزو بیدار ہے اب بھی
ہر اک بے رنگ ساعت منتظر ہے تیری آمد کی
نگاہیں بچھ رہی ہیں، راستہ زرکار ہے اب بھی
مگر جانِ حزیں صدمے سہے گی آخرش کب تک؟
تری بے مہریوں پر جان دے گی آخرش کب تک؟
تری آواز میں سوئی ہوئی شیرینیاں آخر
مرے دِل کی فسردہ خلوتوں میں جا نہ پائیں گی
یہ اشکوں کی فراوانی سے دُھندلائی ہوئی آنکھیں
تری رعنائیوں کی تمکنت کو بھول جائیں گی
پُکاریں گے تجھے تو لب کوئی لذت نہ پائیں گے
گلوؤں میں تیری اُلفت کے ترانے سُوکھ جائیں گے
مبادا یاد ہائے عہد ماضی محو ہو جائیں
یہ پارینہ فسانے موجہائے غم میں کھو جائیں
مرے دل کی تہوں سے تیری صورت ڈھل کے بہ جائے
حریم عشق کی شمع درخشاں بجھ کے رہ جائے
مبادا اجنبی دُنیا کی ظلمت گھیر لے تجھ کو
مری جاں اب بھی اپنا حُسن واپس پھیر دے مجھ کو!

مرگِ سوزِ محبّت

آؤ کہ مرگِ سوزِ محبت منائیں ہم
آؤ کہ حسنِ ماہ سے دِل کو جلائیں ہم
خوش ہوں فراقِ قامت و رخسارِ یار سے
سرو و گل و سمن سے نظر کو ستائیں ہم
ویرانیِ حیات کو ویران تر کریں
لے ناصح آج تیرا کہا مان جائیں ہم
پھر اوٹ لے کے دامنِ ابرِ بہار کی
دل کو منائیں ہم، کبھی آنسو بہائیں ہم
سُلجھائیں بے دِلی سے یہ اُلجھے ہوئے سوال
واں جائیں یا نہ جائیں، نہ جائیں کہ جائیں ہم
پھر دل کو پاسِ ضبط کی تلقین کر چکیں
اور امتحانِ ضبط سے پھر جی چرائیں ہم

آؤ کہ آج ختم ہوئی داستانِ عشق
اب ختم عاشقی کے فسانے سنائیں ہم

حسینۂ خیال سے

مجھے دے دے
رسیلے ہونٹ، معصومانہ پیشانی، حسیں آنکھیں
کہ میں اک بار پھر رنگینیوں میں غرق ہو جاؤں
مری ہستی کو تیری اک نظر آغوش میں لے لے
ہمیشہ کے لئے اس دام میں محفوظ ہو جاؤں
ضیائے حُسن سے ظلماتِ دُنیا میں نہ پھر آؤں
گزشتہ حسرتوں کے داغ میرے دِل سے دُھل جائیں
میں آنے والے غم کی فکر سے آزاد ہو جاؤں
مِرے ماضی و مستقبل سراسر محو ہو جائیں
مجھے وہ اک نظر اک جاودانی سی نظر دے دے
(براؤننگ)

●

پھر لوٹا ہے خورشیدِ جہانتاب سفر سے
پھر نورِ سحر دست و گریباں ہے سحر سے

پھر آگ بھڑکنے لگی ہر سازِ طرب میں
پھر شعلے لپکنے لگے ہر دیدۂ تر سے

پھر نکلا ہے دیوانہ کوئی پھونک کے گھر کو
کچھ کہتی ہے ہر راہ ہر اک راہگذر سے

وہ رنگ ہے امسال گلستاں کی فضا کا
اوجھل ہوئی دیوارِ قفس حدِّ نظر سے

ساغر تو کھنکتے ہیں شراب آئے نہ آئے
بادل تو گرجتے ہیں گھٹا برسے نہ برسے

پاپوش کی کیا فکر ہے، دستار سنبھالو
پایاب ہے جو موج گزر جائے گی سر سے

●

وفائے وعدہ نہیں، وعدۂ دگر بھی نہیں
وہ مجھ سے روٹھے تو تھے لیکن اس قدر بھی نہیں

برس رہی ہے حریمِ ہوس میں دولتِ حُسن
گدائے عشق کے کاسے میں اک نظر بھی نہیں

نہ جانے کس لئے اُمیدوار بیٹھا ہوں
اک ایسی راہ پہ جو تیری رہگذر بھی نہیں

نگاہِ شوق سرِ بزم بے حجاب نہ ہو
وہ بے خبر ہی سہی، اتنے بے خبر بھی نہیں

یہ عہدِ ترکِ محبت ہے کس لئے آخر
سکونِ قلب اِدھر بھی نہیں اُدھر بھی نہیں

تنہائی

پھر کوئی آیا دلِ زار! نہیں کوئی نہیں
راہرو ہوگا، کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات، بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہگذار
اجنبی خاک نے دھندلا دیئے قدموں کے سراغ
گل کرو شمعیں، بڑھا دو مے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفّل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا

انجام

ہیں لبریز آہوں سے ٹھنڈی ہوائیں
اُداسی میں ڈوبی ہوئی ہیں گھٹائیں
محبت کی دنیا پہ شام آچکی ہے
سیہ پوش ہیں زندگی کی فضائیں
مچلتی ہیں سینے میں لاکھ آرزوئیں
تڑپتی ہیں آنکھوں میں لاکھ التجائیں
تغافل کے آغوش میں سو رہے ہیں
تمہارے ستم اور میری وفائیں
مگر پھر بھی اے میرے معصوم قاتل
تمہیں پیار کرتی ہیں، میری دُعائیں

●

ہر حقیقت ، مجاز ہو جائے
کافروں کی نماز ہو جائے
دل رہین نیاز ہو جائے
بے کسی کارساز ہو جائے
منتِ چارہ ساز کون کرے
درد جب جاں نواز ہو جائے
عشق دِل میں رہے تو رسوا ہو
لب پہ آئے تو راز ہو جائے
لُطف کا انتظار کرتا ہوں
جَور تا حدِ ناز ہو جائے
عمر بے سود کٹ رہی ہے فیضؔ
کاش افشائے راز ہو جائے

سرودِ شبانہ

گم ہے اک کیف میں فضائے حیات
خامشی سجدہ نیاز میں ہے
حسن معصوم خواب ناز میں ہے

اے کہ تو رنگ و بو کا طوفان ہے
اے کہ تو جلوہ گر بہار میں ہے
زندگی تیرے اختیار میں ہے

پھول لاکھوں برس نہیں رہتے
دو گھڑی اور ہے بہارِ شباب
آ کہ کچھ دل کی سن سنا لیں ہم
آ، محبت کے گیت گا لیں ہم

میری تنہائیوں پہ شام رہے؟
حسرتِ دید نا تمام رہے؟
دِل میں بیتاب ہے صدائے حیات
آنکھ گوہر نثار کرتی ہے

آسماں پہ اُداس ہیں تارے
چاندنی انتظار کرتی ہے
آ کہ تھوڑا سا پیار کر لیں ہم
زندگی زرنگار کر لیں ہم

میرے ندیم...

خیال و شعر کی دُنیا میں جان تھی جن سے
فضائے فکر و عمل ارغواں تھی جن سے
وہ جن کے نور سے شاداب تھے مہ و انجم
جنونِ عشق کی ہمت جواں تھی جن سے
وہ آرزوئیں کہاں سو گئی ہیں میرے ندیم!

وہ ناصبور نگاہیں، وہ منتظر راہیں
وہ پاسِ ضبط سے دل میں دبی ہوئی آہیں
وہ انتظار کی راتیں، طویل، تیرہ و تار
وہ نیم خواب شبستاں، وہ مخملیں باہیں
کہانیاں تھیں، کہیں کھو گئی ہیں میرے ندیم!

مچل رہا ہے رگِ زندگی میں خونِ بہار
اُلجھ رہے ہیں پُرانے غموں سے روح کے تار
چلو کہ چل کے چراغاں کریں دیارِ حبیب
ہیں انتظار میں اگلی محبتوں کے مزار
محبتیں جو فنا ہو گئی ہیں میرے ندیم!

بول...

بول، کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول، زباں اب تک تیری ہے
تیرا ستواں جسم ہے تیرا
بول کہ جاں اب تک تیری ہے
دیکھ کہ آہنگر کی دکاں میں
تند ہیں شعلے، سُرخ ہے آہن
کھلنے لگے قفلوں کے دہانے
پھیلا ہر اک زنجیر کا دامن
بول، یہ تھوڑا وقت بہت ہے
جسم و زباں کی موت سے پہلے
بول، کہ سچ زندہ ہے اب تک
بول، جو کچھ کہنا ہے کہہ لے

●

اس گیت کے تمام محاسن ہیں لازوال
اس کا وفور، اس کا خروش، اس کا سوز و ساز
یہ گیت مثلِ شعلۂ جوالہ تند و تیز
اس کی لپک سے بادِ فنا کا جگر گداز
جیسے چراغ، وحشتِ صرصر سے بے خطر
یا شمعِ بزم، صبح کی آمد سے بے خبر

تہِ نجوم

تہِ نجوم کہیں چاندنی کے دامن میں
ہجومِ شوق سے اِک دل ہے بیقرار ابھی

خمارِ خواب سے لبریز احمریں آنکھیں
سفید رُخ پہ پریشاں عنبریں آنکھیں

چھلک رہی ہے جوانی ہر اک بُنِ مو سے
رواں ہو برگِ گُل تر سے جیسے سیلِ شمیم

ضیائے مہ میں دمکتا ہے رنگِ پیراہن
ادائے عجز سے آنچل اُڑا رہی ہے نسیم

دراز قد کی لچک سے گُداز پیدا ہے
ادائے ناز سے رنگِ نیاز پیدا ہے

اُداس آنکھوں میں خاموش التجائیں ہیں
دلِ حزیں میں کئی جاں بلب دُعائیں ہیں

تہِ نجوم کہیں چاندنی کے دامن میں
کِسی کا حُسن ہے مصروفِ انتظار ابھی

کہیں خیال کے آباد کردہ گُلشن میں
ہے ایک گُل کہ ہے ناواقفِ بہار ابھی

اشعار

وہ عہدِ غم کی کاہشہائے بے حاصل کو کیا سمجھے
جو اُن کی مختصر روداد بھی صبر آزما سمجھے

یہاں وابستگی، واں برہمی، کیا جانیے کیوں ہے؟
نہ ہم اپنی نظر سمجھے، نہ ہم اُن کی ادا سمجھے

فریبِ آرزو کی سہل انگاری نہیں ہوتی
ہم اپنے دل کی دھڑکن کو تری آوازِ پا سمجھے

تمہاری ہر نظر سے منسلک ہے رشتۂ ہستی
مگر یہ دُور کی باتیں کوئی نادان کیا سمجھے

نہ پوچھو عہدِ اُلفت کی بس اک خوابِ پریشاں تھا
نہ دل کو راہ پر لائے نہ دل کا مدعا سمجھے

●

کچھ دن سے انتظارِ سوالِ دگر میں ہے
وہ مضمحل حیا جو کسی کی نظر میں ہے

سیکھی یہیں مرے دلِ کافر نے بندگی
ربِ کریم ہے تو تری رہگذر میں ہے

ماضی میں جو مزا مری شام و سحر میں تھا
اب وہ فقط تصورِ شام و سحر میں ہے

کیا جانیے کس کو کس سے ہے اب داد کی طلب
وہ غم جو میرے دل میں ہے تیری نظر میں ہے

قطعات

وقفِ حرمان و یاس رہتا ہے
دل ہے، اکثر اُداس رہتا ہے
تم تو غم دے کے بھول جاتے ہو
مجھ کو احساں کا پاس رہتا ہے

○

فضائے دل پہ اُداسی بکھرتی جاتی ہے
فسردگی ہے کہ جاں تک اُترتی جاتی ہے
فریبِ زیست سے قدرت کا مدعا معلوم
یہ ہوش ہے کہ جوانی گزرتی جاتی ہے

●

پھر حریفِ بہار ہو بیٹھے
جانے کس کس کو آج رو بیٹھے
تھی، مگر اتنی رائگاں بھی نہ تھی
آج کچھ زندگی سے کھو بیٹھے
تیرے در تک پہنچ کے لوٹ آئے
عشق کی آبرو ڈبو بیٹھے
ساری دُنیا سے دُور ہو جائے
جو ذرا تیرے پاس ہو بیٹھے
نہ گئی تیری بے رُخی نہ گئی
ہم تری آرزو بھی کھو بیٹھے
فیضؔ ہوتا رہے جو ہونا ہے
شعر لکھتے رہا کرو بیٹھے

چند روز اور مری جان!

چند روز اور مری جان! فقط چند ہی روز
ظلم کی چھاؤں میں دم لینے پہ مجبور ہیں ہم
اور کچھ دیر ستم سہہ لیں، تڑپ لیں، رو لیں
اپنے اجداد کی میراث ہے معذور ہیں ہم
جسم پر قید ہے، جذبات پہ زنجیریں ہیں
فکر محبوس ہے، گفتار پہ تعزیریں ہیں
اپنی ہمت ہے کہ ہم پھر بھی جیے جاتے ہیں
زندگی کیا کسی مفلس کی قبا ہے جس میں
ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں
لیکن اب ظلم کی میعاد کے دن تھوڑے ہیں
اک ذرا صبر، کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں
عرصۂ دہر کی جھلسی ہوئی ویرانی میں
ہم کو رہنا ہے، پہ یونہی تو نہیں رہنا ہے
اجنبی ہاتھوں کا بے نام گرانبار ستم
آج سہنا ہے ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے
یہ ترے حسن سے لپٹی ہوئی آلام کی گرد
اپنی دو روزہ جوانی کی شکستوں کا شمار
چاندنی راتوں کا بے کار دہکتا ہوا درد
دل کی بے سود تڑپ، جسم کی مایوس پکار
چند روز اور مری جان! فقط چند ہی روز

تین منظر

تصوّر

شوخیاں مضطر نگاہِ دیدۂ سرشار میں
عشرتیں خوابیدہ رنگِ غازۂ رخسار میں
سُرخ ہونٹوں پر تبسم کی ضیائیں جس طرح
یاسمن کے پھول ڈُوبے ہوں مےِ گلنار میں

سامنا

چھنتی ہوئی نظروں سے جذبات کی دُنیائیں
بے خوابیاں، افسانے، مہتاب، تمنّائیں
کچھ اُلجھی ہوئی باتیں، کچھ بہکے ہوئے نغمے
کچھ اشک جو آنکھوں سے بے وجہ چھلک جائیں

رُخصت

فسردہ رُخ، لبوں پر اک نیاز آمیز خاموشی
تبسّم مضمحل تھا، مرمریں ہاتھوں میں لرزش تھی
وہ کیسی بے کسی تھی تیری پُر تمکیں نگاہوں میں
وہ کیا دُکھ تھا تری سہمی ہوئی خاموش آہوں میں

سرودِ شبانہ

نیم شب، چاند، خود فراموشی
محفلِ ہست و بود ویراں ہے
پیکرِ اِلتجا ہے خاموشی
بزمِ انجم فسردہ ساماں ہے
آبشارِ سکوت جاری ہے
چار سُو بے خودی سی طاری ہے
زندگی جزوِ خواب ہے گویا
ساری دُنیا سراب ہے گویا
سو رہی ہے گھنے درختوں پر
چاندنی کی تھکی ہوئی آواز
کہکشاں نیم وا نگاہوں سے
کہہ رہی ہے حدیثِ شوقِ نیاز
سازِ دل کے خموش تاروں سے
چھن رہا ہے خمارِ کیف آگیں
آرزو، خواب تیرا رُوئے حسیں!

ہم لوگ

دل کے ایواں میں لیے گُل شدہ شمعوں کی قطار
نورِ خورشید سے سہمے ہوئے اُکتائے ہوئے
حسنِ محبوب کے سیّال تصوّر کی طرح
اپنی تاریکی کو بھینچے ہوئے، لپٹائے ہوئے

غایتِ سُود و زیاں، صورتِ آغاز و مآل
وہی بے سود تجسّس، وہی بے کار سوال
مضمحل، ساعتِ امروز کی بے رنگی سے
یادِ ماضی سے غمیں، دہشتِ فردا سے نڈھال

تشنہ افکار، جو تسکین نہیں پاتے ہیں
سوختہ اشک، جو آنکھوں میں نہیں پاتے ہیں
اِک کڑا درد کہ جو گیت میں ڈھلتا ہی نہیں
دل کے تاریک شگافوں سے نکلتا ہی نہیں
اور اِک اُلجھی ہوئی موہوم سی درماں کی تلاش
دشت و زنداں کی ہوس، چاکِ گریباں کی تلاش

صبح کی آج جو رنگت ہے، وہ پہلے تو نہ تھی
کیا خبر آج خراماں سرِ گلزار ہے کون

شام گلنار ہوئی جاتی ہے، دیکھو تو سہی
یہ جو نکلا ہے لیے مشعلِ رُخسار ہے کون؟

رات مہکی ہوئی آئی ہے کہیں سے، پوچھو!
آج بکھرائے ہوئے زلفِ طرحدار ہے کون؟

پھر درِ دل پہ کوئی دیتا ہے رہ رہ دستک
جائیے، پھر دلِ وحشی کا طلبگار ہے کون؟

شاہراہ

ایک افسردہ شاہراہ دراز
دُور افق پر نظر جمائے ہوئے

سرد مٹی پہ، اپنے سینے کے
سرمگیں حُسن کو بچھائے ہوئے

جس طرح کوئی غم زدہ عورت
اپنے ویراں کدے میں محوِ خیال

وصلِ محبوب کے تصوّر میں
مُو بہ مُو چُور، عضو عضو نڈھال

کئی بار اس کا دامن بھر دیا حسنِ دو عالم سے
مگر دل ہے کہ اس کی خانہ ویرانی نہیں جاتی

کئی بار اس کا خاطر ذرّے ذرّے کا جگر چیرا
مگر یہ چشمِ حیراں، جس کی حیرانی نہیں جاتی

نہیں جاتی متاعِ لعل و گوہر کی گراں یابی
متاعِ غیرت و ایماں کی ارزانی نہیں جاتی

مری چشمِ تن آساں کو بصیرت مل گئی جب سے
بہت جانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی

سرِ خسرو سے نازِ کج کلاہی چھن بھی جاتا ہے
کلاہِ خسروی سے بوئے سلطانی نہیں جاتی

بجز دیوانگی، واں اور چارہ ہی کہو کیا ہے؟
جہاں عقل و خرد کی ایک بھی مانی نہیں جاتی

کتّے

یہ گلیوں کے آوارہ بے کار کتے
کہ بخشا گیا جن کو ذوقِ گدائی
زمانے کی پھٹکار، سرمایہ ان کا
جہاں بھر کی دھتکار، ان کی کمائی
نہ آرام شب کو، نہ راحت سویرے
غلاظت میں گھر، نالیوں میں بسیرے
جو بگڑیں تو اک دوسرے سے لڑا دو
ذرا ایک روٹی کا ٹکڑا دکھا دو
یہ ہر ایک کی ٹھوکریں کھانے والے
یہ فاقوں سے اکتا کے مر جانے والے
یہ مظلوم مخلوق گر سر اٹھائے
تو انسان سب سرکشی بھول جائے
یہ چاہیں تو دنیا کو اپنا بنا لیں
یہ آقاؤں کی ہڈیاں تک چبا لیں
کوئی ان کو احساسِ ذلت دلا دے
کوئی ان کی سوئی ہوئی دم ہلا دے

انتظار

گزر رہے ہیں شب و روز تم نہیں آتیں
ریاضِ زیست ہے آزردۂ بہار ابھی
مرے خیال کی دُنیا ہے سوگوار ابھی

جو حسرتیں ترے غم کی کفیل ہیں پیاری
ابھی تلک مری تنہائیوں میں بستی ہیں
طویل راتیں ابھی تک طویل ہیں پیاری
اُداس آنکھیں ابھی انتظار کرتی ہیں

بہارِ حسن یہ پابندیٔ جفا کب تک ؟
یہ آزمائشِ صبرِ گریز پا کب تک ؟
قسم تمہاری بہت غم اُٹھا چکا ہوں میں
غلط تھا دعویٔ صبر و شکیب آ جاؤ
قرارِ خاطرِ بے تاب تھک گیا ہوں میں

بعد از وقت

دِل کو احساس سے دوچار نہ کر دینا تھا
سازِ خوابیدہ کو بیدار نہ کر دینا تھا
اپنے معصوم تبسم کی فراوانی کو
وسعتِ دید پہ گلبار نہ کر دینا تھا
شوقِ مجبور کو بس ایک جھلک دکھلا کر
واقفِ لذتِ تکرار نہ کر دینا تھا
چشمِ مشتاق کی خاموش تمناؤں کو
یک بیک مائلِ گفتار نہ کر دینا تھا
جلوۂ حسن کو مستور ہی رہنے دیتے
حسرتِ دِل کو گنہگار نہ کر دینا تھا

رقیب سے

آکہ وابستہ ہیں اُس حُسن کی یادیں تجھ سے
جس نے اس دل کو پری خانہ بنا رکھا ہے
جس کی اُلفت میں بھلا رکھی تھی دُنیا ہم نے
دہر کو دہر کا افسانہ بنا رکھا تھا

آشنا ہیں ترے قدموں سے وہ راہیں جن پر
اس کی مدہوش جوانی نے عنایت کی ہے
کارواں گزرے ہیں جن سے اسی رعنائی کے
جس کی ان آنکھوں نے بے سُود عبادت کی ہے

تجھ سے کھیلی ہیں وہ محبوب ہوائیں جن سے
اس کے ملبوس کی افسردہ مہک باقی ہے
تجھ پہ بھی برسا ہے اُس بام سے مہتاب کا نُور
جس میں بیتی ہوئی راتوں کی کسک باقی ہے

تُو نے دیکھی ہے وہ پیشانی، وہ رُخسار، وہ ہونٹ
زندگی جن کے تصوّر میں لُٹا دی ہم نے
تجھ پہ اُٹھی ہیں وہ کھوئی ہوئی ساحر آنکھیں
تجھ کو معلوم ہے کیوں عمر گنوا دی ہم نے

ہم پہ مشترکہ ہیں احسان غمِ اُلفت کے
اتنے احسان کہ گنواؤں تو گنوا نہ سکوں
ہم نے اس عشق میں کیا کھویا ہے کیا سیکھا ہے
جُز ترے اور کو سمجھاؤں تو سمجھا نہ سکوں

عاجزی سیکھی، غریبوں کی حمایت سیکھی
یاس و حرمان کے، دُکھ درد کے معنی سیکھے
زیردستوں کے مصائب کو سمجھنا سیکھا
سرد آہوں کے، رُخِ زرد کے معنی سیکھے

جب کہیں بیٹھ کے روتے ہیں وہ بیکس جن کے
اشک آنکھوں میں بلکتے ہوئے سو جاتے ہیں
ناتوانوں کے نوالوں پہ جھپٹتے ہیں عقاب
بازو تولے ہوئے منڈلاتے ہوئے آتے ہیں

جب کبھی بکتا ہے بازار میں مزدور کا گوشت
شاہراہوں پہ غریبوں کا لہو بہتا ہے
آگ سی سینے میں رہ رہ کے اُبلتی ہے نہ پوچھ
اپنے دل پر مجھے قابو ہی نہیں رہتا ہے

یاس

بربطِ دل کے تار ٹوٹ گئے
ہیں زمیں بوس راحتوں کے محل
مِٹ گئے قصہ ہائے فکر و عمل
بزمِ ہستی کے جام پھوٹ گئے
چھن گیا کیفِ کوثر و تسنیم
زحمتِ گریہ و بکا بے سود
شکوۂ بختِ نارسا بے سود
ہو چکا ختم رحمتوں کا نزول
بند ہے مدتوں سے بابِ قبول
بے نیازِ دُعا ہے ربِ کریم
بجھ گئی شمعِ آرزوئے جمیل
یاد باقی ہے بے کسی کی دلیل
انتظارِ فضول رہنے دے
رازِ اُلفت نباہنے والے
بارِ غم سے کراہنے والے
کاوشِ بے حصول رہنے دے

سوچ

کیوں میرا دل شاد نہیں ہے
کیوں خاموش رہا کرتا ہوں
چھوڑو میری رام کہانی
میں جیسا بھی ہوں اچھا ہوں

میرا دل غمگیں ہے تو کیا
غمگیں یہ دُنیا ہے ساری
یہ دُکھ تیرا ہے نہ میرا
ہم سب کی جاگیر ہے پیاری

تو گر میری بھی ہو جائے
دُنیا کے غم یوں ہی رہیں گے
پاپ کے پھندے ظلم کے بندھن
اپنے کہے سے کٹ نہ سکیں گے

غم ہر حالت میں مہلک ہے
اپنا ہو یا اور کسی کا
رونا دھونا، جی کو جلانا
یوں بھی ہمارا، یوں بھی ہمارا

کیوں نہ جہاں کا غم اپنا لیں
بعد میں سب تدبیریں سوچیں
بعد میں سُکھ کے سپنے دیکھیں
سپنوں کی تعبیریں سوچیں

بے فکرے دھن دولت والے
یہ آخر کیوں خوش رہتے ہیں؟
ان کا سُکھ آپس میں بانٹیں
یہ بھی آخر ہم جیسے ہیں

ہم نے مانا جنگ کڑی ہے
سر پھوٹیں گے، خون بہے گا
خون میں غم بھی بہ جائیں گے
ہم نہ رہیں، غم بھی نہ رہے گا

نفسِ بادِ صبا مُشک فشاں خواہد شد
عالمِ پیر دِگر بارہ جواں خواہد شد

(حافظ)

شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں

موتی ہو کہ شیشہ، جام کہ دُر
جو ٹوٹ گیا، سو ٹوٹ گیا
کب اشکوں سے جڑ سکتا ہے
جو ٹوٹ گیا، سو چھوٹ گیا
تم ناحق ٹکڑے چُن چُن کر
دامن میں چھپائے بیٹھے ہو
شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں
کیا آس لگائے بیٹھے ہو
شاید کہ انہی ٹکڑوں میں کہیں
وہ ساغرِ دل ہے جس میں کبھی
صد ناز سے اُترا کرتی ہے
صہبائے غمِ جاناں کی پری
پھر دُنیا والوں نے تم سے
یہ ساغر لے کر پھوڑ دیا
جو مے تھی، بہا دی مٹی میں
مہمان کا شہپر توڑ دیا
یہ رنگیں ریزے ہیں شاید
ان شوخ بلوریں سپنوں کے
تم مست جوانی میں جن سے
خلوت کو سجایا کرتے تھے
ناداری، دفتر، بھوک اور غم
ان سپنوں سے ٹکراتے رہے
بے رحم تھا چومکھ پتھراؤ
یہ کانچ کے ڈھانچے کیا کرتے
یا شاید ان ذرّوں میں کہیں
موتی ہے تمہاری عزت کا
وہ جس سے تمہارے عجز پہ بھی
شمشاد قدوں نے رشک کیا
اس مال کی دُھن میں پھرتے تھے
تاجر بھی بہت، رہزن بھی کئی
بے چور نگر، یاں مفلس کی
گر جان بچی تو آن گئی
یہ ساغر شیشے، لعل و گوہر
سالم ہوں، تو قیمت پاتے ہیں
یوں ٹکڑے ٹکڑے ہوں، تو فقط
چبھتے ہیں، لہو رُلواتے ہیں
تم ناحق شیشے چُن چُن کر
دامن میں چھپائے بیٹھے ہو
شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں
کیا آس لگائے بیٹھے ہو
یادوں کے گریبانوں کے رفو
پر دِل کی گزر کب ہوتی ہے
اک بخیہ اُدھیڑا، ایک سیا
یوں عمر بسر کب ہوتی ہے
اس کار گہِ ہستی میں جہاں
یہ ساغر، شیشے ڈھلتے ہیں
ہر شیشے کا بدل مل سکتا ہے
سب دامن پُر ہو سکتے ہیں
جو ہاتھ بڑھے، یاد رہے یہاں

جو آنکھ اٹھے، وہ بخت آور
یاں دھن دولت کا انت نہیں
ہوں گھات میں ڈاکو لاکھ، مگر
کب لوٹ جھپٹ سے ہستی کی
دوکانیں خالی ہوتی ہیں
یاں پربت پربت ہیرے ہیں
یاں ساگر ساگر موتی ہیں
کچھ لوگ ہیں جو اس دولت پر
پردے لٹکاتے پھرتے ہیں
ہر پربت کو، ہر ساگر کو
نیلام چڑھاتے پھرتے ہیں
کچھ وہ بھی ہیں جو لڑ بھڑ کر
یہ پردے نوچ گراتے ہیں
ہستی کے اٹھائی گیروں کی
ہر چال الجھائے جاتے ہیں
ان دونوں میں رن پڑتا ہے
نت بستی بستی، نگر نگر
ہر بستے گھر کے سینے میں
ہر چلتی راہ کے ماتھے پر
یہ کالک بھرتے پھرتے ہیں
وہ جوت جگاتے رہتے ہیں
یہ آگ لگاتے پھرتے ہیں
وہ آگ بجھاتے رہتے ہیں
سب ساغر، شیشے، لعل و گوہر
اس بازی میں، بد جاتے ہیں
اٹھو، سب خالی ہاتھوں میں
اس رن سے بلاوے آتے ہیں

●

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

یاد

دشتِ تنہائی میں، اے جانِ جہاں لرزاں ہیں
تیری آواز کے سائے، ترے ہونٹوں کے سراب

دشتِ تنہائی میں دوری کے خس و خاک تلے
کھل رہے ہیں ترے پہلو کے سمن اور گلاب

اٹھ رہی ہے کہیں قربت سے تری سانس کی آنچ
اپنی خوشبو میں سلگتی ہوئی مدھم مدھم

دور، افق پار، چمکتی ہوئی قطرہ قطرہ
گر رہی ہے تری دلدار نظر کی شبنم

اس قدر پیار سے، اے جانِ جہاں رکھا ہے
دل کے رخسار پہ اس وقت تری یاد نے ہات

یوں گماں ہوتا ہے، گرچہ ہے ابھی صبحِ فراق
ڈھل گیا ہجر کا دن، آ بھی گئی وصل کی رات

زنداں کی ایک شام

شام کے پیچ و خم ستاروں سے
زینہ زینہ اتر رہی ہے رات
یوں صبا پاس سے گزرتی ہے
جیسے کہہ دی کسی نے پیار کی بات
صحنِ زنداں کے بے وطن اشجار
سرنگوں محو ہیں بنانے میں
دامنِ آسماں پہ نقش و نگار
شانۂ بام پر دمکتا ہے!!
مہرباں چاندنی کا دستِ جمیل
خاک میں گھل گئی ہے آبِ نجوم
نور میں گھل گیا ہے عرش کا نیل
سبز گوشوں میں نیل گوں سائے
لہلہاتے ہیں جس طرح دل میں
موجِ دردِ فراقِ یار آئے
دل سے پیہم خیال کرتا ہے
اتنی شیریں ہے زندگی اس پل
ظلم کا زہر گھولنے والے
کامراں ہو سکیں گے آج نہ کل
جلوہ گاہِ وصال کی شمعیں!
وہ بجھا بھی چکے اگر تو کیا!
چاند کو گل کریں تو ہم جانیں!

زنداں کی ایک صبح

رات باقی تھی ابھی جب سرِ بالیں آکر!
چاند نے مجھ سے کہا "جاگ سحر آئی ہے"
جاگ اس شب جو مئے خواب ترا حصہ تھی
جام کے لب سے تہِ جام اتر آئی ہے
عکسِ جاناں کو وداع کرکے اٹھی میری نظر
شب کے ٹھہرے ہوئے پانی کی سیہ چادر پر
جابجا رقص میں آنے لگے چاندی کے بھنور
چاند کے ہاتھ سے تاروں کے کنول گر گر کر
ڈوبتے، تیرتے، مرجھاتے رہے، کھلتے رہے
صحنِ زنداں میں رفیقوں کے سنہرے چہرے
سطحِ ظلمت سے دمکتے ہوئے ابھرے کم کم
نیند کی اوس نے ان چہروں سے دھو ڈالا تھا
دیس کا درد، فراقِ رخِ محبوب کا غم!
دور نوبت ہوئی پھرنے لگے بیزار قدم
زرد فاقوں سے ستائے ہوئے پہرے والے
اہلِ زنداں کے غضبناک خروشاں نالے
جن کی باہوں میں پھرا کرتے ہیں باہیں ڈالے
لذتِ خواب سے مخمور ہوائیں جاگیں!!
جیل کی زہر بھری چور صدائیں جاگیں!
دور دروازہ کھلا کوئی، کوئی بند ہوا
دور مچلی کوئی زنجیر، مچل کے روئی
دور اترا کسی تالے کے جگر میں خنجر!
سر پٹکنے لگا رہ رہ کے دریچہ کوئی
گویا پھر خواب سے بیدار ہوئے دشمنِ جاں
سنگ فولاد سے ڈھالے ہوئے جناتِ گراں
جن کے چنگل میں شب و روز ہیں فریاد کناں
میرے بے کار شب و روز کی نازک پریاں
اپنے شہپور کی رہ دیکھ رہی ہیں یہ اسیر
جس کے ترکش میں ہیں امید کے جلتے ہوئے تیر

ایرانی طلبہ کے نام

(جو امن اور آزادی کی جدوجہد میں کام آئے)

یہ کون سخی ہیں
جن کے لہو کی
اشرفیاں، چھن چھن، چھن چھن
دھرتی کی پیہم پیاسی
کشکول میں ڈھلتی جاتی ہیں
یہ کون جواں ہیں ارضِ عجم!
یہ لکھ لُٹ
جن کے جسموں کی
بھرپور جوانی کا کندن
یوں خاک میں ریزہ ریزہ ہے
یوں کوچہ کوچہ بکھرا ہے
اے ارضِ عجم، اے ارضِ عجم!
کیوں نوچ کے ہنس ہنس پھینک دیے
ان آنکھوں نے اپنے نیلم
ان ہونٹوں نے اپنے مرجاں
ان ہاتھوں کی بے کل چاندی
کس کام آئی، کس ہاتھ بِکی؟"

"اے پوچھنے والے پردیسی!
یہ طفل و جواں
اس نور کے نورس موتی ہیں
اس آگ کی کچی کلیاں ہیں
جس میٹھے نور اور کڑوی آگ
سے ظلم کی اندھی رات میں پھوٹا
صبحِ بغاوت کا گلشن
اور صبح ہوئی من من، تن تن،
ان جسموں کا چاندی سونا
ان چہروں کے نیلم، مرجاں
جگ مگ جگ مگ، رخشاں رخشاں
جو دیکھنا چاہے پردیسی
پاس آئے دیکھے جی بھر کر
یہ زیست کی رانی کا جھومر
یہ امن کی دیوی کا کنگن!"

نذرِ غالب

کسی گماں پہ توقع زیادہ رکھتے ہیں
پھر آج کوئے بتاں کا ارادہ رکھتے ہیں

بہار آئے گی جب آئے گی یہ شرط نہیں
کہ تشنہ کام رہیں، گرچہ بادہ رکھتے ہیں

تری نظر کا گلہ کیا؟ جو ہے گلہ دل کو
تو ہم سے ہے، کہ تمنا زیادہ رکھتے ہیں
نہیں شراب سے رنگیں تو غرقِ خوں ہیں کہ ہم
خیالِ وضعِ قمیص و لبادہ رکھتے ہیں
غمِ جہاں ہو، غمِ یار ہو کہ تیرِ ستم
جو آئے آئے کہ ہم دل کشادہ رکھتے ہیں

جوابِ واعظِ چابک زباں میں فیض ہمیں
یہی بہت ہے جو دو حرفِ سادہ رکھتے ہیں

■■

نثار میں
تری
گلیوں
پہ
اے
وطن کہ
جہاں

نثار میں تری گلیوں پہ اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے
جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
نظر چرا کے چلے جسم و جاں بچا کے چلے

ہے اہل دل کے لئے اب یہ نظم بست و کشاد
کہ سنگ و خشت مقید ہیں اور سگ آزاد

بہت ہے ظلم کے دست بہانہ جو کے لئے
جو چند اہل جنوں تیرے نام لیوا ہیں
بنے ہیں اہل ہوس مدعی بھی منصف بھی
کسے وکیل کریں، کس سے منصفی چاہیں

مگر گزارنے والوں کے دن گزرتے ہیں
ترے فراق میں یوں صبح و شام کرتے ہیں

بجھا جو روزنِ زنداں تو دل یہ سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی
چمک اُٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر ترے رُخ پر بکھر گئی ہوگی

غرض تصورِ شام و سحر میں جیتے ہیں!
گرفت سایۂ دیوار و در میں جیتے ہیں

یونہی ہمیشہ اُلجھتی رہی ہے ظلم سے خلق
نہ ان کی رسم نئی ہے نہ اپنی ریت نئی!
یونہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول
نہ ان کی ہار نئی ہے، نہ ان کی جیت نئی!

اسی سبب سے فلک کا گلہ نہیں کرتے
ترے فراق میں ہم دل بُرا نہیں کرتے

گر آج تجھ سے جُدا ہیں تو کل بہم ہوں گے
یہ رات بھر کی جُدائی تو کوئی بات نہیں!
گر آج اوج پہ ہے، طالع رقیب تو کیا
یہ چار دن کی جُدائی تو کوئی بات نہیں

جو تجھ سے عہدِ وفا استوار رکھتے ہیں
علاج گردشِ لیل و نہار رکھتے ہیں

●

میخانے کی رونق ہیں، کبھی خانقہوں کی
اپنا لی ہوس والوں نے، جو رسم چلی ہے
دلداریِ واعظ کو ہمیں باقی ہیں ورنہ
اب شہر میں ہر رندِ خرابات، ولی ہے

اگست ۱۹۵۲ء

روشن کہیں بہار کے امکاں ہوئے تو ہیں
گلشن میں چاک چند گریباں ہوئے تو ہیں

اب بھی خزاں کا راج ہے لیکن کہیں کہیں
گوشے رہِ چمن میں غزل خواں ہوئے تو ہیں

ٹھہری ہوئی ہے شب کی سیاہی وہیں مگر
کچھ کچھ سحر کے رنگ پرافشاں ہوئے تو ہیں

ان میں لہو جلا ہو ہمارا، کہ جان و دل
محفل میں کچھ چراغ فروزاں ہوئے تو ہیں

ہاں کج کرو کلاہ کہ سب کچھ لٹا کے ہم
اب بے نیازِ گردشِ دوراں ہوئے تو ہیں

اہلِ قفس کی صبحِ چمن میں کھلے گی آنکھ
بادِ صبا سے وعدہ و پیماں ہوئے تو ہیں

ہے دشت اب بھی دشت، مگر خونِ پا سے فیض
سیراب چند خارِ مغیلاں ہوئے تو ہیں

نذرِ سودا

فکرِ دلداریٔ گلزار کروں یا نہ کروں
"ذکرِ مرغانِ گرفتار کروں یا نہ کروں"

قصۂ سازشِ اغیار کہوں یا نہ کہوں
شکوۂ یارِ طرحدار کروں یا نہ کروں

جانے کیا وضع ہے اب رسمِ وفا کی اے دل
وضعِ دیرینہ پہ اصرار کروں یا نہ کروں

جانے کس رنگ میں تفسیر کریں اہلِ ہوس
مدحِ زلف و لب و رخسار کروں یا نہ کروں

یوں بہار آئی ہے امسال کہ گلشن میں صبا
پوچھتی ہے گزر اس بار کروں یا نہ کروں

گویا اس سوچ میں ہے دل میں لہو بھر کے گلاب
دامن و جیب کو گلنار کروں یا نہ کروں

ہے فقط مرغِ غزل خواں کہ جسے فکر نہیں
معتدل گرمیٔ گفتار کروں یا نہ کروں

شورشِ بربطِ و نے

پہلی آواز

اب سعی کا امکاں اور نہیں، پرواز کا مضموں ہو بھی چکا
تاروں پہ کمندیں پھینک چکے، مہتاب پہ شب خوں ہو بھی چکا
اب کسی فردا کے لئے ان آنکھوں سے کیا پیماں کیجے
کس خواب کے جھوٹے افسوں سے تسکینِ دلِ ناداں کیجے
شیرینیٔ لب، خوشبوئے دہن، اب شوق کا عنواں کوئی نہیں
شادابیٔ دل، تفریحِ نظر، اب زیست کا درماں کوئی نہیں
جینے کے فسانے رہنے دو، اب ان میں الجھ کر کیا لیں گے
اک موت کا دھندا باقی ہے، جب چاہیں گے نپٹا لیں گے
یہ تیرا کفن، وہ میرا کفن، یہ میری لحد، وہ تیری ہے

دوسری آواز

ہستی کی متاعِ بے پایاں، جاگیر تری ہے نہ میری ہے
اس بزم میں اپنی مشعلِ دل، بسمل ہے تو کیا، رخشاں ہے تو کیا
یہ بزم چراغاں رہتی ہے، اک طاق اگر ویراں ہے تو کیا
افسردہ ہیں گر ایام ترے، بدلا نہیں مسلکِ شام و سحر
ٹھہرے نہیں موسمِ گل کے قدم، قائم ہے جمالِ شمس و قمر
آباد ہے وادیٔ کاکل و لب، شاداب و حسیں گلگشتِ نظر
مقسوم ہے لذتِ دردِ جگر، موجود ہے نعمتِ دیدۂ تر
اس دیدۂ تر کا شکر کرو، اس ذوقِ نظر کا شکر کرو
اس شام و سحر کا شکر کرو، ان شمس و قمر کا شکر کرو

●

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

اسبابِ غمِ عشق بہم کرتے رہیں گے
ویرانیٔ دوراں پہ کرم کرتے رہیں گے

ہاں تلخیٔ ایام ابھی اور بڑھے گی
ہاں اہلِ ستم مشقِ ستم کرتے رہیں گے

منظور یہ تلخی، یہ ستم ہم کو گوارا
دم ہے تو مداوائے الم کرتے رہیں گے

مے خانہ سلامت ہے تو ہم سرخیٔ مے سے
تزئینِ در و بامِ حرم کرتے رہیں گے

باقی ہے لہو دل میں تو ہر اشک سے پیدا
رنگِ لب و رخسارِ صنم کرتے رہیں گے

اک طرزِ تغافل ہے سو وہ ان کو مبارک
اک عرضِ تمنا ہے سو ہم کرتے رہیں گے

●

ہمارے دم سے ہے کوئے جنوں میں اب بھی خجل
عبائے شیخ و قبائے امیر و تاجِ شہی
ہمیں سے سنتِ منصور و قیس زندہ ہے
ہمیں سے باقی ہے گل دامنی و کج کلہی

پہلی آواز

گر ہے یہی مسلکِ شمس و قمر، ان شمس و قمر کا کیا ہوگا
رعنائیِ شب کا کیا ہوگا، اندازِ سحر کا کیا ہوگا

جب خونِ جگر برفاب بنا، جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں
اس دیدۂ تر کا کیا ہوگا، اس ذوقِ نظر کا کیا ہوگا

جب شعر کے خیمے راکھ ہوئے نغموں کی طنابیں ٹوٹ گئیں
یہ ساز کہاں سر پھوڑیں گے، اس کلکِ گہر کا کیا ہوگا

جب کنجِ قفس مسکن ٹھہرا، اور جیب و گریباں طوق و رسن
آئے کہ نہ آئے موسمِ گل، اس دردِ جگر کا کیا ہوگا

دوسری آواز

یہ ہاتھ سلامت ہیں جب تک، اس خوں میں حرارت ہے جب تک
اس دل میں صداقت ہے جب تک، اس نطق میں طاقت ہے جب تک

ان طوق و سلاسل کو ہم تم سکھلائیں گے شورشِ بربط و نَے
وہ شورش جس کے آگے زبوں ہنگامۂ طبلِ قیصر و کَے

آزاد ہیں اپنے فکر و عمل، بھرپور خزینہ ہمت کا
اک عمر ہے اپنی ہر ساعت، امروز ہے اپنا ہر فردا

یہ شام و سحر، یہ شمس و قمر، یہ اختر و کوکب اپنے ہیں
یہ لوح و قلم، یہ طبل و علم، یہ مال و حشم سب اپنے ہیں

●

تم آئے ہو، نہ شبِ انتظار گزری ہے
تلاش میں ہے سحر، بار بار گزری ہے

جنوں میں جتنی بھی گزری، بکار گزری ہے
اگرچہ دل پہ خرابی ہزار گزری ہے

ہوئی ہے حضرتِ ناصح سے گفتگو جس شب
وہ شب ضرور سرِ کوئے یار گزری ہے

وہ بات، سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

نہ گل کھلے ہیں، نہ ان سے ملے، نہ مے پی ہے
عجیب رنگ میں اب کے بہار گزری ہے

چمن پہ غارتِ گلچیں سے جانے کیا گزری
قفس سے آج صبا بے قرار گزری ہے

●

نہ پوچھ جب سے ترا انتظار کتنا ہے
کہ جن دنوں سے مجھے تیرا انتظار نہیں
ترا ہی عکس ہے ان اجنبی بہاروں میں
جو تیرے لب، ترے بازو، ترا کنار نہیں

●

صبا کے ہاتھ میں نرمی ہے ان کے ہاتھوں کی
ٹھہر ٹھہر کے یہ ہوتا ہے آج دل کو گماں
وہ ہاتھ ڈھونڈ رہے ہیں بساطِ محفل میں
کہ دل کے داغ کہاں ہیں نشستِ درد کہاں

سرِ مقتل
(قوّالی)

کہاں ہے منزلِ راہِ تمنا، ہم بھی دیکھیں گے
یہ شب ہم پر بھی گزرے گی، یہ فردا ہم بھی دیکھیں گے
ٹھہر اے دل، جمالِ روئے زیبا ہم بھی دیکھیں گے

ذرا صیقل تو ہو لے تشنگی بادہ گساروں کی
دبا رکھیں گے کب تک جوشِ صہبا ہم بھی دیکھیں گے
اٹھا رکھیں گے کب تک جام و مینا ہم بھی دیکھیں گے

صلا آ تو چکے محفل میں اس کوئے ملامت سے
کسے روکے گا شورِ پند بے جا، ہم بھی دیکھیں گے
کسے ہے جا کے لوٹ آنے کا یارا، ہم بھی دیکھیں گے

چلے ہیں جان و ایماں آزمانے آج دل والے
وہ لائیں لشکر اغیار و اعدا، ہم بھی دیکھیں گے
وہ آئیں تو سرِ مقتل، تماشا ہم بھی دیکھیں گے

یہ شب کی آخری ساعت گراں کیسی بھی ہو ہمدم
جو اس ساعت میں پنہاں ہے اُجالا، ہم بھی دیکھیں گے
جو فرقِ صبح پر چمکے گا تارا، ہم بھی دیکھیں گے

دامنِ یوسف

جاں بیچنے کو آئے تو بے دام بیچ دی
اے اہلِ مصر، وضعِ تکلف تو دیکھئے
انصاف ہے کہ حکمِ عقوبت سے پیشتر
اِک بار سوئے دامنِ یوسف تو دیکھئے!

●

پھر حشر کے ساماں ہوئے ایوانِ ہوس میں
بیٹھے ہیں ذوی العدل، گنہگار کھڑے ہیں
ہاں جرمِ وفا دیکھئے کس کس پہ ہے ثابت
وہ سارے خطاکار سرِ دار کھڑے ہیں

●

شفق کی راکھ میں جل بجھ گیا ستارۂ شام
شبِ فراق کے گیسو فضا میں لہرائے

کوئی پکارو کہ اک عمر ہونے آئی ہے
فلک کا قافلۂ روز و شام ٹھہرائے

یہ ضد ہے یادِ حریفانِ بادہ پیما کی
کہ شب کو چاند نہ نکلے نہ دن کو ابر آئے

صبا نے پھر درِ زنداں پہ آ کے دی دستک
سحر قریب ہے، دل سے کہو نہ گھبرائے

تیری صورت جو دل نشیں کی ہے
آشنا شکل ہر حسیں کی ہے

حسن سے دل لگا کے ہستی کی
ہر گھڑی ہم نے آتشیں کی ہے

صبحِ گل ہو کہ شامِ مے خانہ
مدح اس روئے نازنیں کی ہے

شیخ سے بے ہراس ملتے ہیں
ہم نے توبہ ابھی نہیں کی ہے

ذکرِ دوزخ، بیانِ حور و قصور
بات گویا یہیں کہیں کی ہے

اشک تو کچھ بھی رنگ لا نہ سکے
خوں سے تر آج آستیں کی ہے

کیسے مانیں حرم کے سہل پسند
رسم جو عاشقوں کے دیں کی ہے

فیضؔ، اوجِ خیال سے ہم نے
آسماں، سندھ کی زمیں کی ہے

یادِ غزال چشماں ذکرِ سمن عذاراں
جب چاہا کر لیا ہے کنجِ قفس بہاراں

آنکھوں میں دردمندی ہونٹوں پہ عذر خواہی
جانانہ وار آئی، شامِ فراقِ یاراں

ناموسِ جان و دل کی بازی لگی تھی ورنہ
آساں نہ تھی کچھ ایسی راہِ وفا شعاراں

مجرم ہو خواہ کوئی، رہتا ہے ناصحوں کا
روئے سخن ہمیشہ سوئے جگر فگاراں

ہے اب بھی وقت زاہد ترمیمِ زہد کر لے
سوئے حرم چلا ہے انبوہِ بادہ خواراں

شاید قریب پہنچی، صبحِ وصال ہمدم
موجِ صبا لئے ہے خوشبوئے خوش کناراں

ہے اپنی کشتِ ویراں سرسبز اس یقیں سے
آئیں گے اس طرف بھی اک روز ابرِ باراں

آئے گی فیضؔ اک دن بادِ بہار لے کر
تسلیمِ مے فروشاں، پیغامِ مے گساراں

مرے ہمدم، مرے دوست

گر مجھے اس کا یقیں ہو مرے ہمدم، مرے دوست
گر مجھے اس کا یقیں ہو کہ ترے دل کی تھکن
تیری آنکھوں کی اُداسی ترے سینے کی جلن
میری دلجوئی، مرے پیار سے مٹ جائے گی
گر مرا حرفِ تسلی وہ دوا ہو جس سے
جی اُٹھے پھر ترا اُجڑا ہوا بے نور دماغ
تیری پیشانی سے دُھل جائیں یہ تذلیل کے داغ
تیری بیمار جوانی کو شفا ہو جائے
گر مجھے اس کا یقیں ہو مرے ہمدم، مرے دوست
روز و شب، شام و سحر میں تجھے بہلاتا ہوں
میں تجھے گیت سُناتا رہوں ہلکے، شیریں
آبشاروں کے بہاروں کے، چمن زاروں کے گیت
آمدِ صبح کے، مہتاب کے، سیّاروں کے گیت
تجھ سے میں حُسن و محبت کی حکایات کہوں
کیسے مغرور حسیناؤں کے برفاب سے جسم
گرم ہاتھوں کی حرارت میں پگھل جاتے ہیں
کیسے اِک چہرے کے ٹھہرے ہوئے مانوس نقوش
دیکھتے دیکھتے یک لخت بدل جاتے ہیں
کس طرح عارضِ محبوب کا شفاف بلور
یک بیک بادۂ احمر سے دہک جاتا ہے
کیسے گلچیں کے لئے جھکتی ہے خود شاخِ گلاب
کس طرح رات کا ایوان مہک جاتا ہے
یونہی گاتا رہوں، گاتا رہوں، تیری خاطر
گیت بنتا رہوں، بیٹھا رہوں، تیری خاطر

پر بڑے گیت ترے دکھ کا مداوا ہی نہیں
نغمہ جرّاح نہیں، مونس و غم خوار سہی
گیت نشتر تو نہیں، مرہمِ آزار سہی
تیرے آزار کا چارہ نہیں، نشتر کے سوا
اور یہ سفّاک مسیحا مرے قبضے میں نہیں
اس جہاں کے کسی ذی رُوح کے قبضے میں نہیں
ہاں مگر تیرے سوا، تیرے سوا، تیرے سوا

●

کبھی کبھی یاد میں ابھرتے ہیں نقشِ ماضی مٹے مٹے سے
وہ آزمائش دل و نظر کی وہ قربتیں سی، وہ فاصلے سے

کبھی کبھی آرزو کے صحرا میں آکے رکتے ہیں قافلے سے
وہ ساری باتیں لگاؤ کی سی وہ سارے عنوان وصال کے سے

نگاہ و دل کو قرار کیسا، نشاط و غم میں کمی کہاں کی
وہ جب ملے ہیں تو ان سے ہر بار کی ہے الفت نئے سرے سے

بہت گراں ہے یہ عیشِ تنہا، کہیں سبک تر کہیں گوارا
وہ دردِ پنہاں کہ ساری دنیا رفیق تھی جس کے واسطے سے

تمہیں کہو رند و محتسب میں ہے آج شب کون فرق ایسا
یہ آکے بیٹھے ہیں میکدے میں وہ اٹھ کے آئے ہیں میکدے سے

سیاسی لیڈر کے نام

سالہا سال یہ بے آسرا جکڑے ہوئے ہاتھ
رات کے سخت و سیہ سینے میں پیوست رہے

جس طرح تنکا سمندر سے ہو سرگرمِ ستیز
جس طرح تیتری کہسار پہ یلغار کرے

اور اب رات کے سنگین و سیہ سینے میں
اتنے گھاؤ ہیں کہ جس سمت نظر جاتی ہے

جابجا نور نے اک جال سا بُن رکھا ہے
دُور سے صبح کی دھڑکن کی صدا آتی ہے

تیرا سرمایہ، تری آس یہی ہاتھ تو ہیں
اور کچھ بھی تو نہیں پاس، یہی ہاتھ تو ہیں

تجھ کو منظور نہیں غلبۂ ظلمت، لیکن
تجھ کو منظور ہے یہ ہاتھ قلم ہو جائیں

اور مشرق کی کمیں گہ میں دھڑکتا ہوا دن
رات کی آہنی میّت کے تلے دب جائے!

ترا جمال نگاہوں میں لے کے اٹھا ہوں
نکھر گئی ہے فضا تیرے پیرہن کی سی
نسیم، تیرے شبستاں سے ہو کے آئی ہے
مری سحر میں مہک ہے ترے بدن کی سی

....تمہارے حسن کے نام

سلام لکھتا ہے شاعر تمہارے حسن کے نام
بکھر گیا جو کبھی رنگِ پیرہن سرِ بام
نکھر گئی ہے کبھی صبح، دوپہر، کبھی شام
کہیں جو قامتِ زیبا پہ سج گئی ہے قبا
چمن میں سرو و صنوبر سنور گئے ہیں تمام
بنی بساطِ غزل جب ڈبو لیے دل نے
تمہارے سایۂ رخسار و لب میں ساغر و جام
سلام لکھتا ہے شاعر تمہارے حسن کے نام
تمہارے ہاتھ پہ ہے تابشِ حنا جب تک
جہاں میں باقی ہے دلداریِ عروسِ سخن
تمہارا حسن جواں ہے تو مہرباں ہے فلک
تمہارا دم ہے تو دمساز ہے ہوائے وطن
اگرچہ تنگ ہیں اوقات، سخت ہیں آلام
تمہاری یاد سے شیریں ہے تلخیِ ایام
سلام لکھتا ہے شاعر تمہارے حسن کے نام

طوق دار کا موسم

روش روش ہے وہی انتظار کا موسم
نہیں ہے کوئی بھی موسم، بہار کا موسم

گراں ہے دل پہ غمِ روزگار کا موسم
ہے آزمائشِ حسنِ نگار کا موسم

خوشا نظارۂ رخسارِ یار کی ساعت
خوشا قرارِ دلِ بے قرار کا موسم

حدیثِ بادہ و ساقی نہیں تو کس مصرف
خرامِ ابرِ سرِ کوہسار کا موسم

نصیبِ صحبتِ یاراں نہیں تو کیا کیجے
یہ رقصِ سایۂ سرو و چنار کا موسم

یہ دل کے داغ تو دکھتے تھے یوں بھی پر کم کم
کچھ اب کے اور ہے ہجرانِ یار کا موسم

یہی جنوں کا، یہی طوق و دار کا موسم
یہی ہے جبر، یہی اختیار کا موسم

قفس ہے بس میں تمہارے، تمہارے بس میں نہیں
چمن میں آتشِ گل کے نکھار کا موسم

صبا کی مست خرامی تہِ کمند نہیں
اسیرِ دام نہیں ہے بہار کا موسم

بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے
فروغِ گلشن و صوتِ ہزار کا موسم

گرانیِ شبِ ہجراں دوچند کیا کرتے
علاجِ دردِ ترے دردمند کیا کرتے

وہیں لگی ہے جو نازک مقام تھے دل کے
یہ فرق دستِ عدو کے گزند کیا کرتے

جگہ جگہ پہ تھے ناصح تو کُو بکُو دلبر
انہیں پسند، انہیں ناپسند کیا کرتے

ہمیں نے روک لیا پنجۂ جنوں ورنہ
ہمیں اسیر یہ کوتہ کمند کیا کرتے

جنہیں خبر تھی کہ شرطِ نواگری کیا ہے
وہ خوش نوا، گلۂ قید و بند کیا کرتے

گلوئے عشق کو دار و رسن پہنچ نہ سکے
تو لوٹ آئے ترے سربلند، کیا کرتے

نوحہ

۱۸ جولائی ۱۹۵۴ء

مجھ کو شکوہ ہے مرے بھائی کہ تم جاتے ہوئے
لے گئے ساتھ مری عمرِ گزشتہ کی کتاب
اس میں تو میری بہت قیمتی تصویریں تھیں
اس میں بچپن تھا مرا، اور مرا عہدِ شباب

اس کے بدلے، مجھے تم دے گئے جاتے جاتے
اپنے غم کا یہ دمکتا ہوا خوں رنگ گلاب

کیا کروں بھائی، یہ اعزاز میں کیوں کر پہنوں
مجھ سے لے لو مری سب چاک قمیصوں کا حساب

آخری بار ہے، لو مان لو اک یہ بھی سوال
آج تک تم سے میں لوٹا نہیں مایوسِ جواب
آ کے لے جاؤ تم اپنا یہ دمکتا ہوا پھول
مجھ کو لوٹا دو مری عمرِ گزشتہ کی کتاب

وہیں ہے، دل کے قرائن تمام کہتے ہیں — وہ اک خلش کہ جسے تیرا نام کہتے ہیں
تم آ رہے ہو کہ بجتی ہیں میری زنجیریں — نہ جانے کیا مرے دیوار و بام کہتے ہیں
یہی کنارِ فلک کا سیہ تریں گوشہ — یہی ہے مطلعِ ماہِ تمام، کہتے ہیں
پیو کہ مفت لگا دی ہے خونِ دل کی کشید — گراں ہے اب کے مئے لالہ فام کہتے ہیں
فقیہِ شہر سے مے کا جواز کیا پوچھیں — کہ چاندنی کو بھی حضرت حرام کہتے ہیں
نوائے مرغ کو کہتے ہیں اب زیانِ چمن — کھلے نہ پھول، اسے انتظام کہتے ہیں

کہو تو ہم بھی چلیں فیض، اب نہیں سرِ دار
وہ فرق مرتبۂ خاص و عام کہتے ہیں

صبحِ آزادی
اگست ۱۹۴۷

یہ داغ داغ اُجالا، یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا، یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں، جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مِل جائے گی کہیں نہ کہیں
فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل
کہیں تو ہوگا شبِ سُست موج کا ساحل
کہیں تو جا کے رُکے گا سفینۂ غمِ دِل
جواں لہو کی پُراسرار شاہراہوں سے
چلے جو یار تو دامن پہ کتنے ہاتھ پڑے
دیارِ حُسن کی بے صبر خواب گاہوں سے
پکارتی رہیں باہیں، بدن بلاتے رہے
بہت عزیز تھی لیکن رُخِ سحر کی لگن
بہت قریں تھا حسینانِ نور کا دامن
سُبک سُبک تھی تمنا، دبی دبی تھی تھکن
سُنا ہے، ہو بھی چکا ہے فِراقِ ظلمت و نور
سنا ہے، ہو بھی چکا ہے وصالِ منزل و گام
بدل چکا ہے بہت اہلِ درد کا دستور
نشاطِ وصل حلال و عذابِ ہجر حرام
جگر کی آگ، نظر کی اُمنگ، دِل کی جلن
ابھی گرانیِ شب میں کمی نہیں آئی
نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

●

اب وہی حرفِ جنوں سب کی زباں ٹھہری ہے
جو بھی چل نکلی ہے، وہ بات کہاں ٹھہری ہے
آج تک شیخ کے اکرام میں جو شے تھی حرام
اب وہی دشمنِ دیں، راحتِ جاں ٹھہری ہے
ہے خبر گرم کہ پھرتا ہے گریزاں ناصح
گفتگو آج سرِ کوئے بُتاں ٹھہری ہے
ہے وہی عارضِ لیلیٰ، وہی شیریں کا دہن
نگہِ شوق گھڑی بھر کو جہاں ٹھہری ہے
وصل کی شب تھی تو کس درجہ سُبک گزری تھی
ہجر کی شب ہے تو کیا سخت گراں ٹھہری ہے
بکھری اِک بار تو ہاتھ آئی ہے کب موجِ شمیم
دِل سے نکلی ہے تو کب لب پہ فغاں ٹھہری ہے
دستِ صیاد بھی عاجز، ہے کفِ گلچیں بھی
بوئے گُل ٹھہری نہ بلبل کی زباں ٹھہری ہے
آتے آتے یونہی دم بھر کو رُکی ہوگی بہار
جاتے جاتے یونہی پل بھر کو خزاں ٹھہری ہے

ہم نے جو طرزِ فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
فیضؔ گلشن میں وہی طرزِ بیاں ٹھہری ہے

رنگ پیراہن کا، خوشبو زلف لہرانے کا نام
موسمِ گل ہے، تمہارے بام پر آنے کا نام

دوستو، اس چشم و لب کی کچھ کہو، جس کے بغیر
گلستاں کی بات رنگیں ہے، نہ میخانے کا نام

پھر نظر میں پھول مہکے، دل میں پھر شمعیں جلیں
پھر تصور نے لیا اس بزم میں جانے کا نام

(ق)

دلبری ٹھہرا زبانِ خلق کھلوانے کا نام
اب نہیں لیتے پری رُو زلف بکھرانے کا نام

اب کسی لیلیٰ کو بھی اقرارِ محبوبی نہیں
ان دنوں بدنام ہے ہر ایک دیوانے کا نام

محتسب کی خیر، اونچا ہے اسی کے فیض سے
رند کا، ساقی کا، مے کا، خم کا، پیمانے کا نام

ہم سے کہتے ہیں چمن والے، غریبانِ چمن!
تم کوئی اچھا سا رکھ لو اپنے ویرانے کا نام

فیض، اُن کو ہے تقاضائے وفا ہم سے، جنہیں
آشنا کے نام سے پیارا ہے بیگانے کا نام

اے دلِ بیتاب ٹھہر

تیرگی ہے کہ اُمنڈتی ہی چلی آتی ہے
شب کی رگ رگ سے لہو پھوٹ رہا ہو جیسے
چل رہی ہے کچھ اس انداز سے نبضِ ہستی
دونوں عالم کا نشہ ٹوٹ رہا ہو جیسے

رات کا گرم لہو اور بھی بہ جانے دو
یہی تاریکی تو ہے غازۂ رُخسارِ سحر
صبح ہونے ہی کو ہے اے دلِ بیتاب ٹھہر

ابھی زنجیر چھنکتی ہے پسِ پردۂ ساز
مطلق الحکم ہے شیرازۂ اسباب ابھی
ساغرِ ناب میں آنسو بھی ڈھلک جاتے ہیں
لغزشِ پا میں ہے پابندیٔ آداب ابھی

اپنے دیوانوں کو دیوانہ تو بن لینے دو
اپنے میخانوں کو میخانہ تو بن لینے دو
جلد یہ سطوتِ اسباب بھی اٹھ جائے گی
یہ گرانباریٔ آداب بھی اُٹھ جائے گی
خواہ زنجیر چھنکتی ہی چھنکتی ہی رہے

آئے کچھ ابر، کچھ شراب آئے　　اس کے بعد آئے جو عذاب آئے

(ق)

بامِ مینا سے ماہتاب اُترے　　دستِ ساقی میں آفتاب آئے
ہر رگِ خوں میں پھر چراغاں ہو　　سامنے پھر وہ بے نقاب آئے
عمر کے ہر ورق پہ دل کو نظر　　تیری مہر و وفا کے باب آئے

(ق)

کر رہا تھا غمِ جہاں کا حساب　　آج تم یاد بے حساب آئے
نہ گئی تیرے غم کی سرداری　　دل میں یوں روز انقلاب آئے
جل اُٹھے بزمِ غیر کے در و بام　　جب بھی ہم خانماں خراب آئے

(ق)

اس طرح اپنی خامشی گونجی　　گویا ہر سمت سے جواب آئے
فیض، تھی راہ سر بسر منزل　　ہم جہاں پہنچے، کامیاب آئے

ترانہ

دربارِ وطن میں جب اِک دن سب جانے والے جائیں گے
کچھ اپنی سزا کو پہنچیں گے، کچھ اپنی جزا لے جائیں گے

اے خاک نشینو اٹھ بیٹھو، وہ وقت قریب آ پہنچا ہے
جب تخت گرائے جائیں گے، جب تاج اچھالے جائیں گے

اب ٹوٹ گریں گی زنجیریں، اب زندانوں کی خیر نہیں
جو دریا جھوم کے اٹھے ہیں، تنکوں سے نہ ٹالے جائیں گے

کٹتے بھی چلو، بڑھتے بھی چلو، بازو بھی بہت ہیں سر بھی بہت
چلتے بھی چلو کہ اب ڈیرے منزل ہی پہ ڈالے جائیں گے

اے ظلم کے ماتو، لب کھولو، چپ رہنے والو چپ کب تک
کچھ حشر تو ان سے اٹھے گا، کچھ دور تو نالے جائیں گے

اے ساکنانِ کنجِ قفس! صبح کو صبا
سنتے ہیں جائے گی سوئے گلزار، کچھ کہو!

(سودا)

واسوخت

سچ ہے، ہمیں کو آپ کے شکوے بجا نہ تھے
بے شک، ستم جناب کے سب دوستانہ تھے

ہاں، جو جفا بھی آپ نے کی، قاعدے سے کی
ہاں، ہم ہی کاربندِ اصولِ وفا نہ تھے

آئے تو یوں کہ جیسے ہمیشہ تھے مہرباں
بھولے تو یوں کہ گویا کبھی آشنا نہ تھے

کیوں دادِ غم ہمیں نے طلب کی، بُرا کیا
ہم سے جہاں میں کشتۂ غم اور کیا نہ تھے

گر فکرِ زخم کی تو خطاوار ہیں کہ ہم
کیوں محوِ مدحِ خوبیِ تیغِ ادا نہ تھے

ہر چارہ گر کو چارہ گری سے گریز تھا
ورنہ ہمیں جو دُکھ تھے، بہت لا دوا نہ تھے

لب پر ہے تلخیِ مےِ ایام، ورنہ فیضؔ
ہم تلخیِ کلام پہ مائل ذرا نہ تھے

منٹگمری جیل
۲۲ر نومبر ۵۳ء

اے روشنیوں کے شہر

سبزہ سبزہ سوکھ رہی ہے پھیکی، زرد دوپہر
دیواروں کو چاٹ رہا ہے تنہائی کا زہر
دور اُفق تک گھٹتی بڑھتی، اُٹھتی گرتی رہتی ہے
کہر کی صورت بے رونق دردوں کی گدلی لہر

بستا ہے اس کہر کے پیچھے روشنیوں کا شہر
اے روشنیوں کے شہر

کون کہے کس سمت ہے تیری روشنیوں کی راہ
ہر جانب بے نور کھڑی ہے ہجر کی شہر پناہ
تھک کر ہر سو بیٹھ رہی ہے شوق کی ماند سپاہ

آج مرا دل فکر میں ہے
اے روشنیوں کے شہر
شب خوں سے مُونہہ پھیر نہ جائے ارمانوں کی رَو
خیر ہو تیری لیلاؤں کی، ان سب سے کہہ دو
آج کی شب جب دیے جلائیں اونچی رکھیں لَو

لاہور جیل
منٹگمری جیل
۲۸ر مارچ - ۱۵ر اپریل ۵۴ء

AFRICA COME BACK (ایک رجز)

آجاؤ، میں نے سن لی ترے ڈھول کی ترنگ
آجاؤ، مست ہو گئی میرے لہو کی تال
"آجاؤ ایفریقا"

آجاؤ، میں نے دھول سے ماتھا اٹھا لیا
آجاؤ، میں نے چھیل دی آنکھوں سے غم کی چھال
آجاؤ، میں نے درد سے بازو چھڑا لیا
آجاؤ، میں نے نوچ دیا بے کسی کا جال
"آجاؤ ایفریقا"

پنجے میں ہتھکڑی کی کڑی بن گئی ہے گرز
گردن کا طوق توڑ کے ڈھالی ہے میں نے ڈھال
"آجاؤ ایفریقا"

جلتے ہیں ہر کچھار میں بھالوں کے مرگ نین
دشمن لہو سے رات کی کالک ہوئی ہے لال
"آجاؤ ایفریقا"

دھرتی دھڑک رہی ہے مرے ساتھ ایفریقا
دریا تھرک رہا ہے تو بن دے رہا ہے تال
میں ایفریقا ہوں، دھار لیا میں نے تیرا روپ
میں تو ہوں، میری چال ہے تیری ببر کی چال
"آجاؤ ایفریقا"

آؤ ببر کی چال
"آجاؤ ایفریقا"

منٹگمری جیل ۱۴ جنوری ۵۵ء

کوئی عاشق کسی محبوبہ سے!

یاد کی راہ گزر جس پہ اسی صورت سے
مدتیں بیت گئی ہیں تمہیں چلتے چلتے
ختم ہو جائے جو دو چار قدم اور چلو
موڑ پڑتا ہے جہاں دشتِ فراموشی کا
جس سے آگے نہ کوئی میں ہوں نہ کوئی تم ہو

سانس تھامے ہیں نگاہیں کہ نہ جانے کس دم
تم پلٹ آؤ، گزر جاؤ، یا مڑ کر دیکھو!

گرچہ واقف ہیں نگاہیں کہ یہ سب دھوکا ہے
گر کہیں تم سے ہم آغوش ہوئی پھر سے نظر
پھوٹ نکلے گی وہاں اور کوئی راہ گزر

پھر اسی طرح جہاں ہوگا مقابل پیہم
سایۂ زلف کا اور جنبشِ بازو کا سفر

دوسری بات بھی جھوٹی ہے کہ دل جانتا ہے
یاں کوئی موڑ، کوئی دشت، کوئی گھات نہیں
جس کے پردے میں مرا ماہِ رواں ڈوب سکے
تم سے چلتی رہے یہ راہ، یونہی اچھا ہے
تم نے مڑ کر بھی نہ دیکھا تو کوئی بات نہیں

فیض احمد

★

گلوں میں رنگ بھرے بادِ نوبہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

قفس اداس ہے یارو، صبا سے کچھ تو کہو
کہیں تو بہرِ خدا آج ذکرِ یار چلے

کبھی تو صبح، ترے کنجِ لب سے ہو آغاز
کبھی تو شب، سرِ کاکل سے مشکبار چلے

بڑا ہے درد کا رشتہ، یہ دل غریب سہی
تمہارے نام پہ آئیں گے غمگسار چلے

جو ہم پہ گزری سو گزری مگر شبِ ہجراں
ہمارے اشک تری عاقبت سنوار چلے

حضورِ یار ہوئی دفترِ جنوں کی طلب
گرہ میں لے کے گریباں کا تار تار چلے

مقامِ فیض، کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

منٹگمری جیل ۲۹ر جنوری ۵۴ء

★

کچھ محتسبوں کی خلوت میں، کچھ واعظ کے گھر جاتی ہے
ہم بادہ کشوں کے حصے کی، اب جام میں کمتر جاتی ہے

یوں عرض و طلب سے کب اے دل، پتھر دل پانی ہوتے ہیں
تم لاکھ رضا کی خو ڈالو، کب خوئے ستمگر جاتی ہے

بیداد گروں کی بستی ہے، یاں داد کہاں خیرات کہاں
سر پھوڑتی پھرتی ہے ناداں فریاد جو در در جاتی ہے

ہاں، جاں کے زیاں کی ہم کو بھی تشویش ہے لیکن کیا کیجے
ہر رہ جو اُدھر کو جاتی ہے، مقتل سے گزر کر جاتی ہے

اب کوچۂ دلبر کا رہرو، رہزن بھی بنے تو بات بنے
پہرے سے عدو ٹلتے ہی نہیں اور رات برابر جاتی ہے

ہم اہلِ قفس تنہا بھی نہیں، ہر روز نسیمِ صبحِ وطن
یادوں سے معطر آتی ہے، اشکوں سے منور جاتی ہے

منٹگمری جیل ۱۷ر جون ۵۴ء

اگست ۵۵ء

شہر میں چاک گریباں ہوئے ناپید اب کے
کوئی کرتا ہی نہیں ضبط کی تاکید اب کے

لطف کر اے نگہِ یار، کہ غم والوں سے
حسرتِ دل کی اٹھائی نہیں تمہید اب کے

چاند دیکھا تری آنکھوں میں، نہ ہونٹوں پہ شفق
ملتی جلتی ہے شبِ غم سے تری دید اب کے

دل دکھا ہے نہ وہ پہلا سا، نہ جاں تڑپی ہے
ہم ہی غافل تھے کہ آئی ہی نہیں عید اب کے

پھر سے بجھ جائیں گی شمعیں جو ہوا تیز چلی
لا کے رکھو سرِ محفل کوئی خورشید اب کے

کراچی، ۱۴ر اگست ۵۵ء

بنیاد کچھ تو ہو

(قوّالی)

کوئے ستم کی خامشی آباد کچھ تو ہو
کچھ تو کہو ستم کشو، فریاد کچھ تو ہو
بیداد گر سے شکوۂ بیداد کچھ تو ہو
بولو، کہ شورِ حشر کی ایجاد کچھ تو ہو

مرنے چلے تو سطوتِ قاتل کا خوف کیا
اتنا تو ہو کہ باندھنے پائے نہ دست و پا
مقتل میں کچھ تو رنگ جمے جشنِ رقص کا
رنگیں لہو سے پنجۂ صیاد کچھ تو ہو
خوں پر گواہ دامنِ جلاد کچھ تو ہو
جب خوں بہا طلب کریں بنیاد کچھ تو ہو

گر تن نہیں، زباں سہی، آزاد کچھ تو ہو
دشنام، نالہ، ہاؤ ہو، فریاد کچھ تو ہو
چیخے ہے درد، اے دلِ برباد کچھ تو ہو
بولو کہ شورِ حشر کی ایجاد کچھ تو ہو
بولو کہ روزِ عدل کی بنیاد کچھ تو ہو

منٹگمری جیل

۱۳؍اپریل ۵۵ء

یہ فصل اُمیدوں کی ہمدم

سب کاٹ دو
بسمل پودوں کو
بے آب سسکتے مت چھوڑو
سب نوچ لو
بیکل پھولوں کو
شاخوں پہ بلکتے مت چھوڑو

یہ فصل امیدوں کی ہمدم
اس بار بھی غارت جائے گی
سب محنت صبحوں شاموں کی
اب کے بھی اکارت جائے گی

کھیتی کے کونوں کھدروں میں
پھر اپنے لہو کی کھاد بھرو
پھر مٹی سینچو اشکوں سے
پھر اگلی رت کی فکر کرو

پھر اگلی رت کی فکر کرو
جب پھر اک بار اجڑنا ہے
اک فصل پکی تو بھر پایا
جب تک تو یہی کچھ کرنا ہے

منٹگمری جیل ۳۰؍مارچ ۵۵ء

★

گرمیِ شوقِ نظارہ کا اثر تو دیکھو
گُل کھِلے جاتے ہیں، وہ سایۂ در تو دیکھو

ایسے ناداں بھی نہ تھے جاں سے گزرنے والے
ناصحو، پند گرو، راہ گزر تو دیکھو

وہ تو وہ ہے، تمہیں ہو جائے گی اُلفت مجھ سے
اِک نظر تم مرا محبُوبِ نظر تو دیکھو

وہ جو اب چاکِ گریباں بھی نہیں کرتے ہیں
دیکھنے والو، کبھی ان کا جگر تو دیکھو

دامنِ دَرد کو گلزار بنا رکھا ہے
آؤ اِک دن دلِ پُرخوں کا ہنر تو دیکھو

صبح کی طرح جھمکتا ہے شبِ غم کا اُفق
فیضؔ، تابندگیِ دیدۂ تر تو دیکھو

منٹگمری جیل ۳ مارچ ۵۵ء

دَرد آئے گا دَبے پاؤں ...

اور کچھ دیر میں، جب پھر مرے تنہا دِل کو
فکر آ لے گی کہ تنہائی کا کیا چارہ کرے
درد آئے گا دبے پاؤں، لئے سُرخ چراغ
وہ جو اِک درد دھڑکتا ہے کہیں دل سے پَرے

شعلۂ درد جو پہلو میں لپک اُٹھے گا
دل کی دیوار پہ ہر نقش دمک اُٹھے گا

حلقۂ زلف کہیں، گوشۂ رُخسار کہیں
ہجر کا دشت کہیں، گلشنِ دیدار کہیں
لُطف کی بات کہیں، پیار کا اقرار کہیں

دل سے پھر ہو گی مری بات کہ اے دل اے دل
یہ جو محبوب بنا ہے تری تنہائی کا
یہ تو مہماں ہے گھڑی بھر کا، چلا جائے گا
اس سے کب تیری مصیبت کا مداوا ہو گا
مشتعل ہو کے ابھی اُٹھیں گے وحشی سائے
یہ چلا جائے گا، رہ جائیں گے باقی سائے
رات بھر جن سے ترا خون خرابا ہو گا
جنگ ٹھہری ہے، کوئی کھیل نہیں ہے اے دِل
درد اور جنگ میں کچھ میل نہیں ہے اے دِل
دُشمنِ جاں ہیں سبھی، سارے کے سارے قاتل
یہ کڑی رات بھی، یہ سائے بھی، تنہائی بھی

لاؤ، سُلگاؤ کوئی جوشِ غضب کا انگار
طیش کی آتشِ جرّار کہاں ہے، لاؤ
وہ دہکتا ہُوا گلزار کہاں ہے، لاؤ
جس میں گرمی بھی ہے، حرکت بھی، توانائی بھی

ہو نہ ہو اپنے قبیلے کا بھی کوئی لشکر
منتظر ہو گا اندھیرے کی فصیلوں کے اُدھر

ان کو شعلوں کے رجز اپنا پتا تو دیں گے
خیر، ہم تک وہ نہ پہنچیں بھی، صدا تو دیں گے
دُور کتنی ہے ابھی صبح، بتا تو دیں گے

منٹگمری جیل یکم دسمبر ۵۴ء

★

ہم پر تمہاری چاہ کا الزام ہی تو ہے
دشنام تو نہیں ہے، یہ اکرام ہی تو ہے

کرتے ہیں جس پہ طعن کوئی جرم تو نہیں
شوقِ فضول و اُلفتِ ناکام ہی تو ہے

دِل مدعی کے حرفِ ملامت سے شاد ہے
اے جانِ جاں، یہ حرف ترا نام ہی تو ہے

دِل نا اُمید تو نہیں، ناکام ہی تو ہے
لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے

دستِ فلک میں گردشِ تقدیر تو نہیں
دستِ فلک میں گردشِ ایام ہی تو ہے

آخر تو ایک روز کرے گی نظر وفا
وہ یارِ خوش خصال سرِ بام ہی تو ہے

بھیگی ہے رات، فیض، غزل ابتدا کرو
وقتِ سرود، درد کا ہنگام ہی تو ہے

منٹگمری جیل
۹ مارچ ۵۴ء

اے حبیبِ عنبر دست!

(ایک اجنبی خاتون کے نام خوشبو کا تحفہ وصول ہونے پر)

کسی کے دستِ عنایت نے کنجِ زنداں میں
کیا ہے آج عجب دِل نواز بندوبست

مہک رہی ہے فضا زلفِ یار کی صورت
ہوا ہے گرمیٔ خوشبو سے اس طرح سرمست

ابھی ابھی کوئی گزرا ہے گُل بدن گویا
کہیں قریب سے، گیسو بدوش، غنچہ بدست

لیے ہے بوئے رفاقت اگر ہوائے چمن
تو لاکھ پہرے بٹھائیں قفس پہ ظلم پرست

ہمیشہ سبز رہے گی وہ شاخِ مہر و وفا
کہ جس کے ساتھ بندھی ہے دِلوں کی فتح و شکست

یہ شعرِ حافظِ شیراز، اے صبا! کہنا
ملے جو تجھ سے کہیں وہ حبیبِ عنبر دست
"خلل پذیر بود ہر بنا کہ می بینی
بجز بنائے محبت کہ خالی از خلل است"

سنٹرل جیل
حیدرآباد
۲۸-۲۹ اپریل ۵۲ء

★

ستم کی رسمیں بہت تھیں لیکن، نہ تھی تری انجمن سے پہلے
سزا، خطائے نظر سے پہلے، عتاب، جرمِ سخن سے پہلے

جو چل سکو تو چلو کہ راہِ وفا بہت مختصر ہوئی ہے
مقام ہے اب کوئی نہ منزل، فرازِ دار و رسن سے پہلے

نہیں رہی اب جنوں کی زنجیر پر وہ پہلی اجارہ داری
گرفت کرتے ہیں کرنے والے خرد پہ دیوانہ پن سے پہلے

کرے کوئی تیغ کا نظارا، اب ان کو یہ بھی نہیں گوارا
بضد ہے قاتل کہ جانِ بسمل فگار ہو جسم و تن سے پہلے

غرورِ سرو و سمن سے کہہ دو کہ پھر وہی تاجدار ہوں گے
جو خار و خس والیِ چمن تھے عروجِ سرو و سمن سے پہلے

ادھر تقاضے ہیں مصلحت کے، ادھر تقاضائے دردِ دل ہے
زباں سنبھالیں کہ دل سنبھالیں، اسیر ذکرِ وطن سے پہلے

حیدرآباد جیل
۱۷-۲۲ مئی سنہ ۵۴ء

★

شاخ پر خونِ گل رواں ہے وہی
شوخیِ رنگِ گلستاں ہے وہی
سر وہی ہے تو آستاں ہے وہی
جاں وہی ہے تو جانِ جاں ہے وہی
اب جہاں مہرباں نہیں کوئی
کوچۂ یار مہرباں ہے وہی
برق سو بار گر کے خاک ہوئی
رونقِ خاکِ آشیاں ہے وہی
آج کی شب وصال کی شب ہے
دل سے ہر روز داستاں ہے وہی
چاند تارے ادھر نہیں آتے
ورنہ زنداں میں آسماں ہے وہی

منٹگمری جیل

★

شامِ فراق، اب نہ پوچھ، آئی اور آ کے ٹل گئی
دل تھا کہ پھر بہل گیا، جاں تھی کہ پھر سنبھل گئی

بزمِ خیال میں ترے حسن کی شمع جل گئی
درد کا چاند بجھ گیا، ہجر کی رات ڈھل گئی

جب تجھے یاد کر لیا، صبح مہک مہک اٹھی
جب ترا غم جگا لیا، رات مچل مچل گئی

دل سے تو ہر معاملہ کر کے چلے تھے صاف ہم
کہنے میں ان کے سامنے بات بدل بدل گئی

آخرِ شب کے ہم سفر فیضؔ نہ جانے کیا ہوئے
رہ گئی کس جگہ صبا، صبح کدھر نکل گئی

جناح ہسپتال، کراچی
جولائی ۵۳ء

ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

(ایتھل اور جولیس روزنبرگ کے خطوط سے متاثر ہو کر لکھی گئی)

تیرے ہونٹوں کے پھولوں کی چاہت میں ہم
دار کی خشک ٹہنی پہ وارے گئے
تیرے ہاتوں کی شمعوں کی حسرت میں ہم
نیم تاریک راہوں میں مارے گئے

سولیوں پر ہمارے لبوں سے پرے
تیرے ہونٹوں کی لالی لپکتی رہی
تیری زلفوں کی مستی برستی رہی
تیرے ہاتھوں کی چاندی دمکتی رہی

جب گھلی تیری راہوں میں شامِ ستم
ہم چلے آئے، لائے جہاں تک قدم
لب پہ حرفِ غزل، دل میں قندیلِ غم
اپنا غم تھا گواہی ترے حسن کی
دیکھ قائم رہے اس گواہی پہ ہم
ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

نارسائی اگر اپنی تقدیر تھی
تیری الفت تو اپنی ہی تدبیر تھی
کس کو شکوہ ہے گر شوق کے سلسلے
ہجر کی قتل گاہوں سے سب جا ملے

قتل گاہوں سے چن کر ہمارے علم
اور نکلیں گے عشاق کے قافلے
جن کی راہِ طلب سے ہمارے قدم
مختصر کر چلے درد کے فاصلے
کر چلے جن کی خاطر جہاں گیر ہم
جاں گنوا کر تری دلبری کا بھرم
ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

منٹگمری جیل ۱۵ ،مئی ۱۹۵۴ء

دریچہ

گڑی ہیں کتنی صلیبیں مرے دریچے میں
ہر ایک اپنے مسیحا کے خوں کا رنگ لیے
ہر ایک وصلِ خداوند کی امنگ لیے

کسی پہ کرتے ہیں ابرِ بہار کو قرباں
کسی پہ قتل مہِ تابناک کرتے ہیں

کسی پہ ہوتی ہے سرمست شاخسار دو نیم
کسی پہ بادِ صبا کو ہلاک کرتے ہیں

ہر آئے دن یہ خداوندگانِ مہر و جمال
لہو میں غرق مرے غمکدے میں آتے ہیں

اور آئے دن مری نظروں کے سامنے ان کے
شہید جسم سلامت اٹھائے جاتے ہیں

منٹگمری جیل دسمبر ۵۴ء

★

رہِ خزاں میں تلاشِ بہار کرتے رہے
شبِ سیہ سے طلب حسنِ یار کرتے رہے

خیالِ یار، کبھی ذکرِ یار کرتے رہے
اسی متاع پہ ہم روزگار کرتے رہے

نہیں شکایتِ ہجراں کہ اس وسیلے سے
ہم ان سے رشتۂ دل استوار کرتے رہے

وہ دن کہ کوئی بھی جب وجہِ انتظار نہ تھی
ہم اُن میں تیرا سوا انتظار کرتے رہے

ہم اپنے راز پہ نازاں تھے، شرمسار نہ تھے
ہر ایک سے سخنِ رازدار کرتے رہے

ضیائے بزمِ جہاں بار بار ماند ہوئی
حدیثِ شعلہ رُخاں بار بار کرتے رہے

انہیں کے فیض سے بازارِ عقل روشن ہے
جو گاہ گاہ جنوں اختیار کرتے رہے

جناح ہسپتال، کراچی
۲۱ر اگست

★

بات بس سے نکل چلی ہے
دل کی حالت سنبھل چلی ہے

اب جنوں حد سے بڑھ چلا ہے
اب طبیعت بہل چلی ہے

اشک خوناب ہو چلے ہیں
غم کی رنگت بدل چلی ہے

یا یونہی بجھ رہی ہیں شمعیں
یا شبِ ہجر ٹل چلی ہے

لاکھ پیغام ہو گئے ہیں
جب صبا ایک پل چلی ہے

جاؤ اب سو رہو ستارو
درد کی رات ڈھل چلی ہے

منٹگمری جیل
۲۱ر نومبر ۵۳ء

★

صبح پھوٹی تو آسماں پہ ترے
رنگِ رُخسار کی پھوار گری
رات چھائی تو روئے عالم پر
تیری زُلفوں کی آبشار گری

★

شیخ صاحب سے رسم و راہ نہ کی
شکر ہے، زندگی تباہ نہ کی

تجھ کو دیکھا تو سیر چشم ہوئے
تجھ کو چاہا تو اور چاہ نہ کی

تیرے دستِ ستم کا عجز نہیں
دل ہی کافر تھا جس نے آہ نہ کی

تھے شبِ ہجر اور کام بہت
ہم نے فکرِ دلِ تباہ نہ کی

کون قاتل بچا ہے شہر میں فیضؔ
جس سے یاروں نے رسم و راہ نہ کی

★

کب یاد میں تیرا ساتھ نہیں، کب ہات میں تیرا ہات نہیں
صد شکر کہ اپنی راتوں میں اب ہجر کی کوئی رات نہیں
مشکل ہیں اگر حالات وہاں، دل بیچ آئیں جاں دے آئیں
دل والو کوچۂ جاناں میں کیا ایسے بھی حالات نہیں
جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا، وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے، اس جان کی تو کوئی بات نہیں
میدانِ وفا دربار نہیں، یاں نام و نسب کی پوچھ کہاں
عاشق تو کسی کا نام نہیں، کچھ عشق کسی کی ذات نہیں
گر بازی عشق کی بازی ہے، جو چاہو لگا دو، ڈر کیسا
گر جیت گئے تو کیا کہنا، ہارے بھی تو بازی مات نہیں

منٹگمری جیل

★

سب قتل ہو کے تیرے مقابل سے آئے ہیں
ہم لوگ سرخرو ہیں کہ منزل سے آئے ہیں
شمعِ نظر، خیال کے انجم، جگر کے داغ
جتنے چراغ ہیں، تری محفل سے آئے ہیں
اٹھ کر تو آ گئے ہیں تری بزم سے مگر
کچھ دل ہی جانتا ہے کہ کس دل سے آئے ہیں
ہر اک قدم اجل تھا، ہر اک گام زندگی
ہم گھوم پھر کے کوچۂ قاتل سے آئے ہیں
بادِ خزاں کا شکر کرو، فیضؔ، جس کے ہاتھ
نامے کسی بہار شمائل سے آئے ہیں

★

نہ آج لطف کر اتنا کہ کل گزر نہ سکے
وہ رات جو کہ ترے گیسوؤں کی رات نہیں

یہ آرزو بھی بڑی چیز ہے مگر ہمدم
وصالِ یار فقط آرزو کی بات نہیں

★

فکرِ سود و زیاں تو چھوٹے گی
منتِ این و آں تو چھوٹے گی
خیر، دوزخ میں مے ملے نہ ملے
شیخ صاحب سے جاں تو چھوٹے گی

ملاقات

یہ رات اس درد کا شجر ہے
جو مجھ سے تجھ سے عظیم تر ہے
عظیم تر ہے کہ اس کی شاخوں
میں لاکھ مشعل بکف ستاروں
کے کارواں، گھر کے کھو گئے ہیں
ہزار مہتاب، اس کے سائے
میں اپنا سب نور، رو گئے ہیں
یہ رات اس درد کا شجر ہے
جو مجھ سے تجھ سے عظیم تر ہے
مگر اسی رات کے شجر سے
یہ چند لمحوں کے زرد پتے
گرے ہیں، اور تیرے گیسوؤں میں
الجھ کے گلنار ہو گئے ہیں
اسی کی شبنم سے، خامشی کے
یہ چند قطرے، تری جبیں پر
برس کے، ہیرے پرو گئے ہیں

بہت سیہ ہے یہ رات لیکن
وہ نہرِ خوں جو مری صدا ہے
اسی کے سائے میں نور گر ہے
وہ موجِ زر جو تری نظر ہے

وہ غم جو اس وقت تیری باہوں
کے گلستاں میں سلگ رہا ہے
(وہ غم، جو اس رات کا ثمر ہے)
کچھ اور تپ جائے اپنی آہوں
کی آنچ میں تو یہی شرر ہے

ہر اک سیہ شاخ کی کماں سے
جگر میں ٹوٹے ہیں تیر جتنے
جگر سے نوچے ہیں، اور ہر اک
کا ہم نے تیشہ بنا لیا ہے

الم نصیبوں، جگر فگاروں
کی صبح، افلاک پر نہیں ہے
جہاں پہ ہم تم کھڑے ہیں دونوں
سحر کا روشن افق یہیں ہے

یہیں پہ غم کے شرار کھل کر
شفق کا گلزار بن گئے ہیں
یہیں پہ قاتل دکھوں کے تیشے
قطار اندر قطار کرنوں
کے آتشیں ہار بن گئے ہیں

یہ غم جو اس رات نے دیا ہے
یہ غم سحر کا یقیں بنا ہے
یقیں جو غم سے کریم تر ہے
سحر جو شب سے عظیم تر ہے

منٹگمری جیل ۱۲/اکتوبر-۲/نومبر ۵۳ء

یہ خوں کی مہک ہے کہ لبِ یار کی خوشبو
کس راہ کی جانب سے صبا آتی ہے دیکھو
گلشن میں بہار آئی کہ زنداں ہوا آباد
کس سمت سے نغموں کی صدا آتی ہے دیکھو

دیباچہ

شاید کبھی افشا ہو نگاہوں پہ تمہاری
ہر سادہ ورق، جس سخنِ کشتہ سے خوں ہے
شاید کبھی اس گیت کا پرچم ہو سرافراز
جو آمدِ صرصر کی تمنا میں نگوں ہے
شاید کبھی اِس دل کی کوئی رگ تمہیں چُبھ جائے
جو سنگِ سرِ راہ کی مانند زبوں ہے

دستِ تہِ سنگ آمدہ

بیزار فضا، درپئے آزارِ صبا ہے
یوں ہے کہ ہر اک ہمدمِ دیرینہ خفا ہے
ہاں بادہ کشو، آیا ہے اب رنگ پہ موسم
اب سیر کے قابل روشِ آب و ہوا ہے
اُمڈی ہے ہر اک سمت سے الزام کی برسات
چھائی ہوئی ہر دانگ ملامت کی گھٹا ہے
وہ چیز بھری ہے کہ سُلگتی ہے صراحی
ہر کاسۂ مے زہرِ ہلاہل سے سوا ہے
ہاں جام اُٹھاؤ کہ بیادِ لبِ شیریں
یہ زہر تو یاروں نے کئی بار پیا ہے
اِس جذبۂ دل کی نہ سزا ہے نہ جزا ہے
مقصودِ رہِ شوق وفا ہے، نہ جفا ہے
احساسِ غمِ دل جو غمِ دل کا صلا ہے
اُس حسن کا احساس ہے جو تیری عطا ہے
ہر صبحِ گلستاں، ہے ترا روئے بہاریں
ہر پھول تری یاد کا نقشِ کفِ پا ہے
ہر بھیگی ہوئی رات، تری زلف کی شبنم
ڈھلتا ہوا سورج، ترے ہونٹوں کی فضا ہے
ہر راہ پہنچتی ہے تری چاہ کے در تک
ہر حرفِ تمنا، ترے قدموں کی صدا ہے
تعزیرِ سیاست ہے، نہ غیروں کی خطا ہے
وہ ظلم جو ہم نے دلِ وحشی پہ کیا ہے
زندانِ رہِ یار میں پابند ہوئے ہم
زنجیر بکف ہے، نہ کوئی بند بپا ہے
"مجبوری و دعوائے گرفتاریِ اُلفت
دستِ تہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے"

غزل

بساطِ رقص پہ صد شرق و غرب سے سرِ شام
دمک رہا ہے تری دوستی کا ماہِ تمام
چھلک رہی ہے ترے حسنِ مہرباں کی شراب
بھرا ہوا ہے لبالب ہر اک نگاہ کا جام
گلے میں تنگ ترے حرفِ لطف کی باہیں
پسِ خیال کہیں ساعتِ سفر کا پیام

ابھی سے یاد میں ڈھلنے لگی ہے صحبتِ شب
ہر اک روئے حسیں ہو چلا ہے بیش حسیں
ملے کچھ ایسے جُدا یوں ہوئے کہ فیضؔ اب کے
جو دل پہ نقش بنے گا، وہ گُل ہے، داغ نہیں

ہانگ چاؤ (چین)
جولائی ۱۹۵۶

سفرنامہ

پیکنگ

(۱)

یوں گماں ہوتا ہے، بازو ہیں مرے ساٹھ کروڑ
اور آفاق کی حد تک مرے تن کی حد ہے
دل مرا کوہ و دمن، دشت و چمن کی حد ہے

میرے کیسے میں ہے راتوں کا سیہ فام جلال
میرے ہاتھوں میں ہے صبحوں کی عنانِ گلگوں
میری آغوش میں پلتی ہے خدائی ساری
میرے مقدور میں ہے معجزۂ کُن فیکوں

سنکیانگ

(۲)

اب کوئی طبل بجے گا، نہ کوئی شاہسوار
صبح دم موت کی وادی کو روانہ ہوگا
اب کوئی جنگ نہ ہوگی، نہ کبھی رات گئے
خون کی آگ کو اشکوں سے بجھانا ہوگا

کوئی دل دھڑکے گا شب بھر، نہ کسی آنگن میں
وہم منحوس پرندے کی طرح آئے گا
سہم، خوں خوار درندے کی طرح آئے گا
اب کوئی جنگ نہ ہوگی، مے و ساغر لاؤ
خوں لٹانا نہ کبھی اشک بہانا ہوگا
ساقیا! رقص کوئی، رقصِ صبا کی صورت
مطربہ! کوئی غزل، رنگِ حنا کی صورت

شام

اِس طرح ہے کہ ہر اک پیڑ کوئی مندر ہے
کوئی اُجڑا ہوا بے نور پُرانا مندر
ڈھونڈتا ہے جو خرابی کے بہانے کب سے
چاک ہر بام، ہر اک در کا دمِ آخر ہے
آسماں کوئی پروہت ہے جو ہر بام تلے
جسم پر راکھ ملے، ماتھے پہ سیندور ملے
سرنگوں بیٹھا ہے چپ چاپ نہ جانے کب سے
اِس طرح ہے کہ پسِ پردہ کوئی ساحر ہے
جس نے آفاق پہ پھیلایا ہے یوں سحر کا دام
دامنِ وقت سے پیوست ہے یوں دامنِ شام
اب کبھی شام بجھے گی نہ اندھیرا ہوگا
اب کبھی رات ڈھلے گی نہ سویرا ہوگا

آسماں آس لیے ہے کہ یہ جادو ٹوٹے
چُپ کی زنجیر کٹے، وقت کا دامن چھوٹے
دے کوئی سنکھ دُہائی، کوئی پایل بولے
کوئی بُت جاگے، کوئی سانولی گھونگھٹ کھولے

○

مے خانوں کی رونق ہیں کبھی خانقہوں کی
اپنا لی ہوس والوں نے، جو رسم چلی ہے
دلداریِ واعظ کو ہمیں باقی ہیں ورنہ
اب شہر میں ہر رندِ خرابات ولی ہے

تم یہ کہتے ہو اب کوئی چارہ نہیں

تم یہ کہتے ہو، وہ جنگ ہو بھی چکی
جس میں رکھا نہیں ہے کسی نے قدم
کوئی اُترا نہ میداں میں، دشمن نہ ہم
کوئی صف بن نہ پائی، نہ کوئی علم
منتشر دوستوں کو صدا دے سکا
اجنبی دشمنوں کا پتہ دے سکا
تم یہ کہتے ہو، وہ جنگ ہو بھی چکی
جس میں رکھا نہیں ہم نے اب تک قدم

تم یہ کہتے ہو، اب کوئی چارہ نہیں
جسم خستہ ہے ہاتھوں میں یارا نہیں

اپنے بس کا نہیں بارِ سنگِ ستم
بارِ سنگِ ستم، بارِ کہسارِ غم
جس کو چھو کر سبھی اِک طرف ہو گئے
بات کی بات میں ذی شرف ہو گئے

دوستو، کوئے جاناں کی نامہرباں
خاک پر اپنے روشن لہو کی بہار
اب نہ آئے گی کیا؟ اب کھلے گا نہ کیا
اب کفِ نازنیں پر کوئی لالہ زار؟
اِس حزیں خامشی میں نہ لوٹے گا کیا
شور آوازِ حق، نعرۂ گیرودار

شوق کا امتحاں جو ہوا سو ہوا
جسم و جاں کا زیاں جو ہوا سو ہوا
سُود سے پیشتر ہے زیاں اور بھی
دوستو، ماتمِ جسم و جاں اور بھی
اور بھی تلخ تر امتحاں اور بھی

جنوری ۱۹۵۸

○

جمے گی کیسے بساطِ یاراں کہ شیشہ و جام بجھ گئے ہیں
سجے گی کیسے شبِ نگاراں کہ دل سرِ شام بجھ گئے ہیں

وہ تیرگی ہے رہِ بتاں میں، چراغِ رخ ہے نہ شمعِ وعدہ
کرن کوئی آرزو کی لاؤ کہ سب در و بام بجھ گئے ہیں

بہت سنبھالا وفا کا پیماں، مگر وہ برسی ہے اب کے برکھا
ہر ایک اقرار مٹ گیا ہے، تمام پیغام بجھ گئے ہیں

قریب آ اے مہِ شبِ غم، نظر پہ کھلتا نہیں کچھ اس دم
کہ دل پہ کس کس کا نقش باقی ہے کون سے نام بجھ گئے ہیں

بہار اب آ کے کیا کرے گی کہ جن سے تھا جشنِ رنگ و نغمہ
وہ گل سرِ شاخ جل گئے ہیں، وہ دل تہِ دام بجھ گئے ہیں

جشن کا دن

جنوں کی یاد مناؤ کہ جشن کا دن ہے
صلیب و دار سجاؤ کہ جشن کا دن ہے

طرب کی بزم ہے، بدلو دلوں کے پیراہن
جگر کے چاک سِلاؤ کہ جشن کا دن ہے

تنک مزاج ہے ساقی، نہ رنگِ مے دیکھو
بھرے جو شیشہ، چڑھاؤ کہ جشن کا دن ہے

تمیزِ رہبر و رہزن کرو نہ آج کے دن
ہر اک سے ہاتھ ملاؤ کہ جشن کا دن ہے

ہے انتظارِ ملامت میں ناصحوں کا ہجوم
نظر سنبھال کے جاؤ کہ جشن کا دن ہے

بہت عزیز ہو، لیکن شکستہ دل یارو
تم آج یاد نہ آؤ کہ جشن کا دن ہے

وہ شورشِ غمِ دل جس کی لے نہیں کوئی
غزل کی دُھن میں سناؤ کہ جشن کا دن ہے

مارچ ۱۹۵۷

شورشِ زنجیر بسم اللہ

ہوئی پھر امتحانِ عشق کی تدبیر بسم اللہ
ہر اک جانب مچا کہرامِ دار و گیر بسم اللہ
گلی کوچوں میں بکھری شورشِ زنجیر بسم اللہ

درِ زنداں پہ بلوائے گئے پھر سے جنوں والے
دریدہ دامنوں والے، پریشاں گیسوؤں والے
جہاں میں دردِ دل کی پھر ہوئی توقیر بسم اللہ
ہوئی پھر امتحانِ عشق کی تدبیر بسم اللہ

گنو سب داغ دل کے، حسرتیں شوقیں نگاہوں کی
سرِ دربار پرسش ہو رہی ہے پھر گناہوں کی
کرو یارو شمارِ نالۂ شب گیر بسم اللہ

ستم کی داستاں، کشتہ دلوں کا ماجرا کہیے
جو زیرِ لب نہ کہتے تھے، وہ سب کچھ برملا کہیے
مُصر ہے محتسب، رازِ شہیدانِ وفا کہیے
لگی ہے حرفِ ناگفتہ پہ اب تعزیر بسم اللہ
سرِ مقتل چلو بے زحمتِ تقصیر بسم اللہ
ہوئی پھر امتحانِ عشق کی تدبیر بسم اللہ

لاہور جیل
جنوری ۱۹۵۹

آج بازار میں پابجولاں چلو

چشمِ نم، جانِ شوریدہ کافی نہیں
تہمتِ عشقِ پوشیدہ کافی نہیں
آج بازار میں پابجولاں چلو

دستِ افشاں چلو، مست و رقصاں چلو
خاک بر سر چلو، خوں بہ داماں چلو
راہ تکتا ہے سب شہرِ جاناں چلو

حاکمِ شہر بھی، مجمعِ عام بھی
تیرِ الزام بھی، سنگِ دشنام بھی
صبحِ ناشاد بھی، روزِ ناکام بھی

اُن کا دم ساز اپنے سوا کون ہے
شہرِ جاناں میں اب باصفا کون ہے
دستِ قاتل کے شایاں رہا کون ہے

رختِ دل باندھ لو دل فگارو چلو
پھر ہمیں قتل ہو آئیں، یارو چلو

لاہور جیل
۱۱۔ فروری ۱۹۵۹

○

ڈھلتی ہے موجِ مے کی طرح رات ان دنوں
کھلتی ہے صبحِ گُل کی طرح رنگ و بُو سے پُر
ویراں ہیں جام، پاس کرو کچھ بہار کا
دِل آرزو سے پُر کرو، آنکھیں لہو سے پُر

○

آگئی فصلِ سکوں چاک گریباں والو
سِل گئے ہونٹ، کوئی زخم سِلے یا نہ سِلے
دوستو بزم سجاؤ کہ بہار آئی ہے
کھِل گئے زخم، کوئی پھول کھِلے یا نہ کھِلے

اپریل ۱۹۵۹

○

ہم خستہ تنوں سے محتسبو کیا مال منال کا پوچھتے ہو
جو عمر سے ہم نے بھر پایا، سب سامنے لائے دیتے ہیں
دامن میں ہے مشتِ خاکِ جگر، ساغر میں ہے خونِ حسرتِ مے
لو ہم نے دامن جھاڑ دیا، لو جام الٹائے دیتے ہیں

قلعہ لاہور
مارچ ۱۹۵۸

○

کب ٹھہرے گا درد اے دِل، کب رات بسر ہوگی
سنتے تھے وہ آئیں گے، سنتے تھے سحر ہوگی
کب جان لہو ہوگی، کب اشک گہر ہوگا
کس دن تری شنوائی اے دیدۂ تر ہوگی
کب مہکے گی فصلِ گُل، کب بہکے گا مے خانہ
کب صبحِ سخن ہوگی، کب شامِ نظر ہوگی
واعظ ہے نہ زاہد ہے، ناصح ہے نہ قاتل ہے
اب شہر میں یاروں کی کس طرح بسر ہوگی
کب تک ابھی رہ دیکھیں اے قامتِ جانانہ
کب حشر معیّن ہے، تجھ کو تو خبر ہوگی

دسمبر ۱۹۵۹

○

دید ہے نہ سخن، اب نہ حرف ہے نہ پیام
ئی بھی حیلۂ تسکیں نہیں اور آس بہت ہے
اُمیدِ یار، نظر کا مزاج، درد کا رنگ
تم آج کچھ بھی نہ پوچھو کہ دل اُداس بہت ہے

○

بے دم ہوئے بیمار دوا کیوں نہیں دیتے
تم اچھے مسیحا ہو، شفا کیوں نہیں دیتے

دردِ شبِ ہجراں کی جزا کیوں نہیں دیتے
خونِ دلِ وحشی کا صلا کیوں نہیں دیتے

مٹ جائے گی مخلوق تو انصاف کرو گے
منصف ہو تو اب حشر اُٹھا کیوں نہیں دیتے

ہاں نکتہ ورو، لاؤ لب و دل کی گواہی
ہاں نغمہ گرو، ساز صدا کیوں نہیں دیتے

پیمانِ جنوں ہاتھوں کو شرمائے گا کب تک
دل والو، گریباں کا پتہ کیوں نہیں دیتے

بربادیِ دل جبر نہیں فیضؔ کسی کا
وہ دشمنِ جاں ہے تو بھلا کیوں نہیں دیتے

لاہور جیل
۳۱-دسمبر ۱۹۵۸

○

رات ڈھلنے لگی ہے سینوں میں
آگ سلگاؤ آبگینوں میں
دلِ عُشاق کی خبر لینا
پھول کھلتے ہیں ان مہینوں میں

○

آج تنہائی کسی ہمدمِ دیریں کی طرح
کرنے آئی ہے مری ساقی گری شام ڈھلے
منتظر بیٹھے ہیں ہم دونوں کہ مہتاب اُبھرے
اور ترا عکس جھلکنے لگے ہر سائے تلے

اپریل ۱۹۵۷

○

یہ جفائے غم کا چارہ، وہ نجاتِ دل کا عالم
ترا حُسن، دستِ عیسیٰ، تری یاد رُوئے مریم

دل و جاں فدائے راہے، کبھی آ کے دیکھ ہمدم
سرِ کوئے دل فگاراں شبِ آرزو کا عالم

تری دید سے سوا ہے ترے شوق میں بہاراں
وہ زمیں جہاں گری ہے ترے گیسوؤں کی شبنم

یہ عجب قیامتیں ہیں تری رہ گزر میں گزراں
نہ ہوا کہ مر مٹیں ہم، نہ ہوا کہ جی اُٹھیں ہم

لو سُنی گئی ہماری، یوں پھرے ہیں دن کہ پھر سے
وہی گوشۂ قفس ہے، وہی فصلِ گُل کا ماتم

لاہور جیل
فروری ۱۹۵۹

دو مرثیے

(۱)

ملاقات مری

ساری دیوار سیہ ہو گئی تا حلقۂ بام
راستے بجھ گئے، رخصت ہوئے رہ گیر تمام
اپنی تنہائی سے گویا ہوئی پھر رات مری
ہو نہ ہو آج پھر آئی ہے ملاقات مری
اک ہتھیلی پہ حنا، ایک ہتھیلی پہ لہو
اک نظر زہر لئے، ایک نظر میں دارو
دیر سے منزلِ دل میں کوئی آیا نہ گیا
فرقتِ درد میں بے آب ہوا تختۂ داغ
کس سے کہیے کہ بھرے رنگ سے زخموں کے ایاغ
اور پھر خود ہی چلی آئی ملاقات مری
آشنا موت، جو دشمن بھی ہے غم خوار بھی ہے
وہ جو ہم لوگوں کی قاتل بھی ہے دلدار بھی ہے

(۲)

ختم ہوئی بارشِ سنگ

ناگہاں آج مرے تارِ نظر سے کٹ کر
ٹکڑے ٹکڑے ہوئے آفاق پہ خورشید و قمر

اب کسی سمت اندھیرا نہ اجالا ہوگا
بجھ گئی دل کی طرح راہِ وفا میرے بعد
دوستو! قافلۂ درد کا اب کیا ہوگا

اب کوئی اور کرے پرورشِ گلشنِ غم
دوستو، ختم ہوئی دیدۂ تر کی شبنم
تھم گیا شورِ جنوں، ختم ہوئی بارشِ سنگ
خاکِ رہ آج لئے ہے لبِ دلدار کا رنگ
کوئے جاناں میں کھلا میرے لہو کا پرچم
دیکھیے دیتے ہیں کس کس کو صدا میرے بعد
"کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق
ہے مکرّر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد"

نومبر ۱۹۶۰

غزل

ترے غم کو جاں کی تلاش تھی، ترے جاں نثار چلے گئے
تری رہ میں کرتے تھے سر طلب، سرِ رہ گزار چلے گئے

تری کج ادائی سے ہار کے شبِ انتظار چلی گئی
مرے ضبطِ حال سے روٹھ کر مرے غم گسار چلے گئے

نہ سوالِ وصل، نہ عرضِ غم، نہ حکایتیں نہ شکایتیں
ترے عہد میں دلِ زار کے سب اختیار چلے گئے

یہ ہمیں تھے جن کے لباس پر سرِ رہ سیاہی لکھی گئی
یہی داغ تھے جو سجا کے ہم سرِ بزمِ یار چلے گئے

نہ رہا جنونِ رخِ وفا، یہ رسن یہ دار کرو گے کیا
جنہیں جرمِ عشق پہ ناز تھا، وہ گناہ گار چلے گئے

• جولائی ۱۹۵۹

آج یوں موج در موج غم تھم گیا، اِس طرح غم زدوں کو قرار آگیا
جیسے خوشبوئے زلفِ بہار آگئی، جیسے پیغامِ دیدارِ یار آگیا
جس کی دید و طلب وہم سمجھے تھے ہم، رُوبرو پھر سرِ رہ گزار آگیا
صبحِ فردا کو پھر دل ترسنے لگا، عمرِ رفتہ ترا اعتبار آگیا
رُت بدلنے لگی رنگِ دل دیکھنا، رنگِ گلشن سے اب حال کھلتا نہیں
زخم چھلکا کوئی یا کوئی گُل کھِلا، اشک اُمڈے کہ ابرِ بہار آگیا
خونِ عشاق سے جام بھرنے لگے، دِل سُلگنے لگے داغ جلنے لگے
محفلِ درد پھر رنگ پر آگئی، پھر شبِ آرزو پر نکھار آگیا
سرفروشی کے انداز بدلے گئے، دعوتِ قتل پر مقتلِ شہر میں
ڈال کر کوئی گردن میں طوق آگیا، لاد کر کوئی کاندھے پہ دار آگیا
فیض کیا جانئے یار کس آس پر، منتظر ہیں کہ لائے گا کوئی خبر
مے کشوں پر ہوا محتسب مہرباں، دِل فگاروں پہ قاتل کو پیار آگیا

غزل

نہ گنواؤ ناوکِ نیم کش، دلِ ریزہ ریزہ گنوا دیا
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو، تنِ داغ داغ لُٹا دیا
مرے چارہ گر کو نوید ہو، صفِ دشمناں کو خبر کرو
جو وہ قرض رکھتے تھے جان پر وہ حساب آج چکا دیا
کرو کج جبیں پہ سرِ کفن، مرے قاتلوں کو گماں نہ ہو
کہ غرورِ عشق کا بانکپن، پسِ مرگ ہم نے بھلا دیا
اُدھر ایک حرف کہ کشتنی، یہاں لاکھ عذر تھا گفتنی
جو کہا تو سُن کے اُڑا دیا، جو لکھا تو پڑھ کے مٹا دیا
جو رُکے تو کوہِ گراں تھے ہم، جو چلے تو جاں سے گزر گئے
رہِ یار، ہم نے قدم قدم تجھے یادگار بنا دیا

قیدِ تنہائی

دُور آفاق پہ لہرائی کوئی نور کی لہر
خواب ہی خواب میں بیدار ہوا درد کا شہر
خواب ہی خواب میں بیتاب نظر ہونے لگی
عدم آبادِ جدائی میں سحر ہونے لگی
کاسۂ دل میں بھری اپنی صبوحی میں نے
گھول کر تلخیِ دیروز میں اِمروز کا زہر
دُور آفاق پہ لہرائی کوئی نور کی لہر
آنکھ سے دُور کسی صبح کی تمہید لئے
کوئی نغمہ، کوئی خوشبو، کوئی کافر صورت
عدم آبادِ جدائی میں مسافر صورت
بے خبر گزری، پریشانیِ اُمید لئے
گھول کر تلخیِ دیروز میں اِمروز کا زہر
حسرتِ روزِ ملاقات رقم کی میں نے
دیس پردیس کے یارانِ قدح خوار کے نام
حسنِ آفاق، جمالِ لب و رخسار کے نام

زندانِ قلعۂ لاہور
مارچ ۱۹۵۶

قطعہ

اِن دنوں رسم و رہِ شہرِ نگاراں کیا ہے
قاصدا، قیمتِ گلگشتِ بہاراں کیا ہے
کوئے جاناں ہے کہ مقتل ہے کہ میخانہ ہے
آج کل صورتِ بربادیِ یاراں کیا ہے

شہرِ یاراں

آسماں کی گود میں دم توڑتا ہے طفلِ ابر
جم رہا ہے ابر کے ہونٹوں پہ خوں آلود کف
بجھتے بجھتے بجھ گئی ہے عرش کے حجروں میں آگ
دھیرے دھیرے بچھ رہی ہے ماتمی تاروں کی صف
اے صبا شاید ترے ہمراہ یہ خوں ناک شام
سر جھکائے جا رہی ہے شہرِ یاراں کی طرف
شہرِ یاراں جس میں اس دم ڈھونڈتی پھرتی ہے موت
شیر دل بانکوں میں اپنے تیر و نشتر کے ہدف
اِک طرف بجتی ہیں جوشِ زیست کی شہنائیاں
اِک طرف چنگھاڑتے ہیں اہرمن کے طبل و دف
جا کے کہنا اے صبا، بعد از سلام دوستی
آج شب جس دم گزر ہو شہرِ یاراں کی طرف
دشتِ شب میں اس گھڑی چپ چاپ ہے شاید رواں
ساقیِ صبحِ طرب، نغمہ بہ لب، ساغر بکف
وہ پہنچ جائے تو ہوگی پھر سے برپا انجمن
اور ترتیبِ مقام و منصب و جاہ و شرف

حمد

ملکۂ شہرِ زندگی تیرا
شکر کس طور سے ادا کیجے
دولتِ دل کا کچھ شمار نہیں
تنگ دستی کا کیا گلا کیجے

جو ترے حسن کے فقیر ہوئے
اُن کو تشویشِ روزگار کہاں؟
درد بیچیں گے، گیت گائیں گے
اِس سے خوش وقت روزگار کہاں؟

جام چھلکا تو جم گئی محفل
منتِ لطفِ غم گسار کیے
اشک ٹپکا تو کھِل گیا گلشن
رنجِ کم ظرفیِ بہار کیے

خوش نشیں ہیں کہ چشم و دل کی مراد
دَیر میں ہے نہ خانقاہ میں ہے
ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں
ہر صنم اپنی بارگاہ میں ہے

کون ایسا غنی ہے جس سے کوئی
نقدِ شمس و قمر کی بات کرے
جس کو شوقِ نبرد ہو ہم سے
جائے تسخیرِ کائنات کرے

جون ۱۹۵۹

خوشا ضمانتِ غم

دیارِ یار تری جوششِ جنوں پہ سلام
مرے وطن، ترے دامانِ تار تار کی خیر
رہِ یقین، تری افشانِ خاک و خوں پہ سلام
مرے چمن، ترے زخموں کے لالہ زار کی خیر
ہر ایک خانۂ ویراں کی تیرگی پہ سلام
ہر ایک خاک بسر خانماں خراب کی خیر
ہر ایک کشتۂ ناحق کی خامشی پہ سلام
ہر ایک دیدۂ پُرنم کی آب و تاب کی خیر
رواں رہے یہ روایت، خوشا ضمانتِ غم
نشاطِ ختمِ غمِ کائنات سے پہلے
ہر اک کے ساتھ رہے دولتِ امانتِ غم
کوئی نجات نہ پائے نجات سے پہلے
سکوں ملے نہ کبھی تیرے پا فگاروں کو
جمالِ خونِ سرِ خار کو نظر نہ لگے
اماں ملے نہ کہیں تیرے جاں نثاروں کو
جلالِ فرقِ سرِ دار کو نظر نہ لگے

لندن ۱۹۶۲

جب تیری سمندر آنکھوں میں

(گیت)

یہ دھوپ کنارا شام ڈھلے
ملتے ہیں دونوں وقت جہاں
جو رات نہ دن، جو آج نہ کل
پل بھر کو امر، پل بھر میں دھواں
اِس دھوپ کنارے پل دو پل
ہونٹوں کی لپک
باہوں کی چھنک
یہ میل ہمارا جھوٹ نہ سچ
کیوں راز کرو، کیوں دوش دھرو
کس کارن جھوٹی بات کرو
جب تیری سمندر آنکھوں میں
اس شام کا سورج ڈوبے گا
سُکھ سوئیں گے گھر دَر والے
اور راہی اپنی رہ لے گا

لندن ۱۹۶۳

کہاں جاؤ گے

اور کچھ دیر میں لُٹ جائے گا ہر بام پہ چاند
عکس کھو جائیں گے، آئینے ترس جائیں گے
عرش کے دیدۂ نمناک سے باری باری
سب ستارے سرِ خاشاک برس جائیں گے
آس کے مارے تھکے ہارے شبستانوں میں
اپنی تنہائی سمیٹے گا، بچھائے گا کوئی
بے وفائی کی گھڑی، ترکِ مدارات کا وقت
اُس گھڑی اپنے سوا یاد نہ آئے گا کوئی
ترکِ دنیا کا سماں، ختمِ ملاقات کا وقت
اِس گھڑی اے دلِ آوارہ کہاں جاؤ گے
اِس گھڑی کوئی کسی کا بھی نہیں، رہنے دو
کوئی اِس وقت ملے گا ہی نہیں، رہنے دو
اور ملے گا بھی تو اِس طور کہ پچھتاؤ گے
اِس گھڑی اے دلِ آوارہ کہاں جاؤ گے

اور کچھ دیر ٹھہر جاؤ کہ پھر نشترِ صبح
زخم کی طرح ہر اک آنکھ کو بیدار کرے
اور ہر کشتۂ واماندگیِ آخرِ شب
بھول کر ساعتِ درماندگیِ آخرِ شب
جان پہچان ملاقات پہ اصرار کرے

دسمبر ۱۹۶۱

○

یک بیک شورشِ فغاں کی طرح
فصلِ گل آئی امتحاں کی طرح

صحنِ گلشن میں بہرِ مشتاقاں
ہر روش کھنچ گئی کماں کی طرح

پھر لہو سے ہر ایک کاسۂ داغ
پُر ہوا جامِ ارغواں کی طرح

یاد آیا جنونِ گم گشتہ
بے طلب قرضِ دوستاں کی طرح

جانے کس پر ہو مہرباں قاتل
بے سبب مرگِ ناگہاں کی طرح

ہر صدا پر لگے ہیں کان یہاں
دل سنبھالے رہو زباں کی طرح

مئی ۱۹۶۲

رنگ ہے دل کا مرے

تم نہ آئے تھے تو ہر چیز وہی تھی کہ جو ہے
آسماں حدِ نظر، راہ گزر راہ گزر، شیشۂ مے شیشۂ مے
اور اب شیشۂ مے، راہ گزر، رنگِ فلک
رنگ ہے دل کا مرے، "خونِ جگر ہونے تک"
چمپئی رنگ کبھی، راحتِ دیدار کا رنگ
سرمئی رنگ کہ ہے ساعتِ بیزار کا رنگ
زرد پتّوں کا، خس و خار کا رنگ
سرخ پھولوں کا، دہکتے ہوئے گلزار کا رنگ
زہر کا رنگ، لہو رنگ، شبِ تار کا رنگ
آسماں، راہ گزر، شیشۂ مے
کوئی بھیگا ہوا دامن، کوئی دکھتی ہوئی رگ
کوئی ہر لحظہ بدلتا ہوا آئینہ ہے
اب جو آئے ہو تو ٹھہرو کہ کوئی رنگ، کوئی رُت، کوئی شے
ایک جگہ پر ٹھہرے

پھر سے اک بار ہر اک چیز وہی ہو کہ جو ہے
آسماں حدِ نظر، راہ گزر راہ گزر، شیشۂ مے شیشۂ مے

ماسکو
اگست ۱۹۶۳

پاس رہو

تم مرے پاس رہو
میرے قاتل، مرے دلدار، مرے پاس رہو
جس گھڑی رات چلے
آسمانوں کا لہو پی کے سیہ رات چلے
مرہمِ مشک لیے، نشترِ الماس لیے
بین کرتی ہوئی، ہنستی ہوئی، گاتی نکلے
درد کی کاسنی پازیب بجاتی نکلے
جس گھڑی سینوں میں ڈوبے ہوئے دل
آستینوں میں نہاں ہاتھوں کی رہ تکنے لگیں
آس لیے
اور بچوں کے بلکنے کی طرح قُلقُلِ مے
بہرِ ناسودگی مچلے تو منائے نہ منے
جب کوئی بات بنائے نہ بنے
جب نہ کوئی بات چلے
جس گھڑی رات چلے
جس گھڑی ماتمی، سنسان، سیہ رات چلے
پاس رہو
میرے قاتل، مرے دلدار مرے پاس رہو

ماسکو ۱۹۶۳

منظر

رہ گزر، سایے، شجر، منزل دُور، حلقۂ بام
بام پر سینۂ مہتاب کھُلا آہستہ
جس طرح کھولے کوئی بندِ قبا آہستہ
حلقۂ بام تلے، سایوں کا ٹھہرا ہوا نیل
نیل کی جھیل
جھیل میں چُپکے سے تیرا کسی پتّے کا حباب
ایک پل تیرا، چلا، پھُوٹ گیا آہستہ
بہت آہستہ، بہت ہلکا، خنک رنگِ شراب
میرے شیشے میں ڈھلا آہستہ
شیشۂ و جام، صراحی، ترے ہاتھوں کے گلاب
جس طرح دُور کسی خواب کا نقش
آپ ہی آپ بنا اور مِٹا آہستہ

دِل نے دُہرایا کوئی حرفِ وفا آہستہ
تم نے کہا "آہستہ"
چاند نے جھُک کے کہا
"اور ذرا آہستہ"

ماسکو ۱۹۶۴

○

شرحِ فراق، مدحِ لبِ مُشکبُو کریں
غربت کدے میں کس سے تری گفتگو کریں

یار آشنا نہیں کوئی، ٹکرائیں کس سے جام
کس دِل رُبا کے نام پہ خالی سبو کریں

سینے پہ ہاتھ ہے، نہ نظر کو تلاشِ بام
دِل ساتھ دے تو آج غمِ آرزو کریں

کب تک سُنے گی رات، کہاں تک سُنائیں ہم
شکوے گِلے سب آج ترے رُوبرو کریں

ہمدم، حدیثِ کُوئے ملامت سُنائیو
دِل کو لہو کریں کہ گریباں رفو کریں

آشفتہ سر ہیں، محتسبو، مونہہ نہ آئیو
سر بیچ دیں تو فکرِ دل و جاں عدو کریں

"تر دامنی" پہ شیخ، ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

گماں مبر کہ بپایاں رسید کارِ مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

(اقبال)

جس روز قضا آئے گی

ہم نے سب شعر میں سنوارے تھے
ہم سے جتنے سخن تمہارے تھے

رنگ و خوشبو کے، حسن و خوبی کے
تم سے تھے جتنے استعارے تھے

تیرے قول و قرار سے پہلے
اپنے کچھ اور بھی سہارے تھے

جب وہ لعل و گہر حساب کیے
جو ترے غم نے دل پہ وارے تھے

میرے دامن میں آ گرے سارے
جتنے طشتِ فلک میں تارے تھے

عمرِ جاوید کی دعا کرتے
فیضؔ اتنے وہ کب ہمارے تھے

۱۹۷۲ء

کس طرح آئے گی جس روز قضا آئے گی
شاید اس طرح کہ جس طور کبھی اوّلِ شب
بے طلب پہلے پہل مرحمتِ بوسۂ لب
جس سے کھلنے لگیں ہر سمت طلسمات کے در
اور کہیں دور سے انجان گلابوں کی بہار
یک بیک سینۂ مہتاب کو تڑپانے لگے

۲

شاید اس طرح کہ جس طور کبھی آخرِ شب
نیم وا کلیوں سے سرسبز سحر
یک بیک حجرۂ محبوب میں لہرانے لگے
اور خاموش دریچوں سے بہ ہنگامِ رحیل
جھنجھناتے ہوئے تاروں کی صدا آنے لگے

کس طرح آئے گی جس روز قضا آئے گی
شاید اس طرح کہ جس طور تہِ نوکِ سناں
کوئی رگ واہمۂ درد سے چلّانے لگے
اور قزاقِ سناں دست کا دھندلا سایہ
از کراں تا بہ کراں دہر پہ منڈلانے لگے

جس طرح آئے گی جس روز قضا آئے گی
خواہ قاتل کی طرح آئے کہ محبوب صفت
دل سے بس ہو گی یہی حرفِ وداع کی صورت
للہ الحمد بانجامِ دلِ دل زدگاں
کلمۂ شکر بنامِ لبِ شیریں دہناں

۱۹۷۲ء

پنجابی نظماں

لمی رات سی درد فراق والی
تیرے قول تے اساں وساہ کر کے
کوڑا گھٹ کیتی مٹھڑے یار میرے
مٹھڑے یار میرے، جانی یار میرے
تیرے قول تے اساں وساہ کر کے
جھانجراں وانگ زنجیراں چھنکائیاں نیں،
کدی پیریں بیڑیاں چائیاں نیں،
کدی کنیں مندراں پائیاں نیں
تیری تاہنگ وچ پٹ دا ماس دے کے
اساں کاگ سدّے، اساں سینہ گھلّے
رات مکدی اے، یار آوندا اے
اسیں تک دے رہے ہزار وتے
کوئی آیا نہ بناں ختنا میاں دے
کوئی پجیا نہ سوا الاہمیاں دے
آج لاہ الاہمے مٹھڑے یار میرے
آج آ ویہڑے وچھڑے یار میرے
فجر ہووے تے آکھیے بسم اللہ
آج دولتاں ساڈے گھر آئیاں نیں
جیہدے قول تے اساں وساہ کیتا
اوہنے اوڑک توڑ نبھائیاں نیں

۱۹۷۱ء

گیت

کدھرے نہ پیندیاں دساں
وے پردیسیا تیریاں
کاگ اڈاواں، شگن مناواں
وگدی وا دے ترلے پاواں
تیری یاد پوے تے روواں
ترا ذکر کراں تاں ہساں
کدھرے نہ پیندیاں دساں
وے پردیسیا تیریاں

درد نہ دساں گھلدی جاواں
راز نہ کھولاں مکدی جاواں
کس نوں دل دے داغ وکھاواں
کس در اگے جھولی ڈھاواں
وے میں کس دا دامن کھساں
کدھرے نہ پیندیاں دساں
وے پردیسیا تیریاں

شام اڈیکاں، فجر اڈیکاں
آکھیں تے ساری عمر اڈیکاں
آنڈ گوانڈی دیوے بلدے
ربّا ساڈا چانن گھلدے
جگ وسدا اے میں وی وساں
کدھرے نہ پیندیاں دساں
کدھرے نہ پیندیاں دساں
وے پردیسیا تیریاں

ویرا[1] کے نام

اُس نے کہا آؤ،
اُس نے کہا ٹھہرو
مسکاؤ کہا اُس نے
مر جاؤ کہا اُس نے
میں آیا،
میں ٹھہر گیا،
مسکایا
اور مر بھی گیا

---

[1] ناظم حکمت کی روسی بیوی

ربّا سچیا

ربّا سچیا توں تے آکھیا سی
جا اوئے بندیا جگ دا شاہ ہیں توں
ساڈیاں نعمتاں تیریاں دولتاں نیں،
ساڈا نیب تے عالی جاہ ہیں توں،
ایس لارے تے ٹور کدی پچھیا اسی
کیہہ ایس نمانے تے بیتیاں نیں
کدی سار دی لئی او رب سائیاں
تیرے شاہ نال جگ کیہہ کیتیاں نیں
کتے دھونس پولیس سرکار دی اے
کتے دھاندلی مال پٹوار دی اے
اینویں ہڈاں وچ کلپے جان میری
جیویں پھاہی وچ کونج کرلاوندی اے
چنگا شاہ بنایا ای رب سائیاں
پولے کھاندیاں وار نہ آوندی اے

مینوں شاہی نئیں چاہیدی رب میرے
میں تے عزت دا ٹکر منگناں ہاں
مینوں تاہنگ نئیں، محلاں ماڑیاں دی
میں تے جیویں دی نکّر منگناں ہاں
میری منّیں تے تیریاں میں منّاں
تیری سونہہ جے اک وی گل موڑاں
جے ایہہ مانگ نئیں پجدی تیں ربا
فیر میں جاواں نے رب کوئی ہور لوڑاں

ناظم حکمت[1]

(زنداں سے ایک خط)

مری جاں تجھ کو بتلاؤں، بہت نازک یہ نکتہ ہے
بدل جاتا ہے انساں جب مکاں اس کا بدلتا ہے!
مجھے زنداں میں پیار آنے لگا ہے اپنے خوابوں پر
جو شب کی نیند اپنے مہرباں ہاتھوں سے
وا کرتی ہے در اس کا
تو آ گرتی ہے ہر دیوار اس کی میرے قدموں پر
میں ایسے غرق ہو جاتا ہوں اس دم اپنے خوابوں میں
کہ جیسے اک کرن ٹھہرے ہوئے پانی پہ گرتی ہے
میں ان لمحوں میں کتنا سرخوش و دل شاد پھرتا ہوں
جہاں کی جگمگاتی وسعتوں میں کس قدر آزاد پھرتا ہوں
جہاں درد و الم کا نام ہے کوئی نہ زنداں ہے
"تو پھر بیدار ہونا کس قدر تم پر گراں ہوگا؟"
نہیں ایسا نہیں ہے، میری جاں! میرا یہ قصہ ہے
میں اپنے عزم و ہمت سے
وہی کچھ کھینچتا ہوں نیند کو جو اس کا حصہ ہے

---

[1] ترکی کا شہرۂ آفاق شاعر جس نے پہلی جنگِ عظیم کے دوران ترکی کی جنگِ حریت میں حصہ لیا اور بعد میں بیشتر عمر قید و بند اور جلاوطنی میں گزاری۔ ۶۳ء میں وفات پائی۔

میری ڈولی شوہ دریا

(۱۹۷۴ء کے سیلاب زدوں کے امدادی فنڈ کے لیے لکھی گئی)

کل تائیں ساوُن بابلا
توں رکھیا ہِک نال لا
ست خیراں ساڈیاں منگیاں
جد جھلی تتی وا
اَج کیکن دیہڑیوں ٹُر ریا
کوئیں لاہے نی میرے چاء،
میرے گہنے نیل ہتھ پیر دے
میری ڈولی شوہ دریا
اَج لتھے سارے چاء،
میری ڈولی شوہ دریا'
نال رہڑ دیاں رُڑھ گیاں سدھراں
نال روندیاں رُل گئے نیر
نال ہُونج ہُونج کے لے گئے
میرے ہتھ دی لیکھ لکیر
میری چُنّی بک سواہ دی
میرا چولا لیر و لیر
تج پالن پوہڑے بھین دی
کوئی کرماں والے ویر
میرے کرماں والے ویر
میرا چولا لیر و لیر
میرے لتھے سارے چاء،
میری ڈولی شوہ دریا
میں ترکے اوتر حال
تُن ہاڑے اس مسکین دے
ربّا پورا کر سوال
میری جھوک دسے، میرا ویر وسے
فیر تیری رحمت نازل
کوئی پورا کرے سوال ربّا
تیری رحمت نال،
میرے لتھے سارے چاء،
میری ڈولی شوہ دریا

★

یہ کس خلش نے پھر اس دل میں آشیانہ کیا
پھر آج کس نے سخن ہم سے غائبانہ کیا

غمِ جہاں ہو، رخِ یار ہو کہ دستِ عدو
سلوک جس سے کیا ہم نے عاشقانہ کیا

تھے خاکِ راہ بھی ہم لوگ قہرِ طوفاں بھی
سہا تو کیا نہ سہا اور کیا تو کیا نہ کیا

خوشا کہ آج ہر اک مدعی کے لب پر ہے
وہ راز جس نے ہمیں راندۂ زمانہ کیا

وہ حیلہ گر جو وفا جو بھی ہے جفا خو بھی
کیا بھی فیضؔ تو کس بت سے دوستانہ کیا

۱۹۷۶ء

تم اپنی کرنی کر گزرو

اب کیوں اُس دن کا ذکر کرو
جب دل ٹکڑے ہو جائے گا
اور سارے غم مٹ جائیں گے
جو کچھ پایا کھو جائے گا
جو مل نہ سکا وہ پائیں گے
یہ دن تو وہی پہلا دن ہے
جو پہلا دن تھا چاہت کا
ہم جس کی تمنا کرتے رہے
اور جس سے ہر دم ڈرتے رہے
یہ دن تو کتنی بار آیا
سو بار بسے اور اُجڑ گئے
سو بار لٹے اور بھر پایا

اب کیوں اُس دن کی فکر کرو
جب دل ٹکڑے ہو جائے گا
اور سارے غم مٹ جائیں گے
تم خوف و خطر سے در گزرو
جو ہونا ہے سو ہونا ہے
گر ہنسنا ہے تو ہنسنا ہے
گر رونا ہے تو رونا ہے
تم اپنی کرنی کر گزرو
جو ہو گا دیکھا جائے گا

اکتوبر ۱۹۷۵ء

گیت

اب کیا دیکھیں راہ تمہاری
بیت چلی ہے رات
چھوڑو
چھوڑو غم کی بات
تھم گئے آنسو
تھک گئیں انکھیاں
گزر گئی برسات
بیت چلی ہے رات
چھوڑو
چھوڑو غم کی بات
کب سے آگ لگی درشن کی
کوئی نہ جانے بات
کوئی نہ جانے بات
بیت چلی ہے رات
چھوڑو غم کی بات
تم آؤ تو من میں اُترے
پھولوں کی بارات
بیت چلی ہے رات
اب کیا دیکھیں راہ تمہاری
بیت چلی ہے رات

(فلم: "جاگو ہوا سویرا")

بہار آئی

بہار آئی تو جیسے یک بار
لوٹ آئے ہیں پھر عدم سے
وہ خواب سارے، شباب سارے
جو تیرے ہونٹوں پہ مر مٹے تھے
جو مٹ کے ہر بار پھر جئے تھے
نکھر گئے ہیں گلاب سارے
جو تیری یادوں سے مشکبو ہیں
جو تیرے عشاق کا لہو ہیں
اُبل پڑے ہیں عذاب سارے
ملالِ احوالِ دوستاں بھی
خمارِ آغوشِ مہ وشاں بھی
غبارِ خاطر کے باب سارے
ترے ہمارے
سوال سارے جواب سارے
بہار آئی تو کھل گئے ہیں
نئے سرے سے حساب سارے

اپریل ۱۹۸۰ء

موری ارج سنو

(نذرِ خسرو)

"موری ارج سنو دست گیر پیر"
"مائی ری، کہوں کا سے میں
اپنے جیا کی پیر"
"نیا باندھو رے،
باندھو رے کنارِ دریا"
"مورے مندر اب کیوں نہیں آئے"

اس صورت سے
عرض سناتے
درد بتاتے
نیا کھیتے
منت کرتے
رستہ تکتے
کتنی صدیاں بیت گئی ہیں
اب جا کر یہ بھید کھلا ہے
جس کو تم نے عرض گزاری
جو تھا ہاتھ پکڑنے والا
جس جا لاگی ناؤ تمہاری
جس سے دکھ کا دارو مانگا
تورے مندر میں جو نہیں آیا
وہ تو تمہیں تھے
وہ تو تمہیں تھے

ستمبر ۱۹۷۵ء

امیدِ سحر کی بات سنو

جگر دریدہ ہوں چاکِ جگر کی بات سنو
الم رسیدہ ہوں دامانِ تر کی بات سنو
زباں بریدہ ہوں زخمِ گلو سے حرف کرو
شکستہ پا ہوں ملالِ سفر کی بات کرو
مسافرِ رہِ صحرائے ظلمتِ شب سے
اب التفاتِ نگارِ سحر کی بات سنو
سحر کی بات، امیدِ سحر کی بات سنو

●

نہ اب رقیب نہ ناصح نہ غم گسار کوئی
تم آشنا تھے تو تھیں آشنائیاں کیا کیا

جدا تھے ہم تو میسر تھیں قربتیں کتنی
بہم ہوئے تو پڑی ہیں جدائیاں کیا کیا

پہنچ کے در پہ ترے کتنے معتبر ٹھہرے
اگرچہ رہ میں ہوئیں جگ ہنسائیاں کیا کیا

ہم ایسے سادہ دلوں کی نیاز مندی سے
بتوں نے کی ہیں جہاں میں خدائیاں کیا کیا

ستم پہ خوش، کبھی لطف و کرم سے رنجیدہ
سکھائیں تم نے ہمیں کچھ ادائیاں کیا کیا

۱۹۷۴ء

گیت

(فلم "سکھ کا سپنا")

ہم تیرے پاس آئے
سارے بھرم مٹا کر
سب چاہتیں بھلا کر
کتنے اداس آئے
ہم تیرے پاس جا کر
کیا کیا نہ دل دکھا ہے
کیا کیا بہی ہیں انکھیاں
کیا کیا نہ ہم پہ بیتی
کیا کیا ہوئے پریشاں
ہم تجھ سے دل لگا کر
تجھ سے نظر ملا کر
کتنے فریب کھائے
اپنا تجھے بنا کر

ہم تیرے پاس آئے
سارے بھرم مٹا کر
تھی آس آج ہم پر، کچھ ہوگی مہربانی
ہلکا کریں گے جی کو، سب حالِ دل زبانی
تجھ کو سنا سنا کر
آنسو بہا بہا کر
کتنے اداس آئے
ہم تیرے پاس جا کر
ہم تیرے پاس آئے
سارے بھرم مٹا کر

ہمیں سے اپنی نوا ہم کلام ہوتی رہی
یہ تیغ اپنے لہو میں نیام ہوتی رہی

مقابل صفِ اعدا، جسے کیا آغاز
وہ جنگ اپنے ہی دل میں تمام ہوتی رہی

کوئی مسیحا نہ ایفائے عہد کو پہنچا
بہت تلاش میں قتلِ عام ہوتی رہی

یہ برہمن کا کرم، وہ عطائے شیخِ حرم
کبھی حیات کبھی مے حرام ہوتی ہے

جو کچھ بھی بن نہ پڑا فیض لٹ کے یاروں سے
تو رہزنوں سے دعا و سلام ہوتی ہے

●

حیراں ہے جبیں آج کدھر سجدہ روا ہے
سر پر ہیں خداوند، سرِ عرش خدا ہے

کب تک اسے سینچو گے تمنائے ثمر میں
یہ صبر کا پودا تو نہ پھولا نہ پھلا ہے

ملتا ہے خراج اس کو تری نانِ جویں سے
ہر بادشہِ وقت ترے در کا گدا ہے

ہر ایک عقوبت سے ہے تلخی میں سوا تر
وہ رنج جو ناکردہ گناہوں کی سزا ہے

احسان لئے کتنے مسیحا نفسوں کے
کیا کیجئے دل کا، نہ جلا ہے نہ بجھا ہے

اکتوبر ۱۹۷۷ء

اولجز عمر علی سلیمان[1]

صحرا کی رات

کہیں بھی شبنم کہیں نہیں ہے
عجب، کہ شبنم کہیں نہیں ہے
نہ سرد خورشید کی جبیں پر
کسی کے رُخ پر، نہ آستیں پر
ذرا سی شبنم کہیں نہیں ہے
پگھلے ہوئے پتھروں کی موجیں
خموش و ساکن
حرارتِ ماہِ نیم شب میں سُلگ رہی ہیں
— اور شبنم کہیں نہیں ہے
برہنہ پا غول گیدڑوں کے
لگا رہے ہیں ٹیلوں میں ٹھٹھے
کہ آج شبنم کہیں نہیں ہے
ببول کے استخواں کے ڈھانچے
پکارتے ہیں
نہیں ہے شبنم کہیں نہیں ہے
سفید، دُھندلائی روشنی میں
ہیں دشت کی چھاتیاں برہنہ
ترس رہی ہیں جو حسنِ انساں لیے کہ شبنم کا ایک قطرہ
کہیں پہ برسے
یہ چاند بھی سرد ہو رہے گا
اُفق پہ جب صبح کا کنارا
کسی کرن سے دہک اُٹھے گا
کہ ایک درماندہ راہرو کی
جبیں پہ شبنم کا ہاتھ چمکے

— انتہا —

★

حسرتِ دید میں گزراں ہیں زمانے کب سے
دشتِ امید میں گرداں ہیں زمانے کب سے

دیر سے آنکھ پہ اترا نہیں اشکوں کا عذاب
اپنے ذمے ہے ترا قرض نہ جانے کب سے

کس طرح پاک ہو بے آرزو لمحوں کا حساب
درد آیا نہیں دربار سجانے کب سے

سر کرو ساز کہ چھیڑیں کوئی دل سوز غزل
"ڈھونڈتا ہے دلِ شوریدہ بہانے کب سے"

پُر کرو جام کہ شاید ہو اسی لحظہ رواں
روک رکھا ہے جو اک تیر قضا نے کب سے

فیض پھر کب کسی مقتل میں کریں گے آباد
لب پہ ویراں ہیں شہیدوں کے فسانے کب سے

[1] قازقستان کا ممتاز نوجوان شاعر

گیت

منزلیں، منزلیں،
شوقِ دیدار کی منزلیں
حُسنِ دلدار کی منزلیں، پیار کی منزلیں
پیار کی بے پناہ رات کی منزلیں
کہکشاؤں کی بارات کی منزلیں
بلندی کی، ہمت کی، پرواز کی
جوشِ پرواز کی منزلیں
راز کی منزلیں
زندگی کی کٹھن راہ کی منزلیں
بلندی کی، ہمت کی، پرواز کی منزلیں
جوشِ پرواز کی منزلیں
راز کی منزلیں
آن ملنے کے دن
پھول کھلنے کے دن
وقت کے گھور ساگر میں صبح کی
شام کی منزلیں،
چاہ کی منزلیں
آس کی، پیاس کی
حسرتِ یار کی
پیار کی منزلیں
منزلیں حسنِ عالم کے گلزار کی
منزلیں، منزلیں
موج در موج ڈھلتی ہوئی، رات کے درد کی منزلیں
چاند تاروں کے ویران سنسار کی منزلیں
اپنی دھرتی کے آباد بازار کی منزلیں
حق کے عرفان کی
نورِ انوار کی منزلیں،
وصلِ دلدار کی منزلیں
قول و اقرار کی منزلیں،
منزلیں، منزلیں

(فلم "قسم اُس وقت کی")

★

تجھے پکارا ہے بے ارادہ
جو دل دکھا ہے بہت زیادہ

ندیم ہو تیرا حرفِ شیریں
تو رنگ پر آئے رنگِ بادہ

عطا کرو اک ادائے دیریں
تو اشک سے تر کریں لبادہ

نہ جانے کس دن سے منتظر ہے
دلِ سرِ رہگزر فتادہ

کہ ایک دن پھر نظر میں آئے
وہ بامِ روشن، وہ درِ کشادہ

وہ آئے پرسش کو پھر سجائے
قبائے رنگیں، ادائے سادہ

آج اِک حرف کو
پھر ڈھونڈتا پھرتا ہے خیال

(۱)

آج اِک حرف کو پھر ڈھونڈتا پھرتا ہے خیال
مَدھ بھرا حرف کوئی، زہر بھرا حرف کوئی
دِل نشیں حرف کوئی، قہر بھرا حرف کوئی
حرفِ اُلفت کوئی دلدارِ نظر ہو جیسے
جس سے ملتی ہے نظر بوسۂ لب کی صورت
اتنا روشن کہ سرِ موجۂ زر ہو جیسے
صحبتِ یار میں آغازِ طرب کی صورت
حرفِ نفرت کوئی شمشیرِ غضب ہو جیسے
تا ابد شہرِ ستم جس سے تبہ ہو جائیں
اتنا تاریک کہ شمشان کی شب ہو جیسے
لب پہ لاؤں تو مرے ہونٹ سیہ ہو جائیں

(۲)

آج ہر سُر سے ہر اِک راگ کا ناتا ٹوٹا
ڈھونڈتی پھرتی ہے مطرب کو پھر اُس کی آواز
جوششِ درد سے مجنوں کے گریباں کی طرح
چاک در چاک ہوا آج ہر اِک پردۂ ساز
آج ہر موجِ ہوا سے ہے سوالی خلقت
لا کوئی نغمہ، کوئی صَوت، تری عمر دراز
نوحۂ غم ہی سہی، شورِ شہادت ہی سہی
صُورِ محشر ہی سہی، بانگِ قیامت ہی سہی

جولائی ۱۹۷۶ء

کچھ عشق کیا، کچھ کام کیا

وہ لوگ بہت خوش قسمت تھے
جو عشق کو کام سمجھتے تھے
یا کام سے عاشقی کرتے تھے
ہم جیتے جی مصروف رہے
کچھ عشق کیا، کچھ کام کیا
کام عشق کے آڑے آتا رہا
اور عشق سے کام اُلجھتا رہا
پھر آخر تنگ آکر ہم نے
دونوں کو اَدھورا چھوڑ دیا

۱۹۷۶ء

قطعہ

اَج رات اِک رات دی رات جی کے
اَساں جُگ ہزاراں جی لِتا اے
اَج رات اَمرت دے جام وانگوں
اِنہاں ہتھاں نے یار نوں پی لِتا اے

لینن گراڈ کا گورستان

سرد سِلوں پر
زرد سِلوں پر
تازہ گرم لہو کی صورت
گلدستوں کے چھینٹے ہیں
کتبے سب بے نام ہیں لیکن
ہر اک پھول پہ نام لکھا ہے
غافل سونے والے کا
یاد میں رونے والے کا
اپنے فرض سے فارغ ہو کر
اپنے لہو کی تان کے چادر
سارے بیٹے خواب میں ہیں
اپنے غموں کا ہار پرو کر
اماں اکیلی جاگ رہی ہے۔

لینن گراڈ ۱۹۷۶ء

درِ اُمیّد کے دریوزہ گر

پھر پھریرے بن کے میرے تن بدن کی دھجیاں
شہر کے دیوار و در کو رنگ پہنانے لگیں
پھر کف آلودہ زبانیں مدح و ذم کی قمچیاں
میرے ذہن و گوش کے زخموں پہ برسانے لگیں

پھر نکل آئے ہوسناکوں کے رقصاں طائفے
دردمندِ عشق پر ٹھٹھے لگانے کے لئے
پھر دہل کرنے لگے تشہیرِ اخلاص و وفا
کشتۂ صدق و صفا کا دل جلانے کے لئے

ہم کہ ہیں کب سے درِ اُمّید کے دریوزہ گر
یہ گھڑی گزری تو پھر دستِ طلب پھیلائیں گے
کوچہ و بازار سے پھر چُن کے ریزہ ریزہ خواب
ہم یونہی پہلے کی صورت جوڑنے لگ جائیں گے

مارچ ۱۹۷۷ء

او میرے وطن

او میرے وطن! او میرے وطن! او میرے وطن!
مرے سر پر وہ ٹوپی نہ رہی
جو تیرے دیس سے لایا تھا
پاؤں میں وہ اب جوتے بھی نہیں
واقف کتے جو تیری راہوں سے
مرا آخری کرتا چاک ہوا
ترے شہر میں جو سلوایا تھا
اب تیری جھلک
بس اُڑتی ہوئی رنگت ہے میرے بالوں کی
یا جھرّیاں میرے ماتھے پر
یا میرا ٹوٹا ہوا دل ہے
وا میرے وطن! وا میرے وطن! وا میرے وطن!

مدح

حسین شہید سہروردی مرحوم نے راولپنڈی "سازش" کیس ملزموں کی جانب سے وکالت کی تھی۔ مقدمے کے خاتمے پر انہیں یہ سپاسنامہ پیش کیا گیا:

(۱)

کس طرح بیاں ہو ترا پیرایۂ تقریر
گویا سرِ باطل پہ چمکنے لگی شمشیر

وہ زور ہے اِک لفظ اِدھر نطق سے نکلا
واں سینۂ اغیار میں پیوست ہوئے تیر

گرمی بھی ہے، ٹھنڈک بھی، روانی بھی، سکوں بھی
تاثیر کا کیا کہیے، ہے تاثیر سی تاثیر

اعجاز اسی کا ہے کہ اربابِ ستم کی
اب تک کوئی انجام کو پہنچی نہیں تدبیر

اطرافِ وطن میں ہوا حق بات کا شہرہ
ہر ایک جگہ مکر و ریا کی ہوئی تشہیر

روشن ہوئے اُمید سے رُخ اہلِ وفا کے
پیشانیٔ اعدا پہ سیاہی ہوئی تحریر

(۲)

حرّیتِ آدم کی رہِ سخت کے رہگیر
خاطر میں نہیں لاتے خیالِ دمِ تعزیر

کچھ ننگ نہیں رنجِ اسیری کہ پُرانا
مردانِ صفا کیش سے ہے رشتۂ زنجیر

کب دبدبۂ جبر سے دبتے ہیں کہ جن کے
ایمان و یقیں دل میں کیے رہتے ہیں تنویر

معلوم ہے ان کو کہ رہا ہو گی کسی دن
ظالم کے گراں ہاتھ سے مظلوم کی تقدیر

آخر کو سرافراز ہوا کرتے ہیں احرار
آخر کو گرا کرتی ہے ہر جور کی تعمیر

ہر دَور میں سر ہوتے ہیں قصرِ جم و دارا
ہر عہد میں دیوارِ ستم ہوتی ہے تسخیر

ہر دَور میں ملعون شقاوت ہے شمر کی
ہر عہد میں مسعود ہے قربانیٔ شبّیر

(۳)

کرتا ہے قلم اپنے لب و نطق کی تطہیر
پہنچی ہے سرِ حرفِ دعا اب مری تحریر

ہر کام میں برکت ہو ہر اِک قول میں قوّت
ہر گام پہ ہو منزلِ مقصود قدم گیر

ہر لحظہ ترا طالعِ اقبال سوا ہو
ہر لحظہ مددگار ہو تدبیر کی تقدیر

ہر بات ہو مقبول، ہر اِک بول ہو بالا
کچھ اور بھی رونق میں بڑھے شعلۂ تقریر

ہر دن ہو ترا لطفِ زباں اور زیادہ
اللہ کرے زورِ بیاں اور زیادہ

اے شام مہرباں ہو!

اے شام مہرباں ہو
اے شامِ شہرِ یاراں
ہم پہ مہرباں ہو
دوزخی دوپہر ستم کی
بے سبب ستم کی
دوپہر درد و غیظ و غم کی
بے زباں درد و غیظ و غم کی
اس دوزخی دوپہر کے تازیانے
آج تن پر دھنک کی صورت
قوس در قوس بٹ گئے ہیں
زخم سب کھل گئے ہیں جن کے
داغ جانا تھا چھٹ گئے ہیں
ترے توشے میں کچھ تو ہوگا
مرہمِ درد کا دوشالہ
تن کے اس انگ پہ اُڑھا دے
درد سب سے سوا جہاں ہو
اے شام مہرباں ہو
اے شامِ شہرِ یاراں
ہم پہ مہرباں ہو

دوزخی دشت نفرتوں کے
بے درد نفرتوں کے
کرچیاں دیدۂ حسد کی
خس و خاشاک رنجشوں کے
اتنی سنسان شاہراہیں
اتنی گنجان قتل گاہیں
جن سے آئے ہیں ہم گزر کر
آبلہ بن کے ہر قدم پر
یوں پاؤں کٹ گئے ہیں
رستے سمٹ گئے ہیں
مخملیں اپنے بادلوں کی
آج پاؤں تلے بچھا دے
شافیِ کربِ رہرواں ہو
اے شام مہرباں ہو
اے مہِ شبِ نگاراں
اے رفیقِ دلفگاراں
اس شام ہمزباں ہو
اے شام مہرباں ہو
اے شام مہرباں ہو
اے شامِ شہرِ یاراں
ہم پہ مہرباں ہو

۱۹۷۴ء

اشعار

وہ بتوں نے ڈالے ہیں وسوسے کہ دلوں سے خوفِ خدا گیا
وہ پڑی ہیں روز قیامتیں کہ خیالِ روزِ جزا گیا

جو نفس تھا خارِ گلو بنا، جو اُٹھے تھے ہاتھ لہو ہوئے
وہ نشاطِ آہِ سحر گئی، وہ وقارِ دستِ دعا گیا

جو طلب پہ عہدِ وفا کیا، تو وہ قدرِ رسمِ وفا گئی
سرِ عام جب ہوئے مدعی، تو ثوابِ صدق و صفا گیا

اشک آباد کی شام

جب سورج نے جاتے جاتے
اشک آباد کے نیلے افق سے
اپنے سنہری جام
میں ڈھالی
سرخیِ اوّلِ شام
اور یہ جام
تمہارے سامنے رکھ کر
تم سے کیا کلام
کہا پرنام
اٹھو
اور اپنے تن کی سیج سے اٹھ کر
اک شیریں پیغام
ثبت کرو اس شام
کسی کے نام
کنارِ جام
شاید تم یہ مان گئیں اور تم نے
اپنے لبِ گلفام
کیے انعام
کسی کے نام
کنارِ جام
یا شاید
تم اپنے تن کی سیج پہ سج کر
تھیں یوں محوِ آرام
کہ رستہ تکتے تکتے
بجھ گئی شمعِ جام
اشک آباد کے نیلے افق پر
غارت ہو گئی شام

۱۹۷۲ء

پاؤں سے لہو کو دھو ڈالو

ہم کیا کرتے کس رہ چلتے
ہر راہ میں کانٹے بکھرے تھے
ان رشتوں کے جو چھوٹ گئے
ان صدیوں کے یارانوں کے
جو اک اک کر کے ٹوٹ گئے
جس راہ چلے جس سمت گئے
یوں پاؤں لہو لہان ہوئے
سب دیکھنے والے کہتے تھے
یہ کیسی ریت رچائی ہے
یہ مہندی کیوں لگائی ہے
وہ کہتے تھے، کیوں قحطِ وفا
کا ناحق چرچا کرتے ہو
پاؤں سے لہو کو دھو ڈالو!
یہ راہیں جب اٹ جائیں گی
سو رستے ان سے پھوٹیں گے
تم دل کو سنبھالو جس میں ابھی
سو طرح کے نشتر ٹوٹیں گے

۱۹۷۳ء

منقبتِ امام

رات آئی ہے شبیر پہ یلغارِ بلا ہے
ساتھی نہ کوئی یار نہ غمخوار رہا ہے
مونس ہے تو اِک درد کی گھنگھور گھٹا ہے
مشفق ہے تو اِک دل کے دھڑکنے کی صدا ہے
تنہائی کی، غربت کی، پریشانی کی شب ہے
یہ خانۂ شبیرؑ کی ویرانی کی شب ہے

دشمن کی سپہ خواب میں مدہوش پڑی تھی
پل بھر کو کسی کی نہ اِدھر آنکھ لگی تھی
ہر ایک گھڑی آج قیامت کی گھڑی تھی
یہ رات بہت آلِ محمدؐ پہ کڑی تھی
رہ رہ کے بُکا اہلِ حرم کرتے تھے ایسے
تھم تھم کے دیا آخرِ شب جلتا ہے جیسے

اِک گوشہ میں ان سوختہ سامانوں کے سالار
اِن خاک بسر خانماں ویرانوں کے سردار
تشنہ لب و درماندہ و مجبور و دلِ افگار
اس شان سے بیٹھے تھے شہِ لشکرِ احرار
مسند تھی، نہ خلعت تھی، نہ خدام کھڑے تھے
ہاں تن پہ جدھر دیکھئے سو زخم سجے تھے

کچھ خوف تھا چہرے پہ نہ تشویش ذرا تھی
ہر ایک ادا مظہرِ تسلیم و رضا تھی
ہر ایک نگہ شاہدِ اقرارِ وفا تھی
ہر جنبشِ لب منکرِ دستورِ جفا تھی
پہلے تو بہت پیار سے ہر فرد کو دیکھا
پھر نام خدا کا لیا اور یوں ہوئے گویا

الحمد قریب آیا غمِ عشق کا ساحل
الحمد کہ اب صبحِ شہادت ہوئی نازل
بازی ہے بہت سخت میانِ حق و باطل
وہ ظلم میں کامل ہیں تو ہم صبر میں کامل
بازی ہوئی انجام، مبارک ہو عزیزو
باطل ہوا ناکام، مبارک ہو عزیزو

پھر صبح کی لَو آئی رخِ پاک پہ چمکی
اور ایک کرن مقتلِ خونناک پہ چمکی
نیزے کی انی تھی خس و خاشاک پہ چمکی
شمشیر برہنہ تھی کہ افلاک پہ چمکی
دم بھر کے لئے آئینہ رُو ہو گیا صحرا
خورشید جو اُبھرا تو لہو ہو گیا صحرا

پر باندھے ہوئے حملے کو آئی صفِ اعدا
تھا سامنے اِک بندۂ حق یکہ و تنہا
ہر چند کہ ہر اِک تھا اُدھر خون کا پیاسا
یہ رُعب کا عالم کہ کوئی پہل نہ کرتا
کی آنے میں تاخیر جو لیلائے قضا نے
خطبہ کیا ارشاد امامِ شہداء نے

فرمایا کہ کیوں درپئے آزار ہو لوگو
حق والوں سے کیوں برسرِ پیکار ہو لوگو
واللہ کہ مجرم ہو، گنہگار ہو لوگو
معلوم ہے کچھ کس کے طرفدار ہو لوگو
کیوں آپ کے آقاؤں میں اور ہم میں ٹھنی ہے
معلوم ہے کس واسطے اس جاں پہ بنی ہے

سطوت، نہ حکومت نہ حشم چاہیئے ہم کو
اورنگ نہ افسر، نہ علم چاہیئے ہم کو
زر چاہیئے، نے مال و درم چاہیئے ہم کو
جو چیز بھی فانی ہے وہ کم چاہیئے ہم کو
سرداری کی خواہش ہے نہ شاہی کی ہوس ہے
اِک حرفِ یقیں، دولتِ ایماں ہمیں بس ہے

طالب ہیں اگر ہم تو فقط حق کے طلبگار
باطل کے مقابل میں صداقت کے پرستار
انصاف کے، نیکی کے، مروّت کے طرفدار
ظالم کے مخالف ہیں تو بیکس کے مددگار
جو ظلم پہ لعنت نہ کرے، آپ لعیں ہے
جو جبر کا منکر نہیں، وہ منکرِ دیں ہے

تا حشر زمانہ تمہیں مکّار کہے گا
تم عہد شکن ہو تمہیں غدّار کہے گا
جو صاحبِ دل ہے ہمیں ابرار کہے گا
جو بندۂ حُر ہے، ہمیں احرار کہے گا
نام اونچا زمانے میں ہر انداز رہے گا
نیزے پہ بھی سر اپنا سرافراز رہے گا

کر ختم سخن محوِ دعا ہو گئے شبیر
پھر نعرہ زناں محوِ وغا ہو گئے شبیر
قربانِ رہِ صدق و صفا ہو گئے شبیر
خیموں میں تھا کہرام، جدا ہو گئے شبیر
مرکب پہ تنِ پاک تھا اور خاک پہ سر تھا
اس خاک تلے جنتِ فردوس کا در تھا

۱۹۶۴ء

مرے درد کو جو زباں ملے

مرا درد نغمۂ بے صدا
مری ذات ذرّۂ بے نشاں

مرے درد کو جو زباں ملے
مجھے اپنا نام و نشاں ملے

مری ذات کا جو نشاں ملے
مجھے رازِ نظمِ جہاں ملے

جو مجھے یہ رازِ نہاں ملے
مری خامشی کو بیاں ملے

مجھے کائنات کی سروری
مجھے دولتِ دو جہاں ملے

۱۹۷۳ء

ڈھاکہ سے واپسی پر

ہم کہ ٹھہرے اجنبی اتنی ملاقاتوں کے بعد
پھر بنیں گے آشنا کتنی ملاقاتوں کے بعد

کب نظر میں آئے گی بے داغ سبزے کی بہار
خون کے دھبے دھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد

تھے بہت بے درد لمحے ختمِ دردِ عشق کے
تھیں بہت بے مہر صبحیں مہرباں راتوں کے بعد

دل تو چاہا پر شکستِ دل نے مہلت ہی نہ دی
کچھ گلے شکوے بھی کر لیتے مناجاتوں کے بعد

اُن سے جو کہنے گئے تھے فیض جاں صدقہ کیے
اَن کہی ہی رہ گئی وہ بات سب باتوں کے بعد

۱۹۷۴ء

اشعار

جو پیرہن میں کوئی تار محتسب سے بچا
دراز دستیِ پیرِ مغاں کی نذر ہوا
اگر جراحتِ قاتل سے بخشوا لائے
تو دل سیاستِ چارہ گراں کی نذر ہوا

یہ موسمِ گل گرچہ طرب خیز بہت ہے
احوالِ گل و لالہ غم انگیز بہت ہے

خوش دعوتِ یاراں بھی ہے یلغارِ عدو بھی
کیا کیجیے دل کا جو کم آمیز بہت ہے

یوں پیرِ مغاں شیخِ حرم سے ہوئے یک جاں
میخانے میں کم ظرفیِ پرہیز بہت ہے

اِک گردنِ مخلوق جو ہر حال میں خم ہے
اِک بازوئے قاتل ہے کہ خوں ریز بہت ہے

کیوں مشعلِ دل فیض چھپاؤ تہِ داماں!
بجھ جائے گی یوں بھی کہ ہوا تیز بہت ہے

۱۹۷۵ء

قطعہ

ہزار دردِ شبِ آرزو کی راہ میں ہے
کوئی ٹھکانہ بتاؤ کہ قافلہ اُترے
قریب اور بھی آؤ کہ شوقِ دید مٹے
شراب اور پلاؤ کہ کچھ نشہ اُترے

ناصحم گفت. بجز غم چہ ہنر دارد عشق

بروائے خواجۂ عاقل ہنرے بہتر ازیں

حافظ

ویبقیٰ وجہ ربک

ہم دیکھیں گے
لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے
وہ دن کہ جس کا وعدہ ہے
جو لوحِ ازل میں لکھا ہے
جب ظلم و ستم کے کوہِ گراں
روئی کی طرح اڑ جائیں گے
ہم محکوموں کے پاؤں تلے
جب دھرتی دھڑ دھڑ دھڑکے گی
اور اہلِ حکم کے سر اوپر
جب بجلی کڑ کڑ کڑکے گی
جب ارضِ خدا کے کعبے سے
سب بت اٹھوائے جائیں گے
ہم اہلِ صفا، مردودِ حرم
مسند پہ بٹھائے جائیں گے
سب تاج اچھالے جائیں گے
سب تخت گرائے جائیں گے
بس نام رہے گا اللہ کا
جو غائب بھی ہے حاضر بھی
جو منظر بھی ہے ناظر بھی
اٹھے گا انا الحق کا نعرہ
جو میں بھی ہوں اور تم بھی ہو
اور راج کرے گی خلقِ خدا
جو میں بھی ہوں اور تم بھی ہو

امریکہ، جنوری ۱۹۷۹ء

دلِ من مسافرِ من

مرے دل، مرے مسافر
ہوا پھر سے حکم صادر
کہ وطن بدر ہوں ہم تم
دیں گلی گلی صدائیں
کریں رخ نگر نگر کا
کہ سراغ کوئی پائیں
کسی یارِ نامہ بر کا
ہر اک اجنبی سے پوچھیں
جو پتہ تھا اپنے گھر کا
سرِ کوئے ناشنایاں
ہمیں دن سے رات کرنا
کبھی اِس سے بات کرنا
کبھی اُس سے بات کرنا
تمہیں کیا کہوں کہ کیا ہے
شبِ غم بری بلا ہے
ہمیں یہ بھی تھا غنیمت
جو کوئی شمار ہوتا
ہمیں کیا برا تھا مرنا
اگر ایک بار ہوتا

لندن ۱۹۷۸ء

پھول مرجھا گئے سارے

پھول مرجھا گئے ہیں سارے
تھمتے نہیں ہیں آسماں کے آنسو
شمعیں بے نور ہو گئی ہیں
آئینے چور ہو گئے ہیں
ساز سب بج کے کھو گئے ہیں
پائلیں بجھ کے سو گئی ہیں
اور ان بادلوں کے پیچھے
دور اس رات کا دلارا

درد کا ستارا
ٹمٹما رہا ہے
جھنجھنا رہا ہے
مسکرا رہا ہے

لندن ۱۹۷۸ء

منظر

آسماں آج اک بحرِ پُر شور ہے
جس میں ہر سُو رواں بادلوں کے جہاز

ان کے عرشے پہ کرنوں کے مستول ہیں
بادبانوں کی پہنے ہوئے فرغلیں

نیل میں گنبدوں کے جزیرے کئی
ایک بازی میں مصروف ہے ہر کوئی

ابابیل کوئی نہاتی ہوئی
کوئی چیل غوطے میں جاتی ہوئی

کوئی طاقت نہیں ہے اس میں زور آزما
کوئی بیڑا نہیں ہے کسی ملک کا

اس کی تہہ میں کوئی آبدوزیں نہیں
کوئی راکٹ نہیں، کوئی توپیں نہیں

یوں تو سارے عناصر ہیں یاں زور میں
امن کتنا ہے اس بحرِ پُر شور میں

سمرقند، مارچ ۱۹۷۸ء

کوئی عاشق کسی محبوبہ سے

گلشنِ یاد میں گر آج دمِ بادِ صبا
پھر سے چاہے کہ گل افشاں ہو تو ہو جانے دو

عمرِ رفتہ کے کسی طاق پہ بسرا ہوا درد
پھر سے چاہے کہ فروزاں ہو تو ہو جانے دو

جیسے بیگانے سے اب ملتے ہو ویسے ہی سہی
آؤ دو چار گھڑی میرے مقابل بیٹھو

گرچہ مل بیٹھیں گے ہم تم تو ملاقات کے بعد
اپنا احساسِ زیاں اور زیادہ ہوگا

ہم سخن ہوں گے جو ہم دونوں تو ہر بات کے بیچ
ان کہی بات کا موہوم سا پردہ ہوگا

کوئی اقرار نہ میں یاد دلاؤں گا نہ تم
کوئی مضمون وفا کا نہ جفا کا ہوگا

گردِ ایام کی تحریر کو دھونے کے لیے
تم سے گویا ہوں دمِ دید جو میری پلکیں

تم جو چاہو تو سنو اور جو نہ چاہو نہ سنو

اور جو حرف کریں مجھ سے گریزاں آنکھیں

تم جو چاہو تو کہو اور جو نہ چاہو نہ کہو

لندن ۱۹۷۸ء

دو غزلیں

مخدوم کی یاد میں

★

"آپ کی یاد آتی رہی رات بھر"
چاندنی دل دکھاتی رہی رات بھر

گاہ جلتی ہوئی، گاہ بجھتی ہوئی
شمعِ غم جھلملاتی رہی رات بھر

کوئی خوشبو بدلتی رہی پیرہن
کوئی تصویر گاتی رہی رات بھر

پھر صبا سایۂ شاخِ گُل کے تلے
کوئی قصہ سناتی رہی رات بھر

جو نہ آیا اسے کوئی زنجیرِ در
ہر صدا پر بلاتی رہی رات بھر

ایک امید سے دل بہلتا رہا
اک تمنا ستاتی رہی رات بھر

ماسکو ستمبر ۱۹۷۸ء

★

"اسی انداز سے چل بادِ صبا آخرِ شب"

یاد کا پھر کوئی دروازہ کھلا آخرِ شب
دل میں بکھری کوئی خوشبوئے قبا آخرِ شب

صبح پھوٹی تو وہ پہلو سے اٹھا آخرِ شب
وہ جو اِک عمر سے آیا نہ گیا آخرِ شب

چاند سے ماند ستاروں نے کہا آخرِ شب
کون کرتا ہے وفا عہدِ وفا آخرِ شب

لمسِ جانانہ لیے، مستیٔ پیمانہ لیے
حمدِ باری کو اٹھے دستِ دعا آخرِ شب

گھر جو ویراں تھا سرِ شام وہ کیسے کیسے
فرقتِ یار نے آباد کیا آخرِ شب

جس ادا سے کوئی آیا تھا کبھی اوّلِ صبح
"اسی انداز سے چل بادِ صبا آخرِ شب"

ماسکو، اکتوبر ۱۹۷۸ء

دو نظمیں فلسطین کے لئے

(۱)

فلسطینی شہدا جو پردیس میں کام آئے

میں جہاں پر بھی گیا ارضِ وطن
تیری تذلیل کے داغوں کی جلن دل میں لئے
تیری حرمت کے چراغوں کی لگن دل میں لئے

تیری اُلفت، تری یادوں کی کسک ساتھ گئی
تیرے نارنج شگوفوں کی مہک ساتھ گئی

سارے اَن دیکھے رفیقوں کا جلو ساتھ رہا
کتنے ہاتھوں سے ہم آغوش مرا ہاتھ رہا

دُور پردیس کی بے مہر گزرگاہوں میں
اجنبی شہر کی بے نام و نشاں راہوں میں

جس زمیں پر بھی کھُلا میرے لہو کا پرچم
لہلہاتا ہے وہاں ارضِ فلسطیں کا عَلَم

تیرے اعدا نے کیا ایک فلسطیں برباد
میرے زخموں نے کیے کتنے فلسطیں آباد

بیروت، ۱۹۸۰ء

(۲)

فلسطینی بچے کے لئے لوری

مت رو بچے
رو رو کے ابھی
تیری امی کی آنکھ لگی ہے
مت رو بچے
کچھ ہی پہلے
تیرے ابا نے
اپنے غم سے رخصت لی ہے
مت رو بچے
تیرا بھائی
اپنے خواب کی تتلی پیچھے
دُور کہیں پردیس گیا ہے
مت رو بچے
تیرے آنگن میں
مُردہ سورج نہلا کے گئے ہیں
چندرما دفنا کے گئے ہیں
مت رو بچے
امی، ابا، باجی، بھائی،
چاند اور سورج
روئے گا تو اور بھی تجھ کو رُلوائیں گے
تو مُسکائے گا تو شاید
سارے اک دن بھیس بدل کر
تجھ سے کھیلنے لوٹ آئیں گے

بیروت، ۱۹۸۰ء

دو نظمیں

قفقاز کے شاعر قاسن علی سے ماخوذ

شاعر لوگ

ہر اک دور میں ہم، ہر زمانے میں ہم
زہر پیتے رہے، گیت گاتے رہے
جان دیتے رہے زندگی کے لئے
ساعتِ وصل کی سرخوشی کے لئے
دین و دنیا کی دولت لٹاتے رہے
فقر و فاقہ کا توشہ سنبھالے ہوئے
جو بھی رستہ چنا اس پہ چلتے رہے

مال والے حفاظت سے تکتے رہے
طعن کرتے رہے، ہاتھ ملتے رہے
ہم نے ان پر کیا حرفِ حق سنگ زن
جن کی ہیبت سے دنیا لرزتی رہی
جن پہ آنسو بہانے کو کوئی نہ تھا
اپنی آنکھ اُن کے غم میں برستی رہی
سب سے اوجھل ہوئے حکمِ حاکم پہ ہم
قید خانے سہے، تازیانے سہے
لوگ سُنتے رہے سازِ دل کی صدا
اپنے نغمے سلاخوں سے چھنتے رہے
خونچکاں دہر کا خونچکاں آئینہ
دُکھ بھری خلق کا دُکھ بھرا دل ہیں ہم
طبعِ شاعر ہے جنگاہ عدل و ستم
منصفِ خیر و شر، حق و باطل ہیں ہم

شوپیں کا نغمہ بجتا ہے

چھلنی ہے اندھیرے کا سینہ، برکھا کے بھالے برسے ہیں
دیواروں کے آنسو ہیں رواں، گھر خاموشی سے ڈوبے ہیں
پانی میں نہائے ہیں بوٹے
گلیوں میں ہُو کا پھیرا ہے
شوپیں کا نغمہ بجتا ہے
اِک غمگیں لڑکی کے چہرے پر چاند کی زردی چھائی ہے
جو برف گری تھی اس پہ لہو کے چھینٹوں کی روشنائی ہے
خون کا ہر داغ دمکتا ہے
شوپیں کا نغمہ بجتا ہے

کچھ آزادی کے متوالے، جاں کف پہ لیے میداں میں گئے
ہر سو دشمن کا نرغہ تھا، کچھ بچ نکلے، کچھ کھیت رہے
عالم میں ان کا شہرہ ہے
شوپیں کا نغمہ بجتا ہے
اک کونج کو سکھیاں چھوڑ گئیں آکاش کی نیلی راہوں میں
وہ یاد میں تنہا روتی تھی، لپٹائے اپنی باہوں میں
اک شاہیں اس پر جھپٹا ہے
شوپیں کا نغمہ بجتا ہے
غم نے سانچے میں ڈھالا ہے
اک باپ کے پتھر چہرے کو
مردہ بیٹے کے ماتھے کو
اک ماں نے رو کر چوما ہے
شوپیں کا نغمہ بجتا ہے
پھر پھولوں کی رت لوٹ آئی
اور چاہنے والوں کی گردن میں جھولے ڈالے باہوں نے
پھر جھرنے ناچے چھن چھن چھن
اب بادل ہے نہ برکھا ہے
شوپیں کا نغمہ بجتا ہے
شوپیں کا نغمہ بجتا ہے

ماسکو ۷۹ء

شوپیں CHOPIN پولینڈ کا ممتاز نغمہ ساز

میرے ملنے والے

وہ در کھلا میرے غم کدے کا
وہ آ گئے میرے ملنے والے

وہ آ گئی شام، اپنی راہوں میں
فرشِ افسردگی بچھانے

وہ آ گئی رات چاند تاروں کو
اپنی آزردگی سنانے

وہ صبح آئی دمکتے نشتر سے
یاد کے زخم کو منانے

وہ دوپہر آئی، آستیں میں
چھپائے شعلوں کے تازیانے

یہ آئے سب میرے ملنے والے
کہ جن سے دن رات واسطا ہے

یہ کون کب آیا، کب گیا ہے
نگاہ و دل کو خبر کہاں ہے

خیال سوئے وطن رواں ہے
سمندروں کی ایال تھامے

ہزار وہم و گماں سنبھالے
کئی طرح کے سوال تھامے

نذرِ حافظ

ناصحم گفت بجز غم چہ ہنر دارد عشق
بروائے خواجۂ عاقل ہنرے بہتر ازیں

قندِ دہن، کچھ اس سے زیادہ
لطفِ سخن، کچھ اس سے زیادہ

فصلِ خزاں میں لطفِ بہاراں
برگِ سمن، کچھ اس سے زیادہ

حالِ چمن پر تلخ نوائی
مرغِ چمن، کچھ اس سے زیادہ

دل شکنی بھی دلداری بھی
یادِ وطن، کچھ اس سے زیادہ

شمع بدن فانوسِ قبا ہے
خوبیٔ تن، کچھ اس سے زیادہ

عشق میں کیا ہے اس کے علاوہ
خواجۂ من، کچھ اس سے زیادہ

بیروت، ۱۹۸۰ء

کیا کریں

مری تری نگاہ میں
جو لاکھ انتظار ہیں
جو میرے تیرے تن بدن میں
لاکھ دل فگار ہیں
جو میری تیری انگلیوں کی بے حسی سے
سب قلم نزار ہیں
جو میرے تیرے شہر میں
ہر اک گلی میں
میرے تیرے نقشِ پا کے بے نشان مزار ہیں
جو میری تیری رات کے
ستارے زخم زخم ہیں
جو میری تیری صبح کے
گلاب چاک چاک ہیں
یہ زخم سارے بے دوا
یہ چاک سارے بے رفو
کسی پہ راکھ چاند کی
کسی پہ اوس کا لہو
یہ ہے بھی یا نہیں، بتا
یہ ہے کہ محض جال ہے
مرے تمہارے عنکبوت وہم کا بُنا ہوا
جو ہے تو اس کا کیا کریں
نہیں ہے تو بھی کیا کریں
بتا، بتا
بتا، بتا

بیروت، ۱۹۸۰ء

گاؤں کی سڑک

یہ دیس مفلس و نادار کج کلاہوں کا
یہ دیس بے زر و دینار بادشاہوں کا
کہ جس کی خاک میں قدرت ہے کیمیائی کی
یہ نائبانِ خداوندِ ارض کا مسکن
یہ نیک پاک بزرگوں کی رُوح کا مدفن
جہاں پہ چاند ستاروں نے جبہ سائی کی

نہ جانے کتنے زمانوں سے اس کا ہر رستہ
مثالِ خانۂ بے خانماں تھا دربستہ
خوشا کہ آج بفضلِ خدا وہ دن آیا
کہ دستِ غیب نے اس گھر کی در کشائی کی
چُنے گئے ہیں سبھی خار اس کی راہوں سے
سُنی گئی ہے بالآخر برہنہ پائی کی

بیروت، ۱۹۸۲ء

●

مقتل میں نہ مسجد نہ خرابات میں کوئی
ہم کس کی امانت میں غمِ کارِ جہاں دیں

شاید کوئی ان میں سے کفن پھاڑ کے نکلے
اب جائیں شہیدوں کے مزاروں پہ اذاں دیں

بیروت ۱۹۷۹ء

قوّالی

جلا پھر صبر کا خرمن، پھر آہوں کا دھواں اُٹھا
ہوا پھر نذرِ صرصر ہر نشیمن کا ہر اک تنکا
ہوئی پھر صبحِ ماتم آنسوؤں سے بھر گئے دریا
چلا پھر سوئے گردوں کاروانِ نالۂ شبہا
ہر اک جانب فضا میں پھر مچا کہرام یاربّا

اُٹھا ئی کہیں سے پھر گھٹا وحشی زمانوں کی
فضا میں بجلیاں لہرائیں پھر سے تازیانوں کی
قلم ہونے لگی گردن قلم کے پاسبانوں کی
کھلا نیلام ذہنوں کا، لگی بولی زبانوں کی
لہو دینے لگا ہر اک دہن میں بخیۂ لبہا
پھر چلا سوئے گردوں کاروانِ نالۂ شبہا

ستم کی آگ کا ایندھن بنے دل پھر سے، دادلہا
یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں خداوندا
بنا پھرتا ہے ہر اک مدعی پیغام بر تیرا
ہر اک بت کو صنم خانے میں دعویٰ ہے خدائی کا
خدا محفوظ رکھے از خداوندانِ مذہب ہا
چلا پھر سوئے گردوں کاروانِ نالۂ شب ہا

بیروت، ۱۹۷۹ء

تارکینِ وطن کے لئے

پیرس

دن ڈھلا، کوچہ و بازار میں صف بستہ ہوئیں
زرد رو روشنیاں
ان میں ہر ایک کے کشکول سے برسیں رم جھم
اس بھرے شہر کی ناآسودگیاں
دور پس منظرِ افلاک میں دھندلانے لگے
عظمتِ رفتہ کے نشاں
پیش منظر میں
کبھی سایۂ دیوار سے لپٹا ہوا سایہ کوئی
دوسرے سائے کی موہوم سی امید لئے
روزمرّہ کی طرح
زیرِ لب
شرحِ بے دردیٔ ایام کی تمہید لئے
اور کوئی اجنبی
ان روشنیوں سایوں سے کتراتا ہوا
اپنے بے خواب شبستاں کی طرف جاتا ہوا

پیرس، اگست ۱۹۷۹ء

"وطنے دیاں ٹھنڈیاں چھائیں او یار
ٹک رہو کتھائیں او یار"
روزی دیوے گا سائیں او یار
ہیر نوں چھڈ ٹُر گیوں رانجھیٹے
کھیڑیاں دے گھر پے گئے ہاسے
کاگ اُڈاون ماواں، بھیناں
ترے پاؤں لکھ ہزاراں
خیر مناون سنگھی ساتھی
چرخے اوہلے روون مٹیاراں
ہاڑاں کردیاں سنجیاں راہیں
او یار
ٹک رہو کتھائیں او یار
وطنے دیاں ٹھنڈیاں چھائیں
چھڈ عنیاں تے محل چو محلے
اپنے دیہڑے دی ریس نہ کائی
اپنی جھوک دیاں تے خنیاں
بیبا تُس نے قدر نہ پائی
موڑ مہاراں
تے آ گھر یاراں
مُڑ آ کے مول نہ جائیں
او یار
ٹک رہو کتھائیں او یار
پنڈ وچ گڈھی لوڑ شریکاں
یاراں دے ڈھے پئے منڈاسے
ویراں دیاں ٹٹ گیاں باہیں
او یار
ٹک رہو کتھائیں او یار
روزی دیوے گا سائیں

تیلی بار کا پرانا گیت
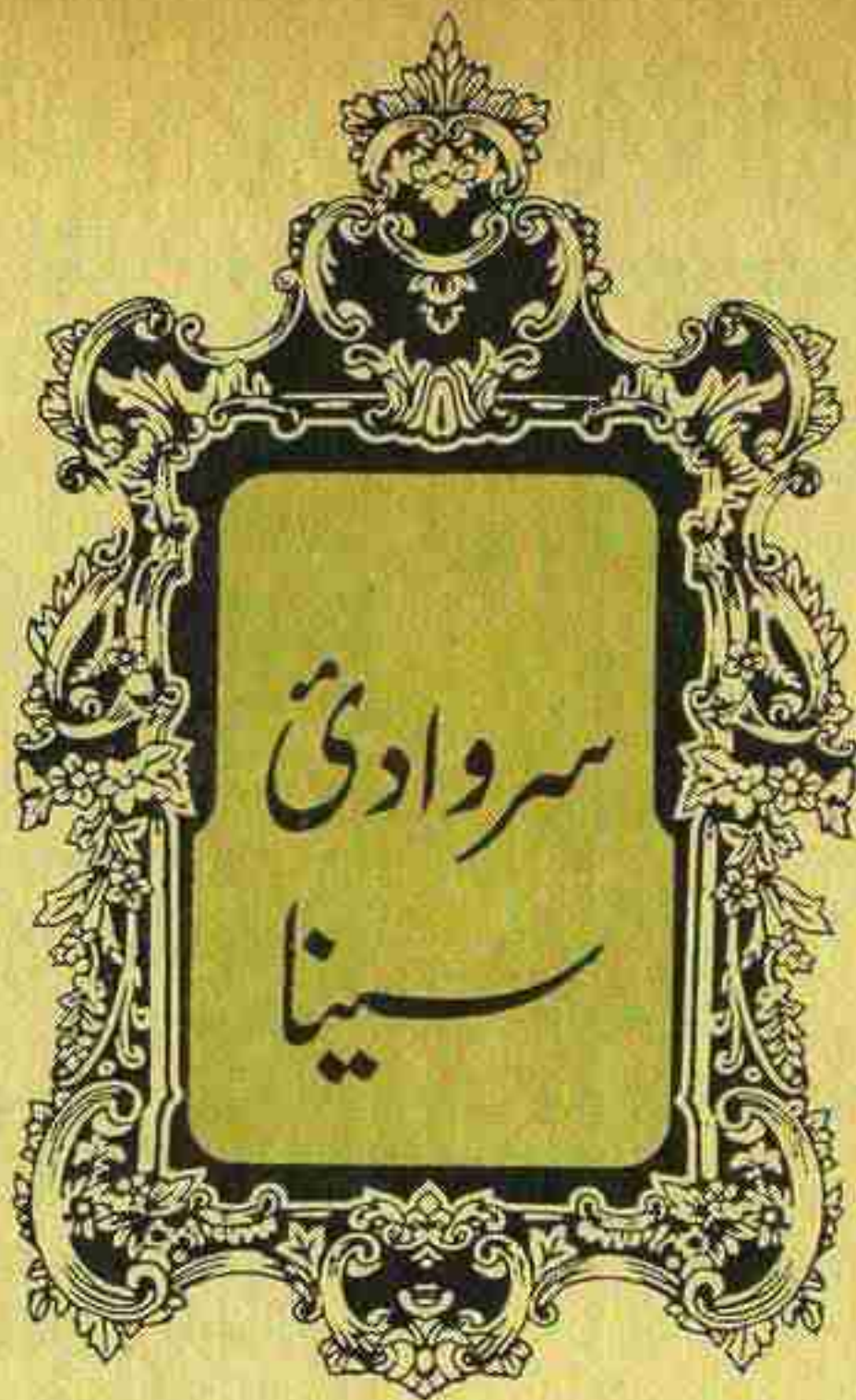
موسم آیا تو نخلِ دار پہ میرؔ
سرِ منصور ہی کا بار آیا

(میرؔ)

دُعا

آئیے ہاتھ اٹھائیں ہم بھی
ہم جنہیں رسمِ دعا یاد نہیں!
ہم جنہیں سوزِ محبت کے سوا
کوئی بُت، کوئی خدا یاد نہیں

آئیے عرض گزاریں کہ نگارِ ہستی
زہرِ امروز میں شیرینیٔ فردا بھر دے
وہ جنہیں تابِ گراں باریٔ ایام نہیں
ان کی پلکوں پہ شب و روز کو ہلکا کر دے

جن کی آنکھوں کو رخِ صبح کا یارا بھی نہیں
اُن کی راتوں میں کوئی شمع منور کر دے
جن کے قدموں کو کسی رہ کا سہارا بھی نہیں
ان کی نظروں پہ کوئی راہ اجاگر کر دے

جن کا دیں پیرویٔ کذب و ریا ہے ان کو
ہمتِ کفر ملے، جراتِ تحقیق ملے!
جن کے سر منتظرِ تیغِ جفا ہیں اُن کو
دستِ قاتل کو جھٹک دینے کی توفیق ملے

عشق کا سرِّ نہاں جانِ تپاں ہے جس سے
آج اقرار کریں اور تپش مٹ جائے
حرفِ حق دل میں کھٹکتا ہے جو کانٹے کی طرح
آج اظہار کریں اور خلش مٹ جائے

یومِ آزادی - ۱۴ اگست ۱۹۶۷ء

غبارِ خاطرِ محفل ٹھہر جائے

کہیں تو کاروانِ درد کی منزل ٹھہر جائے
کنارے آ لگے عمرِ رواں یا دل ٹھہر جائے

اماں کیسی کہ موجِ خوں ابھی سر سے نہیں گزری
گزر جائے تو شاید بازوئے قاتل ٹھہر جائے

کوئی دم بادبانِ کشتیٔ صہبا کو تہہ رکھو
ذرا ٹھہرو، غبارِ خاطرِ محفل ٹھہر جائے

خُمِ ساقی میں جز زہرِ ہلاہل کچھ نہیں باقی
جو ہو محفل میں اس اکرام کے قابل ٹھہر جائے

ہماری خامشی بس دل سے لب تک ایک وقفہ ہے
یہ طوفاں ہے جو پل بھر بر لبِ ساحل ٹھہر جائے

نگاہِ منتظر کب تک کرے گی آئینہ بندی
کہیں تو دشتِ غم میں یار کا محمل ٹھہر جائے

نسخۂ اُلفت میرا

گر کسی طور ہر اک اُلفتِ جاناں کا خیال
شعر میں ڈھل کے ثنائے رخِ جانانہ بنے
پھر تو یوں ہو کہ مرے شعر و سخن کا دفتر
طول میں طولِ شبِ ہجراں کا افسانہ بنے
ہے بہت تشنہ مگر نسخۂ اُلفت میرا
اِس سبب سے کہ ہر اک لمحۂ فرصت میرا
دل یہ کہتا ہے کہ ہو قربتِ جاناں میں بسر

سوچنے دو

(آندرے وزنیسنسکی کے نام)

اِک ذرا سوچنے دو
اس خیاباں میں
جو اس لحظہ بیاباں بھی نہیں
کونسی شاخ میں پھول آئے تھے سب سے پہلے
کون بے رنگ ہوئی رنج و تعب سے پہلے
اور اب سے پہلے
کس گھڑی کون سے موسم میں یہاں
خون کا قحط پڑا
گُل کی شہ رگ پہ کڑا
وقت پڑا
سوچنے دو
اِک ذرا سوچنے دو
یہ بھرا شہر جو اب وادیٔ ویراں بھی نہیں
اس میں کس وقت کہاں
آگ لگی تھی پہلے
اس کے صف بستہ دریچوں میں سے کس میں اوّل
زہ ہوئی سُرخ شعاعوں کی کماں
کس جگہ جوت جگی تھی پہلے
سوچنے دو
ہم سے اس دیس کا تم نام و نشاں پوچھتے ہو
جس کی تاریخ نہ جغرافیہ اب یاد آئے
اور یاد آئے تو محبوبِ گزشتہ کی طرح
روبرو آنے سے جی گھبرائے
ہاں مگر جیسے کوئی
ایسے محبوب یا محبوبہ کا دل رکھنے کو
آنکلتا ہے کبھی رات بتانے کے لئے
ہم اَب اُس عمر کو آپہنچے ہیں جب ہم بھی یونہی
دِل سے مِل آتے ہیں بس رسم نبھانے کے لئے
دِل کی کیا پوچھتے ہو
سوچنے دو

ماسکو- مارچ ۱۹۶۷ء

★

ضبط کا عہد بھی ہے شوق کا پیماں بھی ہے
عہد و پیماں سے گزر جانے کو جی چاہتا ہے
درد اتنا ہے کہ ہر رگ میں ہے محشر برپا
اور سکوں ایسا کہ مرجانے کو جی چاہتا ہے

اگست ۱۹۶۸ء

ایک چٹان کیلئے کتبہ

جواں مردی اسی رفعت پہ پہنچی
جہاں سے بزدلی نے جست کی تھی

سرِ وادیٔ سینا

(عرب اسرائیل جنگ کے بعد)

پھر برق فروزاں ہے سرِ وادیٔ سینا
پھر رنگ پہ ہے شعلۂ رخسارِ حقیقت
پیغامِ اجل دعوتِ دیدارِ حقیقت
اے دیدۂ بینا
اب وقت ہے دیدار کا دم ہے کہ نہیں ہے
اے قاتلِ جاں چارہ گرِ کلفتِ غم ہے
گلزارِ ارم پرتوِ صحرائے عدم ہے
پندارِ جنوں
حوصلۂ راہِ عدم ہے کہ نہیں ہے
پھر برق فروزاں ہے سرِ وادیٔ سینا
اے دیدۂ بینا
پھر دل کو مصفّا کرو، اس لوح پہ شاید

مابینِ من و تو نیا پیماں کوئی اُترے
اب رسمِ ستم حکمتِ خاصانِ زمیں ہے
تائیدِ ستم مصلحتِ مفتیٔ دیں ہے
اب صدیوں کے اقرارِ اطاعت کو بدلنے
لازم ہے انکار کا فرماں کوئی اُترے

۲

سنو کہ شاید یہ نورِ صیقل
ہے اُس صحیفے کا حرفِ اوّل
جو ہر کس و ناکسِ زمیں پر
دلِ گدایانِ اجمعیں پر
اتر رہا ہے فلک سے اب کے

سنو کہ اس حرفِ لم یزل کے
ہمیں تمہیں بندگانِ بے بس
علیم بھی ہیں، خبیر بھی ہیں
سنو کہ ہم بے زبان و بے کس
بشیر بھی ہیں، نذیر بھی ہیں

ہر اک اولی الامر کو صدا دو
کہ اپنی فردِ عمل سنبھالے

اٹھے گا جب جمِّ سرفروشاں
پڑیں گے دار و رسن کے لالے
کوئی نہ ہوگا کہ جو بچا لے

جزا سزا سب یہیں پہ ہوگی
یہیں عذاب و ثواب ہوگا

یہیں سے اُٹھے گا شورِ محشر
یہیں پہ روزِ حساب ہوگا

۱۹۶۷ء

سال گرہ

شاعر کا جشنِ سال گرہ ہے شراب لا
منصب، خطاب، رُتبہ انہیں کیا نہیں ملا
بس نقص ہے تو اتنا کہ ممدوح نے کوئی
مصرع کسی کتاب کے شایاں نہیں لکھا

۱؎ ۲؎ ۳؎ یہ الفاظ لغوی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔

دلدار دیکھنا

طوفاں بہ دل ہے ہر کوئی دلدار دیکھنا
گُل ہو نہ جائے مشعلِ رخسار دیکھنا

آتش بہ جاں ہے ہر کوئی سرکار دیکھنا
لَو دے اُٹھے نہ طرّۂ طرّار دیکھنا

جذبِ مسافرانِ رہِ یار دیکھنا
سر دیکھنا، نہ سنگ، نہ دیوار دیکھنا

کوئے جفا میں قحطِ خریدار دیکھنا
ہم آ گئے تو گرمیٔ بازار دیکھنا

اُس دل نوازِ شہر کے اطوار دیکھنا
بے التفات بولنا، بیزار دیکھنا

خالی ہیں گرچہ مسند و منبر نگوں ہے خلق
رُعبِ قبا و ہیبتِ دستار دیکھنا

جب تک نصیب تھا ترا دیدار دیکھنا
جس سمت دیکھنا، گُل و گلزار دیکھنا

پھر ہم تمیزِ روز و مہ و سال کر سکیں
اے یادِ یار پھر اِدھر اک بار دیکھنا

سنہ ۱۹۶۷ء

فرشِ نومیدئ دیدار

دیکھنے کی تو کسے تاب ہے، لیکن اب تک
جب بھی اس راہ سے گزرو تو کسی دُکھ کی کسک
ٹوکتی ہے کہ وہ دروازہ کھلا ہے اب بھی
اور اس صحن میں ہر سو یونہی پہلے کی طرح
فرشِ نومیدئ دیدار بچھا ہے اب بھی
اور کہیں یاد کسی دل زدہ بچے کی طرح
ہاتھ پھیلائے ہوئے بیٹھی ہے فریاد کناں

دل یہ کہتا ہے کہیں اور چلے جائیں جہاں
کوئی دروازہ عبث وا ہو، نہ بے کار کوئی
یاد فریاد کا کشکول لیے بیٹھی ہو
محرمِ حسرتِ دیدار ہو دیوار کوئی
نہ کوئی سایۂ گل، ہجرتِ گل سے ویراں
یہ بھی کر دیکھا ہے سو بار کہ جب راہوں میں
دیس پردیس کی بے مہر گزرگاہوں میں
قافلے قامت و رخسار و لب و گیسو کے
پردۂ چشم پہ یوں اُترے ہیں بے صورت و رنگ
جس طرح بند دریچوں پہ گرے بارشِ سنگ

اور دل کہتا ہے ہر بار چلو لَوٹ چلو
اس سے پہلے کہ وہاں جائیں تو یہ دُکھ بھی نہ ہو
یہ نشانی کہ وہ دروازہ کھلا ہے اب بھی
اور اس صحن میں ہر سُو یونہی پہلے کی طرح
فرشِ نومیدئ دیدار بچھا ہے اب بھی

اگست ۱۹۷۰ء

لہو کا سُراغ

کہیں نہیں ہے کہیں بھی نہیں لہو کا سُراغ
نہ دست و ناخنِ قاتل نہ آستیں پہ نشاں
نہ سُرخیِ لبِ خنجر نہ رنگِ نوکِ سناں
نہ خاک پر کوئی دھبا نہ بام پر کوئی داغ
کہیں نہیں ہے کہیں بھی نہیں لہو کا سُراغ
نہ صرفِ خدمتِ شاہاں کہ خوں بہا دیتے
نہ دیں کی نذر کہ بیعانۂ جزا دیتے
نہ رزم گاہ میں برسا کہ معتبر ہوتا
کسی علم پہ رقم ہو کے مشتہر ہوتا
پکارتا رہا، بے آسرا یتیم لہو
کسی کو بہرِ سماعت نہ وقت تھا نہ دماغ
نہ مدعی، نہ شہادت، حساب پاک ہوا
یہ خونِ پاک نشیناں تھا، رزقِ خاک ہوا

کراچی — جنوری ۱۹۶۵ء

دیدۂ تر پہ وہاں کون نظر کرتا ہے
کاسۂ چشم میں خوں ناب جگر لے کے چلو

اب اگر جاؤ پئے عرض و طلب ان کے حضور
دست و کشکول نہیں کاسۂ سر لے کے چلو

کراچی۔ جنوری ۱۹۶۵ء

★

یوں سجا چاند کہ جھلکا ترے انداز کا رنگ
یوں فضا مہکی کہ بدلا مرے ہمراز کا رنگ

سایۂ چشم میں حیراں رُخِ روشن کا جمال
سُرخیِ لب میں پریشاں تری آواز کا رنگ

بے پیے ہوں کہ اگر لطف کرو آخرِ شب
شیشۂ مے میں ڈھلے صبح کے آغاز کا رنگ

چنگ و نے رنگ پہ تھے اپنے لہو کے دم سے
دل نے لے بدلی تو مدھم ہوا ہر ساز کا رنگ

اک سخن اور کہ پھر رنگِ تکلم تیرا
حرفِ سادہ کو عنایت کرے اعجاز کا رنگ

اپریل ۱۹۶۵ء

غم نہ کر، غم نہ کر

درد تھم جائے گا غم نہ کر، غم نہ کر
یار لوٹ آئیں گے، دِل ٹھہر جائے گا غم نہ کر، غم نہ کر
زخم بھر جائے گا
غم نہ کر، غم نہ کر
دِن نکل آئے گا
غم نہ کر، غم نہ کر
ابر کھل جائے گا، رات ڈھل جائے گی
غم نہ کر، غم نہ کر
رُت بدل جائے گی
غم نہ کر، غم نہ کر

جون ۱۹۶۵ء

سپاہی کا مرثیہ

اٹھو اب ماٹی سے اٹھو،
جاگو میرے لال
اب جاگو میرے لال
تمہری سیج سجاون کارن
دیکھو آئی رین اندھیارن
نیلے شال دوشالے لے کر
جن میں ان دکھین اکھین نے
ڈھیر کیے ہیں اتنے موتی
اتنے موتی جن کی جیوتی
دان سے تمہرا
جگ جگ لاگا
نام چمکنے
اٹھو اب ماٹی سے اٹھو -
جاگو میرے لال
گھر گھر بکھرا بھور کا کندن
گھور اندھیرا اپنا آنگن
جانے کب سے راہ تکے ہیں
بالی دلہنیا، بانکے ویرن
سونا تمہرا راج پڑا ہے
دیکھو کتنا کاج پڑا ہے
بیری براجے راج سنگھاسن
تم ماٹی میں لال
اٹھو اب، ماٹی سے اٹھو، جاگو میرے لال
ہٹ نہ کرو ماٹی سے اٹھو، جاگو میرے لال
اب جاگو میرے لال

اکتوبر ۱۹۶۵ء

★

کیے آرزو سے پیماں جو مآل تک نہ پہنچے
شب و روزِ آشنائی مہ و سال تک نہ پہنچے

وہ نظر بہم نہ پہنچی کہ محیطِ حسن کرتے
تری دید کے وسیلے خد و خال تک نہ پہنچے

وہی چشمۂ بقا تھا جسے سب سراب سمجھے
وہی خواب معتبر تھے جو خیال تک نہ پہنچے

ترا لطف وجہِ تسکیں، نہ قرار شرحِ غم سے
کہ ہیں دل میں وہ گلے بھی جو ملال تک نہ پہنچے

کوئی یار جاں سے گزرا، کوئی ہوش سے نہ گزرا
یہ ندیم یک دو ساغر مرے حال تک نہ پہنچے

چلو فیضؔ دل جلائیں کریں پھر سے عرضِ جاناں
وہ سخن جو لب تک آئے پہ سوال تک نہ پہنچے

۱۹۶۶ء

خورشیدِ محشر کی لَو

آج کے دن نہ پوچھو، مرے دوستو
دُور کتنے ہیں خوشیاں منانے کے دن
کھُل کے ہنسنے کے دن گیت گانے کے دن
پیار کرنے کے دن، دِل لگانے کے دن
آج کے دن نہ پوچھو، مرے دوستو!
زخم کتنے ابھی بختِ بسمل میں ہیں
دشت کتنے ابھی راہِ منزل میں ہیں
تیر کتنے ابھی دستِ قاتل میں ہیں
آج کا دن زبوں ہے، مرے دوستو
آج کے دن تو یوں ہے، مرے دوستو
جیسے درد و اَلم کے پُرانے نشاں
سب چلے سوئے دِل کارواں کارواں
ہاتھ سینے پہ رکھو تو ہر استخواں
سے اُٹھے نالۂ الاماں، الاماں
آج کے دن نہ پوچھو، مرے دوستو
کب تمہارے لہو کے دریدہ علَم
فرقِ خورشیدِ محشر پہ ہوں گے رقم
از کراں تا کراں کب تمہارے قدم
لے کے اُٹھے گا وہ بحرِ خوں یم بہ یم
جس میں دُھل جائے گا آج کے دِن کا غم
سارے درد و اَلم سارے جور و سِتم
دُور کتنی ہے خورشیدِ محشر کی لَو
آج کے دِن نہ پوچھو، مرے دوستو!
مارچ۔اپریل ۱۹۶۹ء

★

یار اغیار ہو گئے ہیں
اور اغیار مُصر ہیں کہ وہ سب
یارِ غار ہو گئے ہیں
اب کوئی ندیم باصفا نہیں ہے
سب رند شراب خوار ہو گئے ہیں

۱۹۷۱ء

داغستانی خاتون اور شاعِر بیٹا

اس نے جب بولنا نہ سیکھا تھا
اس کی ہر بات میں سمجھتی تھی
اب وہ شاعر بنا ہے نام خُدا
لیکن افسوس کوئی بات اس کی
میرے پلّے ذرا نہیں پڑتی

بہ نوکِ شمشیر

میرے آباء کہ تھے نامحرم طوق و زنجیر
وہ مضامیں جو ادا کرتا ہے اب میرا قلم
نوکِ شمشیر پہ لکھتے تھے بہ نوکِ شمشیر
روشنائی سے جو میں کرتا ہوں کاغذ پہ رقم
سنگ و صحرا پہ وہ کرتے تھے لہو سے تحریر

مرثیے

دور جا کر قریب ہو جتنے
ہم سے کب تم قریب تھے اتنے

اب نہ آؤ گے تم نہ جاؤ گے
وصل و ہجراں بہم ہوئے کتنے

چاند نکلے کسی جانب تری زیبائی کا
رنگ بدلے کسی صورت شبِ تنہائی کا

دولتِ لب سے پھر اے خسروِ شیریں دہناں
آج ارزاں ہو کوئی حرف شناسائی کا

گرمیٔ رشک سے ہر انجمنِ گل بدناں
تذکرہ چھیڑے تری پیرہن آرائی کا

صحنِ گلشن میں کبھی اے شہِ شمشاد قداں
پھر نظر آئے سلیقہ تری رعنائی کا

ایک بار اور مسیحائے دلِ دل زدگاں
کوئی وعدہ، کوئی اقرار مسیحائی کا

دیدہ و دل کو سنبھالو کہ سرِ شامِ فراق
ساز و سامان بہم پہنچا ہے رسوائی کا

اگست ۱۹۶۸ء

کب تک دل کی خیر منائیں، کب تک راہ دکھلاؤ گے
کب تک چین کی مہلت دو گے کب تک یاد نہ آؤ گے

بیتا دید امید کا موسم، خاک اڑتی ہے آنکھوں میں
کب بھیجو گے درد کا بادل، کب برکھا برساؤ گے

عہدِ وفا یا ترکِ محبت، جو چاہو سو آپ کرو
اپنے بس کی بات ہی کیا ہے، ہم سے کیا منواؤ گے

کس نے وصل کا سورج دیکھا، کس پر ہجر کی رات ڈھلی
گیسوؤں والے کون تھے کیا تھے، ان کو کیا جتلاؤ گے

فیض دلوں کے بھاگ میں ہے گھر بسنا بھی، لٹ جانا بھی
تم اس حسن کے لطف و کرم پر کتنے دن اتراؤ گے

اکتوبر ۱۹۶۸ء

ایک شہر آشوب کا آغاز

اب بزمِ سخن صحبتِ لب سوختگاں ہے
اب حلقۂ مے طائفۂ بے طلباں ہے
گھر رہیے تو ویرانیِ دل کھانے کو آوے
رہ چلیے تو ہر گام پہ غوغائے سگاں ہے
پیوندِ رہِ کوچۂ زر چشمِ غزالاں
پابوسِ ہوس افسرِ شمشاد قداں ہے
یاں اہلِ جنوں یک بہ دگر دست و گریباں
واں جیشِ ہوس تیغ بکف درپئے جاں ہے
اب صاحبِ انصاف ہے خود طالبِ انصاف
مہر اس کی ہے میزان بہ دستِ دگراں ہے
ہم سہلِ طلب کون سے فرہاد تھے لیکن!
اب شہر میں تیرے کوئی ہم سا بھی کہاں ہے

فروری ۱۹۶۶ء

★

زنداں زنداں شورِ اناالحق، محفل محفل قلقلِ مے
خونِ تمنا دریا دریا، دریا دریا عیش کی لہر

دامن دامن رُت پھولوں کی، آنچل آنچل اشکوں کی
قریہ قریہ جشن بپا ہے، ماتم شہر بہ شہر

کراچی۔ جنوری ۱۹۶۵ء

(گلاب کا پھول سابق صدر محمد ایوب خاں کا انتخابی نشان تھا)

یہاں سے شہر کو دیکھو

یہاں سے شہر کو دیکھو تو حلقہ در حلقہ
کھنچی ہے جیل کی صورت ہر ایک سمت فصیل

ہر ایک راہ گزر گردشِ اسیراں ہے
نہ سنگِ میل، نہ منزل، نہ مخلصی کی سبیل

جو کوئی تیز چلے رہ تو پوچھتا ہے خیال
کہ ٹوکنے کوئی للکار کیوں نہیں آئی؟

جو کوئی ہاتھ ہلائے تو وہم کو ہے سوال
کوئی چھنک، کوئی جھنکار کیوں نہیں آئی؟

یہاں سے شہر کو دیکھو تو ساری خلقت میں
نہ کوئی صاحبِ تمکیں، نہ کوئی والیِ ہوش

ہر ایک مردِ جواں مجرمِ رسن بہ گلو
ہر اک حسینۂ رعنا، کنیزِ حلقہ بگوش

جو سائے دور چراغوں کے گرد لرزاں ہیں
نہ جانے محفلِ غم ہے کہ بزمِ جام و سبو
جو رنگ ہر در و دیوار پر پریشاں ہیں
یہاں سے کچھ نہیں کھلتا یہ پھول ہیں کہ لہو

کراچی۔ مارچ ۱۹۶۵ء

ہر کجا رفتم غبارِ زندگی در پیش بود
یارب ایں خاکِ پریشاں از کجا رفتم

(بیدل)

تم ہی کہو کیا کرنا ہے

جب دُکھ کی ندیا میں ہم نے
جیون کی ناؤ ڈالی ہے
تھا کتنا کس بل بانہوں میں
لوہو میں کتنی لالی تھی
یوں لگتا تھا دو ہاتھ لگے
اور ناؤ پورم پار لگی
ایسا نہ ہوا، ہر دھارے میں
کچھ ان دیکھی منجدھاریں تھیں
کچھ مانجھی تھے انجان بہت
کچھ بے پرکھی پتواریں تھیں
اب جو بھی چاہو چھان کرو
اب جتنے چاہو دوش دھرو
ندیا تو وہی ہے ناؤ وہی
اب تم ہی کہو کیا کرنا ہے
اب کیسے پار اُترنا ہے

جب اپنی چھاتی میں ہم نے
اس دیس کے گھاؤ دیکھے تھے
تھا ویدوں پر وشواش بہت
اور یاد بہت سے نسخے تھے
یوں لگتا تھا بس کچھ دن میں
ساری بپتا کٹ جائے گی
اور سب گھاؤ بھر جائیں گے
ایسا نہ ہوا کہ روگ اپنے
کچھ اتنے ڈھیر پرانے تھے
وید ان کی ٹوہ کو پا نہ سکے
اور ٹوٹکے سب بیکار گئے
اب جو بھی چاہو چھان کرو
اب جتنے چاہو دوش دھرو
چھاتی تو وہی ہے گھاؤ وہی
اب تم ہی کہو کیا کرنا ہے
یہ گھاؤ کیسے بھرنا ہے

لندن، ۱۹۸۱ء

ہجر کی راکھ اور وصال کے پھول

آج پھر درد و غم کے دھاگے ہیں
ہم پرو کر ترے خیال کے پھول

ترکِ اُلفت کے دشت سے چُن کر
آشنائی کے ماہ و سال کے پھول

تیری دہلیز پر سجا آئے
پھر تری یاد پر چڑھا آئے

باندھ کر آرزو کے پلے میں
ہجر کی راکھ اور وصال کے پھول

میجر اسحاق کی یاد میں

لو تم بھی گئے ہم نے تو سمجھا تھا کہ تم نے
باندھا تھا کوئی یاروں سے پیمانِ وفا اور
یہ عہد کہ تا عمرِ رواں ساتھ رہو گے
رستے میں بچھڑ جائیں گے جب اہلِ صفا اور
ہم سمجھے تھے صیّاد کا ترکش ہوا خالی
باقی تھا مگر اس میں ابھی تیرِ قضا اور
ہر خارِ رہِ دشتِ وطن کا ہے سوالی
کب دیکھیے آتا ہے کوئی آبلہ پا اور
آنے میں تامل تھا اگر روزِ جزا کو
اچھا تھا ٹھہر جاتے اگر تم بھی ذرا اور

بیروت ۳۰ جون ۱۹۸۲ء

جو میرا تمہارا رشتہ ہے

میں کیا لکھوں کہ جو میرا تمہارا رشتہ ہے
وہ عاشقی کی زباں میں کہیں بھی درج نہیں
لکھا گیا ہے بہت لطفِ وصل و دردِ فراق
مگر یہ کیفیت اپنی رقم نہیں ہے کہیں
یہ اپنا عشق ہم آغوش جس میں ہجر و وصال
یہ اپنا درد کہ ہے کب سے ہمدمِ مہ و سال
اس عشقِ خاص کو ہر ایک سے چھپائے ہوئے
"گزر گیا ہے زمانہ گلے لگائے ہوئے"

نثار میں تری گلیوں کے اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے
جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
نظر چرا کے چلے جسم و جاں بچا کے چلے

ہے اہلِ دل کے لیے اب یہ نظمِ بست و کشاد
کہ سنگ و خشت مقید ہیں اور سگ آزاد

ایک نغمہ کربلائے بیروت کیلئے

بیروت نگارِ بزمِ جہاں
بیروت بدیلِ باغِ جناں
بچوں کی ہنستی آنکھوں کے
جو آئینے چکنا چور ہوئے
اب ان کے ستاروں کی لَو سے
اس شہر کی راتیں روشن ہیں
اور رخشاں ہے ارضِ لبناں
بیروت نگارِ بزمِ جہاں
جو چہرے لہو کے غازے کی
زینت سے سوا پُرنور ہوئے
اب ان کے رنگیں پرتو سے
اس شہر کی گلیاں روشن ہیں
اور تاباں ہے ارضِ لبناں
بیروت نگارِ بزمِ جہاں
ہر ویراں گھر، ہر ایک کھنڈر
ہم پایۂ قصرِ دارا ہے
ہر غازی رشکِ اسکندر
ہر دختر ہمسرِ لیلیٰ ہے
یہ شہر ازل سے قائم ہے
یہ شہر ابد تک دائم ہے
بیروت نگارِ بزمِ جہاں
بیروت بدیلِ باغِ جناں

بیروت، جون ۱۹۸۲ء

ایک ترانہ
مجاہدینِ فلسطین کیلئے

ہم جیتیں گے
حقا ہم ایک دن جیتیں گے
بالآخر اک دن جیتیں گے
کیا خوف ز یلغارِ اعداء
ہے سینہ سپر ہر غازی کا
کیا خوف ز یورشِ جیشِ قضا
صف بستہ ہیں ارواح الشہداء
ڈر کا ہے کا

ہم جیتیں گے
حقا ہم جیتیں گے
قد جاء الحق و زہق الباطل
فرمودۂ ربِ اکبر
ہے جنت اپنے پاؤں تلے
اور سایۂ رحمت سر پہ ہے
پھر کیا ڈر ہے

ہم جیتیں گے
حقا ہم اک دن جیتیں گے
بالآخر اک دن جیتیں گے

بیروت، ۱۵ جون ۸۲ء

آج شب کوئی نہیں ہے

آج شب دل کے قریں کوئی نہیں ہے
آنکھ سے دور طلسمات کے در وا ہیں کئی
خواب در خواب محلات کے در وا ہیں کئی
اور مکیں کوئی نہیں ہے
آج شب دل کے قریں کوئی نہیں ہے
"کوئی نغمہ، کوئی خوشبو، کوئی کافر صورت"
کوئی امید، کوئی آس مسافر صورت
کوئی غم، کوئی کسک، کوئی شک، کوئی یقیں
کوئی نہیں ہے
آج شب دل کے قریں کوئی نہیں ہے
تم اگر ہو، تو مرے پاس ہو یا دور ہو تم
ہر گھڑی سایہ گر خاطر رنجور ہو تم
اور نہیں ہو تو نہیں... کوئی نہیں، کوئی نہیں ہے
آج شب دل کے قریں کوئی نہیں ہے

میرے قاتل میرے دلدار میرے پاس رہو
جس گھڑی رات چلے
آسمانوں کا لہو پی کے سیاہ رات چلے
مرہم خشک لیے نشتر الماس لیے
بین کرتی ہوئی، ہنستی ہوئی گاتی نکلے
درد کے کاسنی پازیب بجاتی نکلے

★

رفیق راہ تھی منزل ہر اک تلاش کے بعد
چھٹا یہ ساتھ تو رہ کی تلاش بھی نہ رہی

ملول تھا دل آئینہ ہر خراش کے بعد
جو پاش پاش ہوا اک خراش بھی نہ رہی

عشق اپنے مجرموں کو پابجولاں لے چلا

دار کی رسیوں کے گلوبند گردن میں پہنے ہوئے
گانے والے ہر اک روز گاتے رہے
پایلیں بیڑیوں کی بجاتے ہوئے
ناچنے والے دھومیں مچاتے رہے
ہم نہ اس صف میں تھے اور نہ اُس صف میں تھے
راستے میں کھڑے ان کو تکتے رہے
رشک کرتے رہے
اور چُپ چاپ آنسو بہاتے رہے

لوٹ کر آ کے دیکھا تو پھولوں کا رنگ
جو کبھی سُرخ تھا زرد ہی زرد ہے
اپنا پہلو ٹٹولا تو ایسا لگا
دل جہاں تھا وہاں درد ہی درد ہے
گلو میں کبھی طوق کا واہمہ
کبھی پاؤں میں رقصِ زنجیر
اور پھر ایک دن عشق انہیں کی طرح
رسن در گلو، پابجولاں ہمیں
اسی قافلے میں کشاں لے چلا

بیروت، جولائی سنہ ۱۹۸۱ء

★

دربار میں اب سطوتِ شاہی کی علامت
درباں کا عصا ہے نہ مصنّف کا قلم ہے

ہے پھر کوہِ ندا پر جو بشارت
تمہیدِ مسرّت ہے کہ طولِ شبِ غم ہے

جس دھجی کو گلیوں میں لیے پھرتے ہیں طفلاں
یہ میرا گریباں ہے کہ لشکر کا علَم ہے

جس نور سے ہے شہر کی دیوار درخشاں
یہ خونِ شہیداں ہے کہ زرخانۂ جم ہے

حلقہ کیے بیٹھے رہو اک شمع کو یارو
کچھ روشنی باقی تو ہے ہر چند کہ کم ہے

●

نہیں نگاہ میں منزل تو جستجو ہی سہی
نہیں وصال میسر تو آرزو ہی سہی

نہ تن میں خون فراہم نہ اشک آنکھوں میں
نمازِ شوق تو واجب ہے بے وضو ہی سہی

کسی طرح تو جمے بزم میکدے والو
نہیں جو بادہ و ساغر تو ہاؤ ہو ہی سہی

گر انتظار کٹھن ہے تو جب تلک اے دل
کسی کے وعدۂ فردا کی گفتگو ہی سہی

دیارِ غیر میں محرم اگر نہیں کوئی
تو فیضؔ ذکرِ وطن اپنے روبرو ہی سہی

لاہور، فروری ۱۹۸۲ء

اِس وقت تو یُوں لگتا ہے

اس وقت تو یُوں لگتا ہے اب کچھ بھی نہیں ہے
مہتاب ، نہ سُورج ، نہ اندھیرا نہ سویرا

آنکھوں کے دریچوں پہ کسی حسُن کی چِلمن
اور دِل کی پناہوں میں کسی درد کا ڈیرا

ممکن ہے کوئی وہم تھا، ممکن ہے سُنا ہو
گلیوں میں کسی چاپ کا اِک آخری پھیرا

شاخوں میں خیالوں کے گھنے پیڑ کی شاید
اب آکے کرے گا نہ کوئی خواب بسیرا

اِک بَیر، نہ اِک مہر نہ اِک ربط نہ رشتہ
تیرا کوئی اپنا، نہ پرایا کوئی میرا

مانا کہ یہ سُنسان گھڑی سخت کڑی ہے
لیکن مرے دِل یہ تو فقط اِک ہی گھڑی ہے
ہمت کرو، جینے کو تو اِک عُمر پڑی ہے

میو ہسپتال، لاہور
۴ مارچ ۱۹۸۲ء

زباں پہ مُہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

نذرِ مولینا حسرت موہانی

مر جائیں گے ظالم کی حمایت نہ کریں گے
احرار کبھی ترکِ روایت نہ کریں گے

کیا کچھ نہ ملا ہے جو کبھی تجھ سے ملے تھے
اب تیرے نہ ملنے کی شکایت نہ کریں گے

شب بیت گئی ہے تو گزر جائے گا دن بھی
ہر لحظہ جو گزری وہ حکایت نہ کریں گے

یہ فقر دلِ زار کا عوضانہ بہت ہے
شاہی نہیں مانگیں گے ولایت نہ کریں گے

ہم شیخ نہ لیڈر نہ مصاحب نہ صحافی
جو خود نہیں کرتے وہ ہدایت نہ کریں گے

ترک شاعر ناظم حکمت کے افکار

جینے کے لئے مرنا
یہ کیسی سعادت ہے
مرنے کے لئے جینا
یہ کیسی حماقت ہے

اکیلے جیو
ایک شمشاد تن کی طرح
اور مل کر جیو
ایک بن کی طرح

ہم نے اُمید کے سہارے
ٹوٹ کر یوں ہی زندگی کی ہے
جس طرح تم سے عاشقی کی ہے

جیسے ہم بزم ہیں پھر یارِ طرحدار سے ہم
رات ملتے رہے اپنے در و دیوار سے ہم

سرخوشی میں یونہی دل شاد و غزل خواں گزرے
کوئے قاتل سے کبھی کوچۂ دلدار سے ہم

کبھی منزل، کبھی رستے نے ہمیں ساتھ دیا
ہر قدم اُلجھے رہے قافلہ سالار سے ہم

ہم سے بے بہرہ ہوئی اب جرسِ گُل کی صدا
ورنہ واقف تھے ہر اک رنگ کی جھنکار سے ہم

فیض جب چاہا جو کچھ چاہا سدا مانگ لیا
ہاتھ پھیلا کے دلِ بے زر و دینار سے ہم

یہ کس دیارِ عدم میں . . .

نہیں ہے یُوں تو نہیں ہے کہ اب نہیں پیدا
کسی کے حُسن میں شمشیرِ آفتاب کا حُسن
نگاہ جس سے ملاؤ تو آنکھ دُکھنے لگے
کسی ادا میں ادائے خرامِ بادِ صبا
جسے خیال میں لاؤ تو دل سُلگنے لگے
نہیں ہے یوں تو نہیں ہے کہ اب نہیں باقی
جہاں میں بزمِ گہِ حسن و عشق کا میلا
بنائے لطف و محبت، رواجِ مہر و وفا

یہ کس دیارِ عدم میں مقیم ہیں ہم تم
جہاں پہ مژدۂ دیدارِ حسنِ یار تو کیا
نویدِ آمدِ روزِ جزا نہیں آتی
یہ کس خمار کدے میں ندیم ہیں ہم تم
جہاں پہ شورشِ رندانِ میگسار تو کیا
شکستِ شیشۂ دل کی صدا نہیں آتی

پھر آئینۂ عالم شاید کہ نکھر جائے
پھر اپنی نظر شاید تا حدِ نظر جائے

صحرا پہ لگے پہرے اور قفل پڑے بن کر
اب شہر بدر ہو کر دیوانہ کدھر جائے

خاکِ رہِ جاناں پر کچھ خوں تھا گرو اپنا
اس فصل میں ممکن ہے یہ قرض اُتر جائے

دیکھا ہیں چلو ہم بھی جس بزم میں سُنتے ہیں
جو خندہ بلب آئے وہ خاک بسر جائے

یا خوف سے در گزریں یا جاں سے گزر جائیں
مرنا ہے کہ جینا ہے اک بات ٹھہر جائے

۲۱، نومبر ۱۹۸۳ء

گو سب کو بہم ساغر و بادہ تو نہیں تھا
یہ شہر اُداس اتنا زیادہ تو نہیں تھا

گلیوں میں پھرا کرتے تھے دو چار دِوانے
ہر شخص کا صد چاک لبادہ تو نہیں تھا

منزل کو نہ پہچانے رہِ عشق کا راہی
ناداں ہی سہی ایسا بھی سادہ تو نہیں تھا

تھک کر یونہی پل بھر کے لئے آنکھ لگی تھی
سو کر ہی نہ اُٹھیں یہ ارادہ تو نہیں تھا

واعظ سے رہ و رسم رہی رند سے صحبت
فرق ان میں کوئی اتنا زیادہ تو نہیں تھا

لاہور، فروری ۶۸۳

○

شام دُھندلانے لگی اور مری تنہائی
دِل میں پتھر کی طرح بیٹھ گئی

چاند اُبھرنے لگا یکبار تری یاد کے ساتھ
زندگی مونس و غمخوار نظر آنے لگی

○

باقی ہے کوئی ساتھ تو بس ایک اسی کا
پہلو میں لئے پھرتے ہیں جو درد کسی کا

اک عمر سے اس دُھن میں کہ اُبھرے کوئی خورشید
بیٹھے ہیں سہارا لئے شمعِ سحری کا

ادھر نہ دیکھو

اُدھر نہ دیکھو کہ جو بہادر
قلم کے یا تیغ کے دھنی تھے
جو عزم و ہمّت کے مدّعی تھے
اب ان کے ہاتھوں میں صدقِ ایماں کی
آزمودہ پُرانی تلوار مُڑ گئی ہے۔
جو کج کلہ صاحبِ حشم تھے
جو اہلِ دستار محترم تھے
ہوس کے پرپیچ راستوں میں
کلہ کسی نے گرو رکھ دی
کسی نے دستار بیچ دی ہے
اُدھر بھی دیکھو
جو اپنے رخشاں لہو کے دینار
مفت بازار میں لُٹا کر
نظر سے اوجھل ہوئے
اور اپنی لحد میں اس وقت تک غنی ہیں،
اُدھر بھی دیکھو
جو حرفِ حق کی صلیب پر اپنا تن سجا کر
جہاں سے رخصت ہوئے
اور اہلِ جہاں میں اس وقت تک نبی ہیں

فیض

کا آخری کلام

بہت مِلا نہ مِلا زندگی سے، غم کیا ہے
متاعِ دردبہم ہے تو بیش و کم کیا ہے

ہم ایک عمر سے واقف ہیں اب نہ سمجھاؤ
کہ لُطف کیا ہے مرے مہرباں، ستم کیا ہے

کرے نہ جگ میں الاؤ تو شعر کس مقصد؟
کرے نہ شہر میں جل تھل تو چشمِ نم کیا ہے

اجل کے ہاتھ کوئی آرہا ہے پروانہ
نہ جانے آج کی فہرست میں رقم کیا ہے

سجاؤ بزم، غزل گاؤ، جام تازہ کرو
بہت سہی غمِ گیتی، شراب کم کیا ہے

عمدہ کتابیں: شمع کے ادارے سے منگائیے

عمدہ ناول:

کتاب	مصنف	قیمت
آگ اور دھواں	م۔م۔ راجندر	۵ روپے
ابھی صورت گری کی نگاہ	ریاض ارشد	۶ روپے
اندھیرے	اختر عادل روپ	۵ روپے
عشق بلا خیز	سید قاسم محمود	۱۰ روپے
ہزار راتیں	ش۔ مظفر پوری	۱۰ روپے
جلن	کرشن گوپال عابد	۶ روپے
جاتی ہوئی بہار	وحشی محمود آبادی	۸ روپے
کرنیں	شفیق الرحمن	۶ روپے
برہن	کرشن گوپال عابد	۱۰ روپے
ٹوٹے ناتے	گلزار چودھری	۱۲ روپے
اُلٹی لہریں	گلزار چودھری	۱۲ روپے
پھیلتے سائے	گلزار چودھری	۱۲ روپے
نئے قدم	ہاجرہ نازلی	۸ روپے
پہلی لڑکی	رازدان ایم اے	۵ روپے
رام محمد ڈیسوزا	علی رضا	۷ روپے
ظالم	سعید امرت	۶ روپے
ٹیڑھی لکیریں	سیما شوری	۱۲ روپے ۵۰ پیسے
آدمی کی دکان	سیما شوری	۱۲ روپے ۵۰ پیسے
تیسرا آنچل	سیما شوری	۱۲ روپے ۵۰ پیسے
دیکھئے دیکھئے	سیما شوری	۱۲ روپے ۵۰ پیسے

دل چسپ افسانے:

کتاب	مصنف	قیمت
نتھ کا بوجھ	واجدہ تبسم	۳۰ روپے
نتھ اُترائی	واجدہ تبسم	۳۰ روپے
نتھ کا زخم	واجدہ تبسم	۳۰ روپے
نتھ کا غرور	واجدہ تبسم	۳۰ روپے
اُترن	واجدہ تبسم	۳۰ روپے
کیسے سمجھاؤں	واجدہ تبسم	۱۵ روپے
کیسے کاٹوں رین اندھیری	واجدہ تبسم	۱۵ روپے
بہے دریا	واجدہ تبسم	۲۵ روپے
قریب منزل	شفیق بانو	۶ روپے
مجھے تم سے محبت ہے	نقی تنویر	۷ روپے

تاریخی افسانے:

کتاب	مصنف	قیمت
حرم سرا	الیاس سیتاپوری	۱۵ روپے
عجائب خانۂ عشق	الیاس سیتاپوری	۱۵ روپے
چاند کا خدا	الیاس سیتاپوری	۱۵ روپے
آگ کا بدن	الیاس سیتاپوری	۱۰ روپے
اندر کا آدمی	الیاس سیتاپوری	۱۰ روپے
بالاخانے کی دلہن	الیاس سیتاپوری	۱۵ روپے
شہزادی کا نیلام	الیاس سیتاپوری	۱۵ روپے
داستان حور	الیاس سیتاپوری	۱۵ روپے
کشمیر کی کلی	الیاس سیتاپوری	۱۵ روپے
دولت کے پرستار	الیاس سیتاپوری	۲۰ روپے
حرم سرا کا عجوبہ	الیاس سیتاپوری	۱۵ روپے
پارسائی کا خمار	الیاس سیتاپوری	۲۰ روپے
آتش پرست	الیاس سیتاپوری	۱۵ روپے

باتصویر فلمی کہانیاں:

کتاب	قیمت
بیراگ	۵ روپے
ستیم شوم سندرم	۵ روپے

بچوں کے لئے ناول:

کتاب	مصنف	قیمت
ستاروں کے قیدی	ظفر پیامی	۴ روپے
خوفناک جزیرہ	سراج انور	۱۲ روپے
نیلی دنیا	سراج انور	۱۵ روپے
کالی دنیا	سراج انور	۱۵ روپے
بند دروازے	واجدہ تبسم	۱۵ روپے

شعری ادب:

ہزار داستان — فراق گورکھپوری کے شعروں کا مجموعہ ۵ روپے

عمدہ کشیدہ کاریاں

کتاب	قیمت
فرح کشیدہ کاری	۱۸ روپے
بانو کشیدہ کاری	۱۵ روپے
زینت کشیدہ کاری	۱۴ روپے
فردوس کشیدہ کاری	۱۲ روپے
راسیہ کشیدہ کاری	۱۲ روپے
سارہ کشیدہ کاری	۱۰ روپے
شمع کشیدہ کاری	۱۰ روپے

کھانا پکانے کی اہم کتابیں:

کتاب	قیمت
نعمت کدہ	۲۰ روپے
رضیہ کا شاہی دسترخوان	۱۰ روپے

صحت:

کتاب	زبان	قیمت
حسن و صحت اور ورزش		۵ روپے
موٹاپا اور اس کا علاج		۴ روپے
بڑھاپا اور اس کا علاج		۶ روپے
صحت اور زندگی	اردو/ہندی	۱۰ روپے
پریم شاستر	اردو/ہندی	۱۰ روپے
کام شاستر	اردو/ہندی	۱۰ روپے
گرہستھ شاستر	اردو/ہندی	۱۰ روپے

آج ہی منگائیے: شمع بک ڈپو آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ [illegible]

ہم مسافر یونہی مصروفِ سفر جائیں گے
بے نشاں ہو گئے جب شہر تو گھر جائیں گے

کس قدر ہوگا یہاں مہر و وفا کا ماتم
ہم تری یاد سے جس روز اُتر جائیں گے

جوہری بند کیے جاتے ہیں بازارِ سخن
ہم کسے بیچنے الماس و گہر جائیں گے

نعمتِ زیست کا یہ قرض چکے گا کیسے
لاکھ گھبرا کے یہ کہتے رہیں مر جائیں گے

شاید اپنا بھی کوئی بیت حُدی خواں بن کر
ساتھ جائے گا مرے یار جدھر جائیں گے

فیض آتے ہیں رہِ عشق میں جو سخت مقام
آنے والوں سے کہو ہم تو گزر جائیں گے

SHABISTAN URDU DIGEST
(FAIZ NUMBER)
REGD. NO. D-(C) 121
R.N. 12875/67